فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں مزاحمت' جلاوطنی اور یگانگیت کے افکار کا تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو)

مقالہ نگار

عارف حسین

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جولائی، ۲۰۱۹ء

فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں
مزاحمت' جلاوطنی اور یگانگیت کے افکار کا تقابلی مطالعہ

مقالہ نگار

عارف حسین

یہ مقالہ

پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

© جولائی، ۲۰۱۹ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں مزاحمت' جلاوطنی اور یکانگیت کے افکار کا تقابلی مطالعہ

پیش کار: عارف حسین رجسٹریشن نمبر: 668-phD/Urdu/S16

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان وادب

ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر عابد حسین سیال ______________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ______________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل (ر) محمد جعفر، ہلال امتیاز (ملٹری) ______________

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ ______________

اقرارنامہ

میں عارف حسین حلفیہ بیان کرتاہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی کام ہے۔اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے پی ایچ ڈی سکالر کی حیثیت سے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر عابد حسین سیال کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

عارف حسین

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

صفحہ نمبر	عنوان
ii	مقالہ کا دفاع کی منظوری کا فارم
iii	اقرار نامہ
iv	فہرست ابواب
viii	Abstract
ix	اظہار تشکر
1تا53	**باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث**
1	الف۔ تمہید
1	i۔ موضوع کا تعارف
1	ii۔ بیان مسئلہ
2	iii۔ مقاصد تحقیق
2	iv۔ تحقیقی سوالات
2	v۔ نظری دائرہ کار
2	vi۔ تحقیقی طریقہ کار
3	vii۔ زیر نظر موضوع کا ما قبل مطالعہ
3	Viii۔ تحدید
3	ix۔ پس منظری مطالعہ
4	x۔ تحقیق کی اہمیت
4	ب۔ مزاحمت اور اس کے مباحث
4	i۔ مزاحمت کا مفہوم
5	ii۔ مزاحمت بطور ایک سماجی عمل

iii۔ مزاحمتی ادب اور اس کے اہداف و مقاصد	8
iv۔ مزاحمتی ادب کی جہات	12
v۔ مزاحمتی ادب کی روایت	15
vi۔ اردو میں مزاحمتی ادب کی روایت کا اجمالی جائزہ	17
ج۔ جلاوطنی اور اس کے مباحث	20
i۔ جلاوطنی کا مفہوم	20
ii۔ جلاوطنی بطور ایک سماجی عمل	23
iii۔ جلاوطنی اور ادب	24
iv۔ ادب میں جلاوطنی کی جہات	26
د۔ بیگانگیت اور اس کے مباحث	29
i۔ بیگانگیت کا مفہوم	29
ii۔ بیگانگیت اور ادب	34
iii۔ بیگانگیت کی جہات	37
ہ۔ فیض احمد فیض کے حالات زندگی اور ادبی خدمات	39
i۔ فیض احمد فیض کے سوانحی کوائف کا اجمالی جائزہ	39
ii۔ تصانیف	43
iii۔ اعزازات	43
و۔ محمود درویش کے حالات زندگی اور ادبی خدمات	44
i۔ محمود درویش کے سوانحی کوائف کا اجمالی جائزہ	44
ii محمود درویش کی شعری تخلیقات	47
iii محمود درویش کی نثری تخلیقات	48
iv۔ اعزازات	48
حوالہ جات	49

باب دوم: فیض احمد فیض اور محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کا تقابل	54تا180
الف۔ فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری کا فکری پس منظر	54
ب۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں مزاحمت کی جہات	60
i۔ ملکی آمریت کے خلاف مزاحمت	60
ii۔ عالمی استعماری قوتوں کے خلاف مزاحمت	75
iii۔ مذہبی اجارہ داری اور ظاہر داری کے خلاف مزاحمت	91
iv۔ سماجی اور طبقاتی استحصال کے خلاف مزاحمت	99
v۔ فیض احمد فیض کا مزاحمت سے بغاوت کی طرف میلان	104
Vi۔ فیض کی مزاحمتی شاعری کا علامتی پہلو	107
ج۔ محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کا فکری پس منظر	111
د۔ محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کی جہات	123
i۔ فلسطین پر مشتمل مزاحمتی شاعری	123
ii۔ سماجی رویوں اور ظلم و جبر کے خلاف مزاحمتی شاعری	140
iii۔ استعماری قوتوں کے خلاف مزاحمتی شاعری	146
Iv۔ محمود درویش کی علامتی مزاحمتی شاعری	155
ہ۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کا تقابل	163
حوالہ جات	168
باب سوم: فیض احمد فیض اور محمود درویش کی جلاوطنی کی شاعری کا تقابل	180تا246
الف: فیض احمد فیض کی جلاوطنی کی شاعری کا پس منظر	180
ب۔ فیض احمد فیض کی جلاوطنی کی شاعری کی جہات	186
i۔ خود اختیار کردہ جلاوطنی کی شاعری	186
ii۔ وطن میں بے وطنی کا احساس	189

iii۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں جلاوطنی کے نئے میلانات 194
ج۔ محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی کا پس منظر 211
د۔ محمود درویش کی جلاوطنی پر مشتمل شاعری کی جہات 212
i۔ محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی 212
ii۔ محمود درویش کی شاعری میں علامتی جلاوطنی 226
iii۔ محمود درویش کی شاعری میں ناسٹلجیائی اظہاریہ 229
iv۔ محمود درویش کی شاعری میں گھر بدری 232
v۔ محمود درویش کی شاعری میں علامتی اظہاریہ 235
ہ۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی کا تقابل 239
حوالہ جات 245
باب چہارم: فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت کا تقابل 252تا301
الف۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں بیگانگیت اور اس کی جہات 252
ب۔ محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت اور اس کی جہات 267
ج۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت کا تقابل 290
حوالہ جات 298
باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات 302تا228
الف۔ مجموعی جائزہ 302
ب۔ نتائج 320
ج۔ سفارشات 323
کتابیات 324

ABSTRACT

Title:

Thoughts of Resistance, Exile and Alienation in Faiz Ahmed Faiz and Mahmoud Darwish: A Comparative Study

Abstract:

Faiz Ahmed Faiz in Urdu and Mahmoud Darwish in Arabic are known for their resistance poetry. Both of them raise their voice against every form of exploitation. Whether the occupation of foreign powers or the exploitation of local elites, they used their pen to register their protest. Resistance, Exile and Alienation are three prominent features of both the poets. This research is an attempt to go through a comparative study of the poets in the context of above three characteristics. The thesis consists of five chapters:

First chapter includes introduction of the work, research questions and methodology following by explanation of key terms and brief introduction of poets under discussion.

In second chapter, resistance poetry of Faiz Ahmed Faiz and Mahmoud Darwish is compared. Aspects of local dictatorship, foreign exploiting forces along with injustice in society imposed by various elites classes are studied in the poetry of both the poets.

In third chapter, dimensions of exile are studied in the poetry of Faiz Ahmed Faiz and Mahmoud Darwish. Various aspects of exile are explored, whether physical or mental.

In fourth chapter, different dimensions of alienation in the works of both the poets are the focus of study. After discussing the subject separately in the poetry of both the poets, a comparative study is carried out.

Fifth chapter includes findings, conclusion and recommendations.

اظہار تشکر

تمام تعریفیں اس بابرکت ذات کے لیے جس نے ہمیں عدم سے اشرف المخلوقات بنا کر وجود کا لباس پہنایا۔ اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے راقم الحروف کے زیر تحقیق مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے اسباب فراہم کیے۔

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے شعبہ اردو کے جملہ اساتیذ کرام خاص کر ایسوسی ایٹ پروفیسر جناب قابل صد احترام ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر عابد حسین سیال صاحب صدر شعبہ اردو نمل اسلام آباد کی فنی اور فکری رہنمائی نہ ہوتی تو یہ ایک مقالہ ایک خواب بن کر رہ جاتا۔ لہذا ان سب کا شکریہ ادا کرنا راقم الحروف پر لازم ہے کہ انہوں نے ہر موڑ پر رہنمائی کرنے میں راقم کو مایوس نہیں کیا۔

جامعۃ الکوثر کے تمام اساتذہ کرام خاص کر آقائے شیخ انور علی نجفی، آقائے احمد حسین فخر الدین، آقائے افتخار حسین جعفری اور آقائے انتصار جعفری کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں انہوں نے حوصلہ افزائی بہت کی۔ جناب حجۃ الاسلام جناب شیخ محسن علی نجفی کا نام نہ لوں تو ناانصافی ہو گی ان کی زندگی سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ راقم کی تربیت و تعلیم میں آپ کی رہنمائی پیش پیش رہی۔ علاوہ ازایں میرے تمام دوستوں' رشتہ داروں' والدہ محترمہ' بہن بھائیوں' شریک حیات' اور چچا صداقت خاص کر میرے والد گرامی جناب مہدی حسین کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی بے پناہ محبتوں اور شفقتوں سے راقم کچھ پڑھنے لکھنے کا اہل ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان تمام علمی اور روحانی شخصیات کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور ان کی توفیقات خیر میں اضافہ فرما (آمین ثم آمین)

عارف حسین

سکالر پی ایچ ڈی اردو

باب اول:

موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف:۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف:

فیض احمد فیض کا شمار پاکستان کے اہم اور نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی شاعری میں جہاں غم جاناں کا تذکرہ ملتا ہے وہاں کلاسیکی لفظیات میں غم روزگار کا برملا اظہار بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں عشق ومحبت' حب الوطنی،وجودی اور مزاحمتی عناصر کے ساتھ ساتھ انقلابی اوراشتراکی طرز فکر بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ فلسطینی نژاداور فلسطین کے قومی شاعر محمود درویش کو عصر حاضر کے عربی ادب کا نمائندہ شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ان کی شاعری بھی عشق ومحبت،مہاجرت،جلاوطنی،حب الوطنی،مزاحمت،بیگانگیت اورانقلاب کے تصورات سے مملو ہے۔عربی زبان میں ان کے تیس کے قریب شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ محمود درویش اور فیض احمد فیض کی شاعری میں خاص طور پر مزاحمت،جلاوطنی اور بیگانگیت کے افکار مشترک ہیں۔زیر نظر تحقیقی کام اسی تناظر میں مذکورہ شعرا کے شعری افکار کے تقابلی مطالعے پر مشتمل ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ:

محمود درویش اورفیض احمد فیض نے شاعری کو امن ومحبت اورانسان دوستی کی زبان قرار دیتے ہوئے ظلم واستبداد کے خلاف صدائے احتجاج کے طور پر استعمال کیے ہیں۔ان کی کے شاعری میں مزاحمتی رویہ' جلاوطنی کے نقوش اور بیگانگیت کے آثار نمایاں طور پر ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ آج کی دنیا ایک عالمی گاؤں ہونے کے ناتے'ایک زبان کا ادب دوسری زبان کے ادب سے استفادہ کرتا ہے۔دوسری بات یہ کہ ہر زبان کا ادب عالمی سطح پر اثرانداز ہونے والے نظریات کا بھی خیر مقدم کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک عصر کے عالمی ادیبوں میں کئی جہات سے اشترکات دیکھے جاسکتے ہیں۔انہی میں سے عالمی سطح پر شہرت پانے والے شعرا میں محمود درویش اور فیض احمد فیض کے نام بھی آتے ہیں۔لہذا زیرِ نظر تحقیق میں یہ مسئلہ پیشِ نظر رہا ہے کہ دونوں شعرا کے ہاں مزاحمت،جلاوطنی اور بیگانگیت کی پیش کش کی صورتیں کیا ہیں اوران میں اشتراکات واختلافات کس نوعیت کے ہیں۔

iii۔ مقاصد تحقیق:

ا۔اردو میں عالمی ادب کے اعلیٰ افکار کو متعارف کرانا

۲۔فیض احمد فیض اور محمود درویش کے شعری افکار میں مزاحمت، جلاوطنی اور بیگانگیت کے عناصر تلاش کرنا اوران کا تجزیہ اور تقابل کرنا

۳۔ دونوں شاعروں کے ہاں مذکورہ افکار کے محرکات، نوعیت، مضمرات اوراثرات کا جائزہ لینا

iv۔ تحقیقی سوالات:

ا۔فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں مزاحمت، جلاوطنی اور بیگانگیت کے افکار کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔دونوں شاعروں کے ہاں مذکورہ افکار کی جہات میں اشتراکات واختلافات کی نوعیت کیا ہے؟

۳۔دونوں شاعروں کے ہاں مذکورہ افکار کے مضمرات واثرات کیا ہیں اوران افکار نے ان کے مجموعی تاثر میں کیا حصہ ڈالا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار:

مزاحمت کا زاویہ ہمیشہ سے ادب میں نمایاں رہا ہے۔اور تخلیق کاروں نے مزاحمت کی مختلف شکلوں اور مختلف سطحوں کے حوالے سے اپنے افکار پیش کیے ہیں۔یہ مزاحمت بیرونی استعمار کے خلاف بھی رہی ہے اور داخلی طور پر ان قوتوں اور طبقوں کے خلاف بھی جو سماجی ناانصافی کے ذمہ دار ہیں۔اسی طرح جبر واستبداد کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی جلاوطنی بھی ایک ایسا امر ہے جو ہمیں ہر خطے اور ہر دور میں ملتا ہے۔بیگانگیت کی اصطلاح نسبتاً نئی ہے اوراس سے مراد فرد کی تنہائی ہے جو ماحول سے اس کی اوراس کے افکار کی عدم مطابقت کے باعث پیدا ہوتی ہے۔فیض اور محمود درویش کے ہاں ان تینوں حوالوں سے نمایاں افکار ملتے ہیں' جن کی نوعتیں بعض جگہ یکساں اور بعض جگہ مختلف ہیں۔اسی تناظر میں دونوں کے افکار کے تجزیے کے لیے زیر نظر تحقیق بروئے کار لائی گئی ہے۔

Vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

تحقیق کا موضوع فیض احمد فیض اور محمود درویش کے شعری افکار کے مطالعے اور تقابل پر مشتمل ہے۔ لہٰذا موضوع سے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، ترتیب اور مطالعہ و تجزیہ کیا گیا۔اس میں تاریخی تحقیق اور تجزیاتی و تقابلی

مطالعہ زیادہ معاون طریقہ کار رہے۔ بنیادی ماخذات میں مذکورہ دونوں شعرا کی کتابیں، کلیات، اوران کے تراجم جبکہ ثانوی ماخذات میں ان کے فکر وفن سے متعلق چھپنے والے مضامین، کتب اور رسائل کا مطالعہ کیا گیا جن تک رسائی کے لیے لائبریریوں سے رجوع کرنے کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ اور دیگر ماخذات سے بھی استفادہ کیا گیا۔

Vii۔ زیر نظر موضوع پر ماقبل تحقیق:

فیض کی شخصیت اور فن پر اردو میں کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور کئی ایک مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں۔اسی طرح محمود درویش کے بارے میں عربی اور انگریزی میں مواد موجود ہے۔ محمود درویش کے تیس کے قریب شعری مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں بعض کے تراجم اردو میں بھی دستیاب ہیں۔ محمود درویش پر چند ایک مضامین مختلف رسائل اور انٹرنیٹ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ تاہم اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اور نہ ہی ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح پر کوئی مقالہ لکھا گیا ہے۔

viii۔ تحدید:

یہ تحقیق فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری کے افکار کی تین جہات یعنی مزاحمت، جلاوطنی اور بیگانگیت کے تقابلی مطالعے اور تجزیے پر مشتمل ہے۔یہ تحقیق دونوں شاعروں کی مطبوعہ شعری کتابوں اوران کے تراجم تک محدود ہے۔دونوں شاعروں کی شاعری کے دیگر فکری ابعاد، ان کی شاعری کے فنی حوالے اوران کی غیر مطبوعہ شاعری اس تحقیق کی حدود سے باہر ہیں۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

محمود درویش کی شخصیت اور فن پر انگریزی'عربی اور فارسی میں مقالات اورآرٹیکلز لکھے جا چکے ہیں۔ جیسے النجاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی سے Aya M Halabi نے Translation and the Inter texual Space the Translation of religious,historical and mythical ion in the poetry of Mahmood Darvish کے عنوان سے گریجویشن کی سطح کا مقالہ لکھا۔یونیورسٹی آف لائسسٹر(Leisester) سے Dania Meryam نے پی ایچ ڈی کا مقالہ Sites of post colonial Becoming:Body land and Tent in the writing of Wilson Haris,Derek Walcott,Mahmoud Darvish and Ghassan Kanafani کے عنوان سے لکھا۔ اوریونیورسٹی آف مانچسٹر سے Suad AHSM Alenzi نے پی ایچ

An Analysis of Formulation of Post Colonial Identity in the work of ڈی کا مقالہ Edward W Said and Mahmoud Darvish A Thematic and Stylistic Analytical Approach کے عنوان سے لکھا۔ جبکہ فیض احمد فیض کی شخصیت اور فن پر متعدد جامعات میں مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ جیسے فیض احمد فیض کی شخصیت اور فن کے عنوان سے ایم اے اردو کے لیے تحقیقی مقالہ جامعہ کراچی سے اشفاق حسین نے لکھا ہے لیکن مذکورہ دونوں شعرا پر مزاحمت' جلاوطنی اور بیگانگیت کے حوالے سے کوئی مقالہ راقم کو نظر نہیں آیا۔ لہٰذا محمود درویش اور فیض احمد فیض کے شاعرانہ افکار (مزاحمت' جلاوطنی اور بیگانگیت) کا تقابلی مطالعہ ایک نیا موضوع ثابت ہوا۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:

فیض احمد فیض بیسویں صدی میں اردو کے مقبول ترین شاعروں میں سے ہیں اور ان کے فکر و فن کو نہ صرف اردو میں بلکہ عالمی ادبیات میں پذیرائی ملی ہے۔ ان کے فکر کی مختلف جہات ہیں جن میں سیاسی زاویہ زیادہ نمایاں ہے۔ اسی طرح محمود درویش کو بھی سیاسی اور انقلابی افکار کی وجہ سے دنیا بھر میں پہچانا جاتا ہے۔ ان دونوں شاعروں کے شعری افکار کا تقابلی مطالعہ نہ صرف فیض کی شاعری کی بین الاقوامی اہمیت کو اجاگر کرے گا بلکہ اردو ادب اور ادبیات عالم میں اشترکات کے نکات بھی سامنے لائے گا جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ ایک ہی عہد میں مختلف زبانوں کے ادب میں عالمی سیاسی صورت حال کے زیر اثر کس نوع کے افکار پروان چڑھتے ہیں۔

ب: مزاحمت اور اس کے مباحث

i۔ مزاحمت کا مفہوم

مزاحمت عربی زبان کا لفظ ہے انگریزی میں اس کا متبادل Resistance ہے۔ مزاحمت کا لفظ اب ایک ادبی اصطلاح کی حیثیت اختیار کر چکا ہے' عربی زبان میں اسے "ادب المقاومۃ" انگریزی میں literature of Resistance تو اردو میں "اسے مزاحمتی ادب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مزاحمت کا پہلے لغوی اور اصطلاحی مفہوم بیان کیا جاتا ہے تاکہ مزاحمتی ادب کی صحیح توضیح اور تشریح سامنے آسکے۔ ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ نے "مصباح اللغات" میں مزاحمت کے ان الفاظ میں معنی لکھے ہیں:"ازدحم وتزاحم۔ القوم: ایک دوسرے پر تنگی کرنا، ایک دوسرے کو دھکیلنا"[(۱)] مزاحمت کو عربی میں مقاومت بھی کہا جاتا ہے۔" قاومہ قواماً و مقاومۃ: ساتھ کھڑا ہونا، مخالفت

کرنا، قائم مقام ہونا"[۲] صاحب "المنجد" لکھتے ہیں: "قاومہ قواماً ومقاومۃ: کسی کے ساتھ قیام کرنا، مقابلہ کرنا"[۳] وارث ہندی اپنی کتاب "قاموس مترادفات" میں مزاحمت کے لغوی معنی کو ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

"مزاحمت: ممانعت، مدافعت، خلل اندازی، رخنہ اندوزی، تعرض، روگ، رکاوٹ"[۴]

درسی اردو لغت کے مطابق مزاحمت کے معنی یہ ہیں: "مزاحمت: م + زا + حَ + مَت: روک ٹوک، ٹکاؤ، ممانعت"[۵] یعنی لغت کی روشنی میں مزاحمت 'مخالفت، روگ، ممانعت، مدافعت اور مقابلہ کے معنی میں ہے۔

مزاحمت ایک معاشرتی اور سماجی عمل ہے جو کسی بھی جمود، ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف سینہ سپر ہونے اور نئی امنگیں پیدا کرنے، عصری شعور دینے اور بیداری کی لہر پیدا کرنے سے عبارت ہے۔ مزاحمت کا دائرہ کار بہت وسیع ہے یہ کسی بھی فکر 'خیال 'تصور یا فیصلے کے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں نسترن فتیحی کا کہنا ہے:

> " معنوی اعتبار سے لفظ مزاحمت کے لغوی معنی "اطاعت کرنے سے انکار" ہے آکسفورڈ ایڈوانس لغت کے مطابق مزاحمت کسی خیال، کسی تصور یا کسی فیصلے کی مخالفت کا عمل ہے اس مخالفت میں اسے ہونے سے روکنے کی کوشش بھی شامل ہے گویا مزاحمت ایک مضبوط اختلاف کا اظہار ہے اس طرح "مزاحمت بنیادی طور پر ایک انقلابی سرگرمی ہے "[۶]

سماجی اور سیاسی سطح پر پیدا شدہ حالات کو روکنے کی ایک شعوری کوشش اور جدوجہد کا نام مزاحمت ہے۔ دوسرے لفظوں میں وضاحت کے ساتھ یوں کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اور عمرانی دباؤ کے تحت جو استحصال اور جبر کی فضا قائم کی جاتی ہے 'اس کے خلاف بند باندھنے 'اور ہر طرح کے جبری استحصال سے انکار کرکے آزاد سماجی وسیاسی رویوں کو بحال کرنا مزاحمت کا مقصد اور ہدف ہے۔

ii۔ مزاحمت بطور ایک سماجی عمل:

تاریخ کا تجزیہ کیا جائے تو پتھر کا دور 'جنگل کا دور 'زراعت کا دور پھر اس سے پدرسری دور آگے جا کر راجاؤں 'آقاؤں اور شہنشاہوں کا دور آیا 'بعد ازاں سرمایہ داریت 'جمہوریت اور آمریت کا دور آیا۔ جب سے انسان کے مفادات کا ٹکراؤ ہونا شروع ہوا 'مزاحمت وہاں سے چلتی آئی ہے۔ انسان جوں جوں مادی لحاظ سے تہذیب یافتہ ہوتا گیا ساتھ ہی مزاحمت کا نہ تھمنے والا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ اب تک یہ سلسلہ اپنے پورے وجود کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شگفتہ حسین رقمطراز ہیں:

مزاحمت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی جبر کی، انسانی تاریخ ان داستانوں سے بھری پڑی ہے، جن میں کبھی سیاست کے نام پر تو کبھی مذہب کے نام پر فرد کا استحصال ہوتا ہے۔ اور کبھی فرد بآوازبلند اور کبھی خاموش قلم سے سماج کی ان بلا دست قوتوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ میں ہے کہ "جبر کے ماحول میں پرندے تک گھونسلوں میں مرجاتے ہیں" ادیب تو اپنے معاشرے کا انتہائی حساس فرد ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ اس جبر کی گھٹن اور شدت کو جب اپنے داخل میں اترتی پاتا ہے تو قلم کو ہتھیار بنالیتا ہے (۷)

انسانوں'سماجوں کی تاریخیں تو بہت لکھی گئیں لیکن سماج میں انسانی مزاحمتی رویوں اور تحریکوں کی طرف مؤرخین کا قلم خاطر خواہ نہیں چلا۔ جب سے انسان نے جنت اور پھر جنت سے دنیا میں قدم رکھا وہاں سے ہی مزاحمت کا آغاز ہوا۔ ابلیس مزاحمت کی علامت بن کر آدم سے ترک اولیٰ کروایا تو دوسری جانب انسانی نفس بھی انسان سے ہر لحظہ مزاحم رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح انسان سے لڑ جھگڑ کر انسان کو چوپاؤں کی منزل تک پہنچانے میں کامیاب ہوسکے دوسری جانب پیغمبران کی مخالفت میں طاقتیں اٹھتی رہیں بالکل اسی طرح مردان حق'حق اور سچائی کی آبیاری کے لیے سینہ سپر ہوتے رہے اس بارے میں شگفتہ حسین کارقمطراز ہیں:

"دنیا کے تختے پر پہلے دو بھائی جب زندگی کو خوشی بانٹنے لگے تو لڑ پڑے کہ زندگی کی خوشی دونوں کے لیے برابر برابر نہ تھی اور دونوں کی طاقت بھی کم زیادہ تھی'ظلم کی ابتدا اسی طرح ہوتی ہے اور ظلم کی مزاحمت بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔۔ ہابیل و قابیل کا تصادم'فرعون و موسیٰ کے درمیان تضاد'نمرود و ابراہیم کے مابین کشاکش اور آگے حسینی و یزیدی قدروں کا تصادم ادیب و شاعر کے لیے رویے کی تحریک بنتا ہے کہ وہ کسی ایک طرف شامل ہو جائے لیکن ادب کبھی ظالم و جابر کا طرفدار ہو کر نہیں پنپتا"(۸)

مزاحمت ایک ٹھہرے ہوئے جھیل میں پتھر مارنے کے مترادف ہے جس سے پورا جھیل ہلنے لگ جاتا ہے بالکل اسی طرح جب ایک جامد سماج میں مزاحمت کی ہوا چلتی ہے تو یہ سارے سماج میں تبدیلی کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ ہر دور میں مزاحمت کا رویہ و رجحان رہا ہے بلکہ شہنشائیت کے خلاف'ملوکیت کے خلاف'جاگیرداریت کے خلاف مزاحمتی تحریکیں بھی چلتی رہی ہیں کیونکہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزادی سے جینا اور مرنا چاہتا بھی چاہتا ہے مزید یہ کہ انسانی جبلت اور فطرت ظلم کو برداشت کم کرتی ہے یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مزاحمت کا چلن ہر سماج میں رہا جیسا کہ ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ:

"تاریخ کے ہر دور میں مزاحمتی تحریکیں ابھرتی رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ کامیاب ہوئی اور اکثر ناکام، مگر اس کے باوجود لوگوں میں مزاحمت کے جذبات کم نہیں ہوئے۔ اس لیے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر لوگ کیوں مزاحمت کرتے رہے ہیں، اور ناکامیوں و شکستوں کے باوجود یہ تحریکیں کیوں پیدا ہوتی رہی ہیں؟ اس کی وجہ ایک تو انسان کی فطرت ہے کہ وہ ظلم واستحصال کو ایک خاص حد تک برداشت کرتا ہے اور جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو وہ اس نظام، روایت اور قدروں سے بغاوت کرتا ہے جو کہ اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں"(۹)

سماج میں مزاحمت کئی طریقے اپنائے جاتے ہیں ایک یہ کہ مسلح ہو کر طبقاتی' استحصالی اور شہنشاہی طرز حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ امن وامان کی صورت حال کو بر قرار رکھتے ہوئے جمہوری طرز پر مزاحمت کرنا۔ مزاحمت کا جو بھی طریقہ ہو مقصد یہی ہوتا ہے کہ فرسودہ نظام کا خاتمہ ہو' عادلانہ طرز حکومت قائم ہو 'معاشرے میں ہر کوئی آزاد زندگی گزار سکے' ہر ایک کو برابر حقوق کے ملے۔ سماج کی اکثریت مزاحمتی تحریک کا ساتھ دے تو نظام میں تبدیلی آنے میں دیر نہیں لگتی۔ ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ:

مزاحمتی تحریکوں کی بنیاد کسی نظریہ اور فکر پر ہوتی ہے۔ ان کے پیش نظر کوئی منصوبہ ہوتا ہے کہ جس کی تکمیل ان کا مقصد ہوتا ہے۔ اگر تحریک سامراجی طاقت کے خلاف ہوتی ہے تو اس کا مقصد ملک کی آزادی ہوتا ہے۔ اگر ریاست اور حکومت کے خلاف ہو تو اس کی پالیسیوں کو تبدیل کرنا اور ان کی جگہ کوئی اور متبادل نظام قائم کرنا ہو(۱۰)

جب سے انسان نے شعور کی نعمت پائی ہے' جب سے سماج کا ڈھانچہ مرتب ہوا ہے' نظریہ' فکر اور فرسودہ خیالات سے مزاحمت کا چلن بھی ساتھ ساتھ رہا ہے۔ یہ مزاحمت کا نتیجہ ہے کہ انسان ارتقاء کی طرف گامزن ہے' اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مزاحمت ایک سماجی عمل ہے تو اب بھی ہر کوئی مزاحمت کر سکتا ہے؟ جواب یہی دیا جائے گا کہ مزاحمت ہر کوئی نہیں کر سکتا' مزاحمت کے لیے یہ بات بہت ضروری ٹھہرتی ہے کہ مزاحمت کار کے پاس ایک نظریہ حیات ہو' کیونکہ مزاحمت فرد سے زیادہ اجتماع کو اپیل کرتی ہے' یعنی مزاحمت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی کوشش کا نام ہے جس کی بنا پر اجتماعی سطح پر ظلم وجبر سے انکار اور اظہار لاتعلقی کیا جاتا ہے۔ لہذا مزاحمت کاروں کے پاس سماج اور زندگی کو دیکھنے کے لیے واضح نظریہ ہو' واضح نظریہ تب آسکتا ہے جب انسان کے پاس زندگی کو دیکھنے کے لیے فلسفیانہ نگاہ ہو' ضروری نہیں کہ ہر کوئی افلاطون اور ارسطو ہو' کہنے کا مقصد یہ ہے کہ زندگی اور ذات وسماج کے بارے میں سوجھ بوجھ

رکھتا ہو' تقلیدی ذہنیت کے حامل نہ ہو' تنقیدی رویہ رکھتا ہو اور مزاحمت کے حوالے سے کمال کا جذبہ رکھتا ہو تب جا کر مزاحمت کامیاب قرار پاتی ہے۔

iii۔ مزاحمتی ادب اور اس کے اہداف مقاصد:

مزاحمت اور ادب دو مستقل الفاظ ہیں۔ مزاحمت میں پتھر کی سنگینی' آگ کی حرارت اور شبنم کی نمی اگر ہے تو ادب میں شہد کی شیرینی' زخمی ہرن کا گداز ہے تو وہاں ادب ززندگی کا نیا منظر نامہ بھی تشکیل دیتا ہے' گو کہ مزاحمت کی اپنی دنیا ہے اور ادب کی الگ اپنی دنیا' لیکن جب ان دو دنیاؤں کو باہم ملاتے ہیں تو ایک نئی دنیا آباد ہوتی ہے۔ اس بارے میں نیّر حیات قاسمی کا کہنا ہے:

> " کبھی یہ دونوں یکمشت مہمان بن کر آئیں تو ان کی خاطر سوچ کا نیا در وا کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ رخ ہوتا ہے کہ عام طور پر جدھر سے حدت، شدت اور نمی کی ہی توقع کی جاتی ہے کہ مزاحمت کا لفظ گونجتے ہی ذہن میں ایسے ہی کچھ احساسات جنم لیتے ہیں۔ لیکن جہاں مزاحمت کی حدت ادب کے سائے میں دہکتی ہے، جہاں مزاحمت کی شدت ادب کی حلاوت سے ملتی ہے، جہاں مزاحمتی نمی بادِ ادب کو چھوتی ہے تو بالعموم ایک لطیف ٹھنڈک کو جنم دیتی ہے۔ جس کا مقصد غصے کی شدت کو قابو میں رکھتے ہوئے فکر کے انتہائی تاروں کو چھو کر احساس کا سُر گنگنانا ہے "(۱۱)

ادب ایک طبیب کی مانند ہے جو معاشرے کی بگاڑ کی تشخیص کرتا ہے۔ یہ شعور دلاتا ہے۔ یہ معاشرے میں مساویانہ اور عادلانہ نظم کے رائج کرنے کی سفارش کرتا ہے یہ جبر واستحصال کے مارے ہوئے لوگوں میں انصاف کا ترازو نصب کرنے کے خواہاں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بلند ادب یعنی ادب عالیہ ظلم وجبر کے خلاف معرض وجود میں آیا ہے گویا ہر ادب ایک مزاحمتی عمل۔ جو عصر موجود سے بیزاری دلاتے ہوئے نئے رجحانات سے آشنا کرتا ہے۔

ایک سوال یہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا ادب اور مزاحمت ایک سکے کے دو رخ نہیں ہے؟ لفظی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ دونوں مختلف ہیں' یہ مترادف الفاظ بھی نہیں لیکن ہدف اور مقصد اور تخلیق کی نسبت کو دیکھا جائے تو دونوں میں اشتراکات پائے جاتے ہیں۔ اس بارے میں علی رفاد فتیحی رقمطراز ہیں کہ " بعض ماہرین کے خیال میں ادب کی مزاحمتی اور غیر مزاحمتی ادب کی تقسیم غلط ہے کیوں کہ ادب بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے۔ جب ادیب اپنے گردوپیش کے ساتھ مکمل ہم آہنگی نہیں کر پاتا تو وہ اس کا اظہار ادبی تخلیق میں کرتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو سارا ادب مزاحمتی ادب ہے اور ہر ادیب باغی ہے "(۱۲) مزاحمت' فکر کی ہنگامی لینڈنگ ہے' ادب اس کو سایہ فراہم

کر کے تازگی اور چاشنی سے نوازتی ہے یوں دونوں مدغم ہو کر"مزاحمتی ادب"کے نام سے منظر عام پر اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ مزاحمتی ادب ایک ہنگامی ادب نہیں بلکہ ادب کو زوردار کیفیتوں کے ساتھ بیان کرنا مزاحمتی ادب ہے۔ جس میں گھن گرج کے پس پردہ سوچ اور فکر کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ مزاحمتی ادب کے بنیادی وظیفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیّر حیات قاسمی کا کہنا ہے:

"مزاحمتی سوچ ایک چنگاری کی طرح ہوتی ہے جو فکر کے خام مال کو چھو کر شعلوں میں تبدیل کرتی ہے اور ادب ایک ایسے ذریعے کی طرح ہوتا ہے جو اس ساری آگ کو اپنے اندر سمیٹ کر سلیقے سے سامنے رکھتا ہے تاکہ نہ تو یہ آگ بے قابو ہو کر نقصان کا باعث بنے اور نہ ہی انسانی فہم اس کی تپش سے متنفر ہو"(۱۳)

ایک اور سوال یہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا مزاحمتی ادب وقتی ہے یا دیرپا ادب ہے؟ اس بارے میں انیس ناگی اسے وقتی ضرورت کی شاعری قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں انیس ناگی کا کہنا ہے کہ:

مزاحمتی شاعری یا ادب کی اصطلاح کچھ غیر معین سی ہے اور نہ اس کی تصویر بندی کی گئی ہے۔۔ مزاحمت ایک عمل ہے' سارتر کی اصطلاح میں یہ ایک "پراکسی" ہے' ایک تحریک ہے جو مستقبل کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مزاحمت ایک تصور نہیں خصوصی حالات میں ایک صورتحال سے دوبھر ہونے کا رویہ ہے جس میں مظلوم' ظالم کی بالادستی کو غلامانہ طور پر قبول کرنے کی بجائے اس کی تردید اور اپنی مدافعت کرتا ہے۔(۱۴)

مزاحمتی ادب اپنی جگہ وقتی اور ہنگامی ضرور ہے لیکن ادیب اس طرح سے مزاحمتی ادب تخلیق کرتا ہے کہ وہ زمان و مکان سے بالاتر ہو کر ایک عالمگیر سطح پر ابھر کر سامنے آتا ہے یعنی جب فلسطین کی مظلومیت کا بیان شاعر کرتا ہے تو شاعر کی نظر میں صرف فلسطین نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک موسیع سوچ رکھتے ہوئے ہر ہر مظلوم کی آواز کو بلند کر رہا ہوتا ہے۔

مزاحمت کو ہنگامی یا سطحی کہہ کر مزاحمت کو محدود نہیں کیا جاسکتا اور اس پر یہ اعتراض کہ مزاحمت میں شعریت اور نغمگی نہیں ہے' بھی اپنی جگہ درست نہیں' کیونکہ اردو ادب کے بہت سے شعرا ایسے ہیں جن کی شاعری انقلابی اور مزاحمتی ہے' اس کے باوجود ان میں نرم لہجہ اور نغمگی کے ساتھ موسیقیت بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے' جدید شعرا میں جوش' مجاز' علی سردار جعفری' سلام مچھلی شہری اور اور خاص کر فیض احمد فیض کے ہاں انقلابی جوش و خروش کے ساتھ رس' گداز اور نغمگی بھی ہے۔ ان شعرا کی نظموں کے بارے میں شگفتہ حسین کا کہنا ہے کہ " ان (شعرا کی) نظموں کا

انقلابی لہجہ ٹھہراؤ کا حامل ہے۔ لھذا یہاں دھیمی دھیمی چبھن ہے جو سیاسی جبر کے زیر اثر سماجی زندگی کی شکست وریخت کے سچے احساس سے جنم لیتی ہے"(۱۵)

انسانی جذبات واحساسات کی عکاسی کے لیے بہترین آئینہ ادب ہے 'ادب کی روشنی میں کسی بھی معاشرے کے سیاسی وسماجی حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں'ادب معاشرے میں انقلاب 'تغیر اور تبدیلی لانے کے محرک بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کے ذریعے جہاں رومانوی اظہار کیا جاتا ہے وہاں مارکسی نظریہ کو بھی خیر باد کہتے نظر آتے ہیں 'سرمایہ داریت کے خلاف جہاں آواز اٹھائی وہاں پر وجودی افکار کو بھی اپنے اندر جذب کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا'ادب کا یہی اعلیٰ ظرفی ہے اور وسعت پسندی ہے جس کی وجہ سے ادب ہر دور میں زندہ و تابندہ رہا۔ ادب کے جملہ اقسام میں سے ایک اہم قسم مزاحمتی ادب ہے۔ مزاحمتی ادب کو علمائے فن اور نقاد کی آراء کی روشنی میں یوں دیکھا جاسکتا ہے۔ نعیم بیگ کا کہنا ہے کہ:

> مزاحمت درحقیقت ان آزاد سماجی وثقافتی رویوں کے جبری استحصال سے انکار کا نام ہے جو سیاسی و عمرانی دباؤ کے تحت انسانی زندگی میں در آتا ہے۔ اِسی جبری برتاؤ اور دستور کو جب ایک ادیب و شاعر اپنے الفاظ میں ایک جدوجہد کا نام دیتا ہے تو اسے ہم مزاحمتی ادب کی شرح میں قبولیت بخشتے ہیں(۱۶)

مزاحمت کی جامع مانع تعریف ممکن نہیں ہے ابھی یہ اصطلاح اپنے اصل معنی کی تعیین و تشخیص میں منتظر فردا ہے۔ اگر کوئی گہری نظر رکھنے والا نقاد سامنے آئے تو مزاحمتی ادب کے حوالے سے کئی بند دروازے وا کر سکتا ہے 'کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مزاحمتی ادب میں وسعت اور گہرائیاں بہت ہیں جو ابھی تشنہ تحقیق ہیں۔ مزاحمتی ادب کو کئی زاویوں سے دیکھا اور ملاحظہ کیا جاسکتا ہے 'اولاً کہ مزاحمتی ادب کا وظیفہ کیا ہے "ثانیاً یہ کہ مزاحمتی ادب کیوں ؟ ثالثاً یہ کہ مزاحمتی ادب کیسے جنم لیتا ہے ؟ رابعاًیہ کہ مزاحمتی ادب کسی بھی سماج اور سیاست پر کیا اثرات مرتب کر سکتا ہے۔ لہذا مزاحمتی ادب کے وظائف 'مقاصد 'اور اثرات کے اعتبار سے تعریف اور تعبیر اختلاف واقع ہوا ہے۔ ارشاد حسین مزاحمتی ادب کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> مزاحمتی ادب(Resistance Literature)ایک ایسی ادبی صنف ہے جو مغلوب ومظلوم 'زیر دست ومفتوح انسانی طبقہ 'سماج واقوام کے تہذیب وتمدن یاجغرافیائی خطہ کے رودادِ ابتلاء کو صفحہ قرطاس پر لاتا ہے یہ جہاں غالب وفاتح کی جارحیت اور مکبرانہ طرز عمل

اور ہم ہستی کی سوچ کی قلعی کھول دیتا ہے'وہی مفتوح و مغلوب کی داستان الم اور جذبہ مزاحمت
پر سے بھی پردہ اٹھا کر عیاں کر لیتا ہے۔(۱۷)

مزاحمتی ادب میں مقصدیت پائی جاتی ہے'جیسے ہر عاقل انسان کوئی بھی کام کسی مقصد کے بغیر نہیں کرتا اور حکیم کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا(فعل الحکیم لایخلو عن حکمۃ)بالکل اسی طرح مزاحمتی ادب کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے'جس کی خاطر مزاحمتی ادب لکھا جارہا ہے۔مزاحمتی ادب کے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے مزاحمتی ادب کی تعریف نسترن فتیحی ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ "مزاحمتی ادب ایسی تخلیق ہے جس میں تسلط'غلبہ ناانصافی اور جبر کے خلاف مزاحمت ہو'مزاحمتی ادب بااختیار بنانے اور موجودہ صورتحال کو تبدیل کرنے کی ادبی کوشش ہے"(۱۸)مزاحمتی ادب کے سمجھنے کے لیے اس کے مقاصد اور وظائف کی طرف جائے بغیر اگر"لفظ "مزاحمت پر ہی غور کیا جائے تو مزاحمتی ادب کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔مزاحمت یعنی انکار'پس حاکم اور جابر کی طرف سے استحصال پر مبنی جبری نظام یا سوچ کو نافذ کیا جاتا ہے'مظلوم و مقہور عوام اس جبری استحصال کو ماننے سے انکار کرتا ہے گویا ان کا انکار مزاحمت ہے'صرف انکار نہیں کرتی بلکہ مقام عمل میں آکر حاکم و جابر کو روکنے کی بھرپور کوشش بھی جاری رکھتی ہے۔لہذا کسی بھی سوچ یا فکر یا صورت حال کو قبول کیے بغیر اس کے خلاف'انکار کے فلسفہ کو تحریری صورت میں مرتب کرنا مزاحمتی ادب ہے۔اس ضمن میں قاسم یعقوب کی بات قابل غور ہے"جب ہم مزاحمتی ادب کی بات کرتے ہیں تو ادب کے اُس تخلیقی رویے سے مُراد ہوتی ہے جو فکر، نظام یا نظریے کے طور پر قبول کرنے سے انکار کر رہا ہے"(۲۰)

مزاحمتی ادب'ادب عالیہ میں سے ہے جس کے ذریعے جابر و ظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے'نظریے اور فکر سے انکار پر مبنی ادب بھی مزاحمتی ادب کے زمرے میں آتا ہے۔اس کے علاوہ پیدا شدہ سیاسی وسماجی حالات کو دوبارہ اپنے پہلے ڈگر پر لانے کی ادبی کوشش بھی مزاحمتی ادب میں شرف قبولیت حاصل کر جاتی ہے۔اور یہ کہ مزاحمتی ادب'انقلاب کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے'یہ صرف ہنگامی حالات کی پیداوار نہیں ہے۔کسی بھی فکر یا سوچ یا جابرانہ طرز حکومت کے خلاف عملی میدان میں استقامت دکھانے کا نام مزاحمت ہے۔پس ہر وہ ادب جو مزاحمت میں تقویت کا باعث بنے وہ مزاحمتی ادب ہے۔مزاحمتی ادب کے ذریعے جابرانہ طرز حکومت کا ناپاک چہرہ لوگوں کو دکھایا جاتا ہے اور ساتھ ہی مجبور و مقہور عوام کی مظلومیت کو دنیا کے سامنے پیش کی جاتی ہے تاکہ دنیا والے ان کی دادرسی کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ڈاکٹر روبینہ شہناز کا کہنا ہے کہ

مزاحمت ایک جنگی اصطلاح ہے'عام طور پر جن قوموں نے اپنی بقاکے لیے فاتحین اور خاص کر نو آبادیات کے خلاف مدافعت کی'ان کا فاتحین اور استعماری عناصر سے پنجہ آزمائی کرنااور اپنے حق کے دفاع کرنے کو مزاحمت کہا'اب انہی کی جدوجہد کو جب اشعار کے قالب میں یا نثر کے قالب میں پرویا گیاتومزاحمتی ادب کا منظر نامہ معرض وجود میں آیا۔"جدید عہد میں ایسے ادب کو بھی مزاحمتی ادب سمجھا جاتا ہے جو ظالمانہ نظام یا آمر حکمرانوں کے خلاف لکھاجاتا ہے۔اس طرح وطن کی محبت'عوام دوستی اور فاتحین کے خلاف جذبات کا اظہار مزاحمتی ادب کہلاتا ہے"(۱۹)

مزاحمتی ادب صرف آمر وفاتح کے خلاف نبرد آزما ہونے سے عبارت نہیں بلکہ یہ ادب کو نئے امکانات فراہم کرتا ہے'نئے افق سے روشناس کراتا ہے'اس کے ذریعے معاشرے میں ناسوروں کی نشاندہی کی جاتی ہے'پھران کے علاج کے اصول وضع کیے جاتے ہیں۔سب سے بڑھ کر رائے عامہ کی تشکیل میں مزاحمتی ادب کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔نیر حیات قاسمی کے مطابق "اس ضمن میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ قارئین کی توجہ کسی مخصوص معاملے کی جانب مبذول کروائی جائے۔وہ کوئی معاشرتی بگاڑ بھی ہو سکتا ہے۔۔پڑھنے والوں میں آگاہی بیدار کرنااور خرابی و بگاڑ کے تدارک کے لیے جذبہ بیدار کرنا۔یوں مزاحمتی ادب کا مقصد حقیقتاً فلاحی نوعیت کا ہوتا ہے(۲۱)

iv۔مزاحمتی ادب کی جہات:

مزاحمت کی نوعیتیں اور جہات اپنے مقاصد کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں۔کبھی تو مسلح ہو کر مزاحمت کی جاتی ہے تو کبھی جمہوری انداز میں مزاحمت کی جارہی ہوتی ہے'مزاحمت کبھی تو بادشاہت کے جابرانہ تسلط کے خلاف کی جاتی ہے تو کبھی سماجی اجارہ داری'جاگیر داریت اور مذہب کے نام پر عوام کو لوٹنے والی قوتوں کے خلاف مزاحمت کا علم بلند کیا جاتا ہے تاکہ غاصبوں سے نجات ملے اور منصفانہ اقدار کو فروغ حاصل ہو۔

مزاحمت کی دوصوتیں متصور ہیں۔ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی'انفرادی مزاحمت کا دائرہ محدود ہوتا ہے اس کے مقابلے میں اجتماعی مزاحمت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔انفرادی مزاحمت وقتی ہوتی ہے جبکہ اجتماعی مزاحمت دیرپا ہوتی ہے'اسی لیے اس مزاحمت کو تحریک کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔اجتماعی مزاحمت کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہیں اس بارے روبینہ سہگل ان الفاظ میں اشارہ دے رہی ہیں "اجتماعی مزاحمت کے لیے ضروری ہے کہ بہت سے افراد کسی ظلم کی اجتماعی شکل کو پہچانیں، آپس میں یکجہتی محسوس کریں اور اس بات کو تسلیم کریں کہ یہ ظلم سب ہی کے

خلاف ہے "اور یہ کہ اجتماعی مزاحمت میں سب لوگ ظلم وجور کا ادراک کرتے ہوئے مقام عمل میں آگے آتے ہیں اور متعین نصب العین کی روشنی میں اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں مزید بر آں اس مزاحمت میں مطالبات بھی واضح ہوتے ہیں۔

جب بھی کہیں کوئی ظلم ہوتا ہے تو انسان فطری طور پر اسے ناپسند نگاہوں سے دیکھتا ہے' انسانی عقل بھی ظلم کو برا اور قبیح سمجھتی ہے' شریعت کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہی بات ملتی ہے کہ ظلم و برائی کو ہاتھوں سے روکو' اگر ممکن نہ ہو تو زبان سے برا کہو اور اگر یہ بھی توفیق نہ ہوئی تو اسے دل سے برا جانو' لہٰذا انسان کے کچھ مشترکہ اقدار ہیں جب ان اقدار کے مخالف عمل نظریہ یا سوچ وجود میں آجائے یا فیصلہ آجائے یا پھر ذاتی مفادات خاطر اجتماعی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر فرد واحد کی من مانیاں اپنی عروج کو پہنچ جائے تو مزاحمت وجود میں آتی ہے۔ مقام و مرتبہ اور مدارج کے اعتبار سے بھی مزاحمت چند ایک صورتیں متصور ہیں ایک یہ کہ ظالم یا غاصب حکومت کی مخالفت میں ہوتی ہے دوسری یہ کہ مشترکہ اقدار کے حصول کے لیے جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کرنا یہ مزاحمت کا ارفع مرتبہ ہے۔ مزاحمت کی دوسری صورت کے بارے میں نیر حیات قاسمی کا کہنا ہے "منصفانہ اقدار کی آبیاری کرتے ہوئے اپنے نفس اور اپنی مفادات کے خلاف اس وقت تک مزاحمت کو جاری رکھنا جب تک کہ منصفانہ اقدار اس فرد کی ذاتی منفعت سے بازی نہ لے جائے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے اور اپنے اعزّا کی مفادات اور زندگیوں کی قربانی دے کر اِن منصفانہ اقدار کا احیا کرنا ہوتا ہے "[۲۲]

دنیا میں بیشتر تحریکیں اٹھی ہیں جن کی بنیادیں مزاحمت سے استوار ہوئی ہیں پدرسری نظام' سرمایہ داریت اور جاگیرداریت خلاف جو آوازیں اٹھی ان تمام کا منبع اور سرچشمہ مزاحمت ہے۔ ادب بھی انہی سماجی ناسور کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا رہا ہے۔

اب تک یہ بات ہوگئی کہ ظلم اور ظالمانہ نظام خلاف آواز بلند کرنے' مظلوموں میں بیداری کی لہر پیدا کرنے اور دنیا تک کو مظلوموں کی آواز پہنچانے' جاگیرداریت کے مذموم عزائم کی قلعی کھولنے کے لیے مزاحمتی ادب کا سہارا لیا جاتا ہے۔ مزید بر آں آج کے گلوبل ویلج میں نو آبادیاتی نظام میں پستے مجبوروں' مقہوروں' تہذیب وثقافت سے جلاوطنی کی صعوبتوں اور بیگانگی کیفیات کا برملا اظہار مزاحمتی ادب نہایت سلیقہ مندی کر رہا ہے۔ عمار مسعود کا کہنا ہے:

"مزاحمت جیسا کہ اپنے معروض میں موجود فرعونیت' قارونیت اور مذہبی پیشوائیت سے مزاحم یا ٹکرانے کا نام ہے' اس کی دو معروف شکلیں تاریخ میں نظر آتی ہیں۔ ایک کالونیل نظام کے خلاف قومی آزادی کی تحریکوں کی صورت میں اور دوسری موجود سماجی واقتصادی نظام کے خلاف جدوجہد کی صورت میں۔۔۔ شعر کی زبان میں مزاحمت کا سفر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک سماج سے بے انصافی ختم نہیں ہوگی"(۲۳)

درج بالا تعریفوں کی روشنی میں مزاحمتی ادب کو درج ذیل نکات میں بیان کر سکتے ہیں کہ:

۱۔ عصر موجود سے بیزاری کا احساس مزاحمتی ادب دلاتا ہے

۲۔ سیاسی عدم استحکام' اور غیر جمہوری اقدار کے خلاف آواز بلند کرنا' مزاحمتی ادب کا شیوہ ہے

۳۔ زیر دست اور مقہور و مظلوم عوام کی مظلومیت کو اقوام عالم تک پہنچانا مزاحمتی ادب کا فریضہ ہے۔

۴۔ سماجی' طبقاتی اور عالمی استعمار کے استحصال کے گرہوں کو کاٹ کر انسان دوستی کے نظام کو فروغ دینا مزاحمتی ادب کا نعرہ ہے

۵۔ مظلومین' مقہورین استحصال زدہ معاشرے میں آزادی کی امید دلانا مزاحمتی ادب کا وژن ہے

لہٰذا ادب کے ارتقاء کے لیے ادب کا ہر دوسرا قدم مزاحمتی ادب ہے جو اپنے سے پہلے کے رویوں اور رجحانات اور تحریکوں کے خلاف ایک گونا مخالفت' مخاصمت اور مزاحمت کا پیش خیمہ ہے۔ مزاحمتی ادب 'ادب کے عصری صورتحال میں تبدیلی کے لئے خاموش اور پرسکون جھیل میں پتھر داغنے سے عبارت ہے جس سے ادب میں تبدیلی اور ارتقاء کی ایک نئی لہر پیدا ہوتی ہے۔ مزاحمتی ادب میں ہر اس چیز کا بیان کیا جاتا ہے جن کے ذریعے کسی استحصال زدہ معاشرے کو برابری کی سطح پر لائی جاتی ہے' جن کے ذریعے طبقاتی نظام کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے' جن کے ذریعے سے ظالمین کو سزا اور مظلومین کو دادرسی میسر آسکتی ہے' جن کے ذریعے غیر جمہوری اقدار جیسے آمریت اور استعماریت کا قلع قمع کا جاسکتا ہے لہٰذا مزاحمت ادب صرف ایک ہنگامی صورتحال سے دوبرہونے کا نام نہیں بلکہ مزاحمتی ادب حق اور حق کے لیے آواز بلند کرتے رہنے سے عبارت ہے جب تک حق اور اہل حق رہیں گے ظلم اور بربریت اور استحصال کے خلاف آواز بلند ہوتی رہے گی یوں مزاحمتی ادب بھی برابر جاری وساری رہے گا۔

مندرجہ مقدمات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے مزاحمتی شاعری کی جہتوں میں سے معاصر جہات یہ ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کی مخالفت میں' استحصال پر مبنی سماجی واقتصادی نظام اور ملکی سیاسی عدم استحکام جن پر مزاحمتی ادب کی

عمارت کھڑی ہے۔ خاص کر اس مقالہ کا اہم حصہ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی مزاحمت کا بیان بھی ہے اس لحاظ سے ہم ان عنوانات کی روشنی میں بحث کریں گے۔

۱۔ استعماری نظام کے خلاف مزاحمتی شاعری

۲۔ استحصال پر مبنی سماجی واقتصادی نظام کے خلاف مزاحمتی شاعری

۳۔ ملکی آمریت کے خلاف مزاحمتی شاعری

۴۔ مسئلہ فلسطین پر مزاحمتی شاعری

۵۔ علامتی مزاحمتی شاعری

v۔ مزاحمتی ادب کی روایت:

ادب کی تاریخ اتنی پرانی ہے جتنی انسانی تاریخ لیکن ادب جب تک تحریری صورت میں نمودار نہیں ہوا'سینہ بہ سینہ چلتا آیا آگے جا کر کھالوں'چمڑوں 'پتوں اور پتھروں پر ادب تحریر ہوا'البتہ مزاحمتی ادب کے ابتدائی نقوش طور یونانی ادب میں ملاحظہ کرسکتے ہیں اس بارے میں ہومری ادب قابل مطالعہ ہے۔ ایلیڈ اور اوڈیسی عالمی کلاسیک کی حیثیت رکھتی ہیں ان دونوں فن پاروں میں مزاحمتی اسالیب موجود ہیں۔ جیسا کہ نعیم بیگ ہے کہ "ایلیڈ اور اوڈیسی میں شکست خوردہ قوم کے مصائب کا تذکرہ اس آشوب انداز میں کیا گیا ہے جو مزاحمتی ادب کو روح عطا کرتا ہے"[۲۴]

دنیا کے ہر ادب میں مزاحمتی رویہ یقیناً رہا ہے لیکن بطور اصطلاح پہلی مرتبہ فلسطینی نقاد غسان کنفانی کی تحریر سے منظر عام پر آیا جسے انہوں نے "ادب المقاومۃ "نام دیا اردو میں اس کا ترجمہ "مزاحمتی ادب" کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں نعیم بیگ کا کہنا ہے کہ "ادب میں مزاحمتی اصطلاح کے طور پر" ادب المقاومہ "کی تاریخی اصطلاح اس وقت رائج ہوئی جب ۱۹۴۴ء میں فلسطینی ادیب ونقاد غسان کنفانی نے فلسطین میں مزاحمتی ادب ۴۴۔۱۹۴۸ کے عنوان سے مضمون لکھا Sanchari Sengupta کا کہنا ہے:

> The term “Resistance”, with relation to literature and literary theory, was first introduced in ۱۹۶۶ in a description of Palestinian literature. It was used by the Palestinian writer and critic, Ghassan Kanafani, in his work titled Literature of Resistance in Occupied Palestine: ۱۹۴۸-۱۹۶۶. In his essay,

Kanafani explores the literature that was produced in Palestine and by Palestinian writers, both in and outside the country. It was written before the June War of ۱۹۶۷, in which the Israeli forces defeated the Egyptian and Jordanian armies, thus occupying the lands, which were then onwards called the "occupied territory". The essay describes a marked distinction between two kinds of literature that can be produced in a country that is being occupied by outer forces: "under occupation" literature and "exile" literature[۲۵]

مزاحمتی ادب کی اصطلاح آمریت عہد میں منصہ شہود پر آگئی اس کے ذریعے ادباء نے ظلم وجبر 'سرمایہ داریت' جاگیرداریت اور قبضہ مافیا صدائے احتجاج بلند کیا اور یوں یہ ادب عالمگیر سطح پر نوآبادیاتی شکنجے میں ڈوبی ہوئی قوم اور حاشیائی آبادی کی توانا آواز بن کر ابھرا۔ چنانچہ ویت نام 'کشمیر' الجزائر اور فلسطین کی آزادی کے لیے لکھا گیا سارا ادب مزاحمتی ادب ہے۔ لہٰذا مزاحمتی ادب ہر ادب کا خاصہ رہا ہے لیکن نوآبادیات ممالک میں یہ ادب نمایاں طور پر ایک ادبی اصطلاح بن کر ابھرا ہے۔ مزاحمتی ادب ہر عہد کے تقاضوں کے مطابق چلتا آیا ہے۔ اس ضمن میں نسترن فتیحی کا کہنا ہے:

> "سماجی حالات کے پیش نظر مزاحمتی صورتِ حال بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ تشدد کے ادوار میں مزاحمت کی جو صورت ہوتی ہے وہ آئینی اور سیاسی ادوار میں اسی انداز اور طریقے سے منطبق نہیں ہوسکتی۔ عرب میں بڑھنے والی ثقافتی، ادبی اور فکری سرگرمیوں کو بھی موجودہ حالات کے تناظر میں فلسطینیوں کی جانب سے پُرامن مزاحمت کی ایک مضبوط صورت ملتی ہے"[۲۶]

مزاحمتی ادب کے بارے میں یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہر نیا ادب مزاحمت کا نتیجہ ہے 'یعنی شاعر یا ادیب عام ڈگر سے ہٹ کر سوچنا شروع کرتا ہے تو اسے موجود ادب سے تشفی نہیں ملتی تو وہ موجود ادب سے ایک طرح سے لاتعلقی اختیار کرکے ادب کی نئی دنیا کی تلاش میں نکلتا ہے بالآخر وہ ادب کے نئے کولمبس کو پانے میں کامیاب ہوتا ہے اس سے ایک نیا رویہ وجود میں آتا ہے اور یہ رویہ بعد ازاں رجحان صورت اختیار کر جاتا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی

کا خیال ہے کہ: ”دنیا کہ تمام بڑی شاعری مزاحمت کی پیداوار ہے اور اس حوالے سے دنیا کا مزاحمتی ادب بھی یقیناً بڑا ادب ہے "(۲۷)

نو آبادیات ممالک کے بہت شعرا اپنے وطن سے جلاوطن ہوئے اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ وہ جب زندگی کے کچھ لمحات اپنے وطن میں گزارے تو بھی جلاوطنی اور بے خانماں کی کیفیت لگی بندھی رہی'ردعمل کے طور پر ان شاعروں اور ادیبوں کے ہاں ادب کی ایک پر اثر آواز گونجی جسے ادبی دنیا مزاحمتی ادب سے جانتی ہے۔اس بارے میں عبدالرؤف ملک کا کہنا ہے:

> مزاحمتی ادب وشعر کی تخلیق اُن ملکوں کے ادیبوں اور شاعروں کا خاصہ رہا ہے جو غیر ملکی استعماریت کا شکار رہے۔کیونکہ مغربی ممالک کو اس صورت حال کا سامنا نہ تھا اس لیے وہاں کے ادب میں ہمیں ظلم وجبر اور استبداد کی وہ منظر کشی نہیں ملتی جیسی ایفروایشیائی ملکوں کے ادب وشعر میں عام طور پر نظر آتی ہے "(۲۸)

لہٰذا مزاحمتی ادب'ادب کا حصہ پہلے سے تھا لیکن اس حصے کو الگ سے سمویا نہیں گیا۔نو آبادیات کے خلاف خاص کر فلسطینی شعرا کی طرف سے صیہونیت کے خلاف کی گئی شاعری کو باقاعدہ طور پر مزاحمتی شاعری کہا گیا اس کے بعد ادب کا یہ حصہ اپنا ایک تشخص اجاگر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

vi۔اردو میں مزاحمتی ادب کی روایت کا اجمالی جائزہ:

کلاسیکی اردو شاعری کے فروغ میں دربار کا اہم کردار رہا ہے۔اس میں شاہی دربار اور صوفی دربار قابل ذکر ہیں ان دونوں کی وساطت سے کلاسیکی اردو شاعری کو میر وسودا جیسے عہد زریں میسر آیا۔صوفی اور درباری شعرا دونوں کے ہاں مزاحمتی رویے ملاحظہ کرسکتے ہیں'البتہ شاہی دربار سے منسلک شعرا میں مزاحمتی کم اور تعریفی اشعار زیادہ ملتے ہیں'اردو مزاحمتی شاعری کا نقطہ آغاز جعفر زٹلی کو گردانا جاتا ہے جس نے شاہ(اورنگزیب) کے بیٹوں کے خلاف نظمیں کہیں۔رشید امجد کا کہنا ہے کہ "جعفر زٹلی پہلا مزاحمتی شاعر ہے "(۲۹) یہ تو انفرادی سطح پر مزاحمت کی ایک مثال پیش ہوئی'اردو شاعر عہد بہ عہد مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو مرثیوں میں مزاحمت کے کئی حوالے ملتے ہیں جہاں مرثیہ نگاروں نے مزاحمتی رویہ اختیار کیا اس بارے میں پروفیسر انیس اشفاق کا بھی یہی خیال ہے کہ " اردو ادب اپنی فکر،مزاج ومنہاج اور مزاحمتی اسلوب بیان میں مرثیوں سے قوت نمو حاصل کرتا ہے۔"(۳۰)

صرف یہی نہیں انگریزوں اوران کے مسلط کردہ نظام کے خلاف اکبرالٰہ آبادی اور پھر نظیراکبر آبادی کی شاعری میں مزاحمتی شاعری کارنگ غالب نظر آتاہے۔آگے جاکر اقبال ایک توانا آواز بن کر ابھرے تو دوسری جانب ترقی پسند تحریک پوری رعنائیوں اور توانائی کے ساتھ کلاسیکی الفاظ میں سیاسی روح پھونک کر مزاحمت کرنے میدان میں اتر آئی۔اردوشاعری کومزاحمت سے الگ نہیں کرسکتے'خاص طورسے انگریزوں کی آمد کے بعد اردوشاعری کو کئی جہتیں اورنئے افق ملے'جن کی بدولت اردوادب میں وسعت آئی'انگریزوں سے آزادی کے حصول کے لیے جہاں مقامی اخبارات پیش پیش رہے وہاں شعرا بھی پیچھے نہیں رہے' کبھی طنزیہ انداز میں کبھی مزاحیہ تو کبھی برملاانگریزوں کے خلاف مزاحمتی شاعری کی۔شہزاداحمد کا کہنا ہے کہ "۱۸۵۷ءسے لے کر حصول آزادی تک سارا ادب احتجاجی اور مزاحمتی ادب تھا"(۳۱)

اردوادب کی جملہ تحریکوں میں سے ایک اہم تحریک "ترقی پسند تحریک ہے" یہ ادب برائے زندگی کوپرچار کرتی رہی'ترقی پسند ادب میں مزاحمتی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں'بلکہ اردو ادب میں یہ ایک لحاظ سے مزاحمت پر مشتمل تحریک ہے'جس نے اپنے آغاز میں ہی مزاحمت پر مشتمل" انگارے" اور"شعلے" عوام کے حوالے کیے ۔نسترن فتیحی کا کہناہے کہ "ترقی پسند تحریک جس کی بنیاد۱۹۳۶ء میں پڑی دراصل اردو کی پہلی خالص مزاحمتی تحریک تھی"(۳۲) اردوادب میں مزاحمتی ادب بطور رجحان سے پہلے کا جائزہ لیاجائے تواقبال کو فراموش نہیں کیاجاسکتا جس کی شاعری میں مزاحمت کے کئی پہلو دیکھے جاسکتے ہیں'بڑے شعرامیں اقبال کے بعد ایک بڑانام فیض احمد فیض کا آتاہے جس کی شاعری میں مزاحمتی رویہ توانااندازمیں درآیاہے۔ڈاکٹر عبدالغفور بلوچ کا کہناہے کہ:

> "اردو کے مزاحمتی ادب میں جہاں بے شمار معروف ااور غیر معروف شعرانے اپنے افکار وخیالات کی ترجمانی شاعرانہ اندازمیں کی'ان میں دونام بڑے نمایاں ہوکر سامنے آتے ہیں۔ان میں ایک شاعر مشرق'مفکر اسلام'،مصور مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان علامہ محمد اقبال اور دوسرے مزاحمتی ادب کا شاہ کار فیض احمد فیض ہیں"(۳۳)

مزاحمتی شاعری عالمی سطح پر نوآبادیات کے خلاف مجبوروں اور مقہوروں یعنی تیسری نسل کی آوازبن کر ابھری۔اردو ادب میں مزاحمتی لحن ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد کی شاعری میں نظر آتاہے۔لیکن اردو میں مزاحمتی شاعری قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں مارشل لائی حکومتوں کے خلاف توانا آواز کی صورت میں ایک رجحان بن

نمودار ہوئی۔ڈاکٹر شگفتہ حسین کا کہنا ہے کہ "پاکستانی حکومت کے خلاف احتجاج سے لے کر ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء اور پھر ۱۹۷۷ء کے تاریک ضیائی مارشل لاء تک ادیب وشاعر کا قلم حکایات خونچکاں لکھتا رہا اور ہاتھ قلم ہوتے رہے "(۳۴)

ادب کا مقصد اور ہدف صرف حسن کی تلاش نہیں ہے'بلکہ ادب اپنے معاشرہ کی بہتری کے لیے سوچتا ہے'ادب ہر اس چیز کا شدت کے ساتھ مزاحمت کرتا ہے اور مقابلہ کرتا ہے'جو معاشرے کے اجتماعی مفاد کے خلاف ہو'جہاں اظہار رائے پر پابندی ہو'جہاں مطلق العنانیت ہو'جہاں جمہوریت کا جنازہ نکالا جارہا ہو'جہاں طبقاتی استحصال ہو'ادب آگے بڑھتا ہے اور معاشرے سے ان ناسوروں کو پاک کرکے عادلانہ اور منصفانہ معاشرہ کی تشکیل کے لیے اپنا رول ادا کرتا ہے۔مزاحمتی شاعری بھی صرف نعرے لگانے سے عبارت نہیں ہے بلکہ معاشرے میں پیدا صورت کو یکسر تبدیل کرکے عظمت رفتہ کے حصول کی کوشش کا نام ہے۔لہذا اردو ادب میں میر'مصحفی سے لیکر حبیب جالب وفیض تک کی شاعری میں مزاحمتی پیرایہ اظہار خوبصورت لب ولہجہ کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔بشمول فیض ان شاعروں کی شاعری اپنے اپنے عہد کی ترجمان ہے'جس سے اس عہد کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔اس دور کی آمریت کی بالادستی'عوام کی بدحالی اور زبوں حالی کو ان شاعروں نے موضوع سخن بنایا جسے مزاحمتی شاعری کے نام سے ادبی دنیا یادرکھے گی'اس ضمن میں سعادت سعید لکھتے ہیں:

> " تخلیقی دوام صرف اس شاعری کا حصہ ہے جو اپنے عہد میں ہونے والے مظالم کے خلاف بھرپور آواز اٹھاسکتی ہے۔ یہ شاعری آمریت کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ آمریت کا سہارا بننے والے بالائی طبقوں کا کچا چٹھا بھی کھولتی ہے۔ اور اس امر سے بھی پوری آگاہی رکھتی ہے کہ جب تک بالائی طبقوں کی لوٹ مار جاری رہے گی جمہوریت، اور حریت اظہار کے معاملے میں محض نعرہ بازی کے زمرے ہی میں رکھے جاسکیں گے۔ بالائی طبقے کبھی ایوان استبداد کے پیچھے چھپ کر لوگوں کی زندگیاں اجیرن کرتے ہیں اور کبھی آزادی کی نیلم پری یعنی جمہوری قباء میں پائے کوب ہوتے ہیں"(۳۵)

ہندوستان کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

اردو ادب میں مزاحمت کا بیان پہلے بھی ہوتا رہا البتہ یہ اصطلاح کسی طاقت ور حاکم یا آمر یا مملکت کے خلاف بدنی قوتوں سے برسرپیکار ہونے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔اور جو مزاحمت کرتے ہیں انہیں مزاحمت کار کہا جاتا

ہے۔پاکستان میں مارشل لاء کے خلاف لکھاجانے والاادب بھی مزاحمتی ادب کہلایا۔چنانچہ کستان میں مزاحمتی ادب مارشل لائی نظام کے خلاف ایک توانا آوازاوراحتجاج کے طور پر ابھرا۔پاکستان میں مزاحمتی ادب کے سرخیل فیض احمد فیض کو کہاجائے توبجانہ ہوگا۔ تقسیم کے بعد کا وہ پاکستانی ادب جو ترقی پسند تحریک کے عہد میں لکھا گیا اس میں ایسے اشارے موجود ہیں۔یوں تو بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن فیض احمد فیض کی آواز اس دور میں بہت نمایاں انھوں نے لاتعداد نظمیں اور غزلیں لکھیں جن میں ان کامزاحمتی احساس نمایاں ہے۔

جب کھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
اب یہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے
قتل گاہوں سے چن کر ہمارے عَلم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

ج: جلاوطنی اوراس کے مباحث

i۔ جلاوطنی کامفہوم:

جلاوطن کے انگریزی میں Exile کالفظ مستعمل ہے عربی میں جلاوطن کو شخص کو "المنفی" کہاجاتا ہے۔

"مصباح اللغات" کے مطابق:" المنفی: دور کیاہوا، ہٹایاہوا، دھتکاراہوا:نفی، ینفی نفیاً: انکار کرنا، نفاہ عنہ علٰحدہ کرنا، ہٹانا،نفی الرجل من بلدہ جلاوطن کرنا[۳۶] جلاوطنی کو عربی میں "اغتراب" بھی کہاجاتا ہے "اغترب: وطن سے علٰحدہ ہونا"[۳۷]

انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے تو اس منتقلی کو ہجرت کہاجاتا ہے'جن شاعروں اورادیبوں نے دیارِ غیر میں سکونت اختیار کی'پھر وہاں انہوں نے اپنے وطن کی یاد میں 'وطن کی محبت میں اوروطن کے دکھ درد کے بیان میں ادب کی شمع روشن کی توادب کاایک نیامنظر نامہ سامنے آیاجسے مہجری ادب کے نام سے جاناجاتا ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر اشفاق احمد کابیان قابل غور ہے۔ان کا کہناہے:

"مہجری ادب ایک ایسا ادب ہے جس کی ایک سطر سے خوشبوئے وطن پھوٹتی ہے'وفا پرستی کے نغمے گونجتے ہیں'فدائیت اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے'جس کا ہر فنکار اپنے میدانِ تخیل کا شہسوار'جس کی ہر تحریر دل پذیر جس کا ہر اسلوب قاری کے لیے پسندیدہ اور مقبول ہے"(۳۸)

جلاوطنی کی شاعری مہجری ادب کی ایک قسم ہے ۔جلاوطنی یعنی ملک بدری'ایسا شخص جو اپنے وطن سے کٹا ہوا ہو وہ شخص جلاوطن کہلاتا ہے'دیارِ غیر میں گزراوقات کرنے کا نام جلاوطنی ہے۔جلاوطنی کو سمجھنا'وطن سمجھنے پر موقوف ہے'وطن کی صحیح معنوں میں تفہیم ہو جائے تو جلاوطنی کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔وطن کی وضاحت دیتے ہوئے انوار احمد نے جلاوطنی ان الفاظ کے ساتھ خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

"وطن'زمین اور زمانے کو کہتے ہیں'تاریخ،جغرافیہ،معیشت اور ثقافت سبھی اسی زمین اور زمانے سے عبارت ہیں اور جب تاریخ کا پہیہ الٹا گھمانے کی کوشش کی جائے یا تاریخ کی غلط تعبیر کی جائے،جب ثقافت کو مسخ کیا جائے،جب جغرافیے کو گروی رکھا جائے اور جب احساسِ شرکت سے محرومی پر سیاست کا ڈھانچہ کھڑا کیا جائے تو جلاوطنی کا باب کُھلتا ہے،گویا جلاوطنی کی کئی سطحیں ہیں'جغرافیائی،تاریخی،سیاسی اور ثقافتی،غلام بھی جلاوطن ہوتا ہے اوراپنی زمین اور زمانے سے بچھڑا ہوا بھی'وہ بھی جلاوطن ہوتا ہے جو اپنی ثقافت سے محروم ہو اوراسے بھی جلاوطن کہیں گے،جو سیاسی و معاشی نظام اور فیصلوں میں شرکت کے احساس سے محروم ہو،یعنی ایک جلاوطن تو وہ ہوا جسے دیس نکالا ہے اور ایک وہ ایک وہ جو وطن میں رہ کر بے وطن اور گھر میں رہ کر بے گھر ہو جائے،مگر یہ طے ہے کہ جلاوطنی کی ہر صورت جذباتی اور فکری آشوب کا منبع ہے"(۳۹)

وطن کو ترک کرنے کی دو صورتیں ہیں اختیاری یا غیر اختیاری۔اختیاری صورت میں فرد کسی آدرش یا روزگار کے حصول کے لیے وطن کو خیرباد کہہ دیتا ہے جبکہ غیر اختیاری صورتوں میں سے ایک اہم صورت جلاوطنی ہے۔جلاوطنی کیا ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے؟اس بارے میں ڈاکٹر عذرا پروین رقمطراز ہیں:

"جلاوطنی ترکِ وطن کی وہ صورت ہے کہ جو کسی فرد'قبیلہ یا بڑے گروہِ انسانی کو داخلی یا خارجی سطح پر جبر کے ایسے احساس میں مبتلا کر دے کہ ان کے لیے اپنی جنم بھومی پر رہنا مشکل یا کسی حد تک ناممکن دکھائی دینے لگے۔جلاوطن ہونے والے افراد بسا اوقات ریاست کے قوانین

اور سماج یا مذہبی ضابطہ حیات کے ساتھ سمجھوتہ نہ کرسکنے کے باعث جلاوطنی پر مجبور کئے جاتے ہیں"(۴۰)

جب انسان جلاوطنی کے تلخ تجربے سے اپنے آپ کو گزارتا ہے تو اگر جلاوطن ہونے والا شاعر یا ادیب ہو تو وہ اپنے فن پاروں کے ذریعے ذہنی کرب اور محرومیوں کو بیان کرتا ہے'یوں ایک نئے سرے سے ادب کی ایک اور جہت معرض وجود میں آتی ہے'دوسرے لفظوں میں جلاوطن شخص کے تلخ تجربات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی انتشار کو تحریری صورت میں لے کر آنا جلاوطنی پر مشتمل ادب ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر ناہید قمر کا کہنا ہے کہ:"جلاوطنی سیاسی وجوہات کی بنا پر عمل آئے۔اپنے ماحول سے ناآسودگی کی بنا پر جنم لینے والی ایک ذہنی کیفیت یا پھر خوداختیار کردہ جلاوطنی ہو ایک ایسا عمیق تجربہ ہے جو انسان ذہن وروح کی سطح پر کرتا ہے"(۴۱)

آج کی یہ دنیا جہاں سائنسی لحاظ سے بہت ترقی کر چکی ہے وہاں دنیا میں سرمایہ داریت'استعماریت'ٹارگٹ کلنگ'ریاستی دہشت گردی'بھوک'افلاس اور پھر مشینی دنیا کی وجہ سے بیگانگیت جیسے مسائل میں آئے روز اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے'نتیجے میں سماج میں خودکشی'تشدد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے مزید برآں معیشت کی بہتری'اذیتوں اور مصیبتوں سے نجات کی خاطر لوگ جلاوطنی کے لیے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اس ضمن میں ڈاکٹر محمد سفیر اعوان لکھتے ہیں:

"حکومتی یا سیاسی تشدد یا ریاستی دہشت گردی کا خدشہ، سماجی استعمار کی غیر انسانی رویے جو رنگ، جنس، طبقاتی حیثیت کا نتیجہ ہوتے ہیں، فارغ اوقات اور روح کی بالیدگی کے لیے میسر لمحات کا تصور بھی ناپید ہوتا ہے۔۔۔ ایسے ناخوشگوار حالات خودکشی، تشدد، مزید غربت اور مایوسی کی ایک غلام گردش اور بالآخر خودساختہ جلاوطنی پر منتج ہوتے ہیں"(۴۲)

پس جلاوطنی طول تاریخ سے چلتی آئی ہے'جو کہ ہمیشہ ادب کا حصہ رہا ہے'نوآبادیات کے بعد انسان کا تشخص مزید گھما گیا'انسانوں میں بیگانگیت کی ایک لہر جاری ہوگئی'نتیجے میں جلاوطنیاں وجود میں آئیں بلکہ اپنے ہی وطن میں بھی اظہار رائے پر پابندی اور حقوق کی پامالی نے انسان کو اپنے ملک میں ہی جلاوطن رکھا۔اور خاص کر استعماریت اور طاغوت کے زیر کنٹرول ممالک میں جلاوطنی کی کئی صورتحال نمودار ہوئیں تو شعرانے علائم کا سہارا لے کر اور براہ راست دونوں طرح کے طرز اظہار سے جلاوطنی کو شاعری میں بڑے اچھے اور تاثیر کن انداز میں پرویا جو کہ قابل تحسین کے ساتھ قابل تقلید بھی ہے۔

ii۔ جلاوطنی بطور ایک سماجی عمل:

ہر انسان اپنے ملک سے 'اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتا ہے وطن کو "ماں" بھی کہا جاتا ہے 'قدرت نے انسان کی فطرت میں بھی وطن سے محبت رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان وطن سے کہیں دور چلا جاتا ہے تو جہاں وطن کی تہذیب وثقافت یاد آتی ہے تو وہاں ہم وطن دوستوں 'عزیزوں اور رشتہ داروں کی بھی بہت یاد آرہی ہوتی ہے۔ اسلامی تعلیمات بھی وطن سے محبت کو ایمان کا حصہ قرار دیتی ہیں چنانچہ حدیث مبارکہ ہے کہ حب الوطن من الایمان۔ یعنی وطن کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔

جلاوطن ہوا بھی جاتا ہے اور کیا بھی جاتا ہے 'بہتر معیشت کے لیے جلاوطن ہو جاتا ہے جبکہ حکومت کسی شخصیت کو اپنے لیے خطرہ کی گھنٹی سمجھ لے تو اس شخصیت کو جلاوطن کیا جاتا ہے۔ ان دونوں محرکات کے بارے میں انوار احمد رقمطراز ہیں " ایک تو وہی کہ ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست اور شاہین چونکہ آشیانہ نہیں بناتا اور دوسرے یہ کہ ترک وطن کا ہمہ گیر جنوں محض معاشی محرکات کے تابع ہے۔ حالانکہ ترک وطن کی اس اجتماعی آرزو کے پس پردہ شرفِ آدمیت کی تذلیل پر قائم سیاسی وسماجی نظام ہے "ایک شخص جب جلاوطن ہوتا ہے تو اس کا بدن دیار غیر میں ہوتا ہے لیکن اس کا ذہن اپنے وطن کی گلیوں اور بازاروں میں محو سفر ہوتا ہے۔ اس بارے میں عبد اللہ حسین کا کہنا ہے کہ:

" جلاوطن اپنے قبیلے کی کشش سے کبھی چھٹکارا نہیں پاسکتا، چاہے وہ اپنے قبیلے سے مایوس ہی کیوں نہ ہو چکا ہو 'یہاں کشش سے چھٹکارا پانے کا سوال نہیں، جلاوطن کی ساری ریاضت اور ذہنی مسافت وطن کو پُرکشش بنانے کے لیے ہوتی ہے "(۴۳)

انسان کی زندگی سفر سے عبارت ہے 'یعنی انسان ہر لمحہ حالت سفر میں ہے 'جیسا کہ احادیث مبارکہ میں یہ بات آئی ہے کہ انسان کی ہر سانس موت کی جانب ایک قدم ہے۔ جب سے دنیا کی تخلیق ہوئی ہے 'انسان کا سفر بھی برابر چلتا آیا ہے۔ حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو پہلے انسان متصور کیے جاتے ہیں 'ان کی دنیاوی زندگی بھی جنت گم گشتہ سے سفر کا ہی نتیجہ ہے 'گو کہ انسان نے دنیا میں زندگی کا آغاز بھی جنت سے سفر کے بعد کیا۔ انسان سفر کیوں کرتا ہے اس کی کیا وجہ ہے اس بارے میں ڈاکٹر ناہید قمر کا کہنا ہے " آغاز کائنات سے ہی انسان کبھی ضروریات زندگی کے تحت اور جنگ وجدل کے باعث قیام کی بجائے حالت سفر میں زیادہ رہا ہے "(۴۴)

دنیا میں اچھے بھلے اور برے حکمران بھی گزرے ہیں۔جب بھی براحکمران یا بادشاہ آتا تو بیشتر ایسا ہوتا تھا کہ لوگ ظلم وجبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے اور یوں ظلم کے خلاف اپنی آواز بلند کر دیتے تاکہ لوگوں میں بیداری اور شعور آجائے'(نتیجے میں ظلم کا سدباب کیا جا سکے)جب مزاحمت اور انقلاب کی تحریک اٹھنے لگتی تو حکومت کی مشینری حرکت میں آجاتی اور کئی ایسے اسالیب اور ہتھکنڈے حکومت اپناتی تھی جن سے مزاحمتی رویوں اور انقلابی لہروں کو روکا جا سکے۔حکمرانوں اور بادشاہوں کے جملہ اسالیب میں سے ایک اہم اسلوب یہ تھا کہ وہ اپنے مخالفین کو جلاوطن کر دیتے یا ملک بدر کرنے کی دھمکی دے دیتے تاکہ ان کی بادشاہت چلتی رہے اور آئندہ کوئی دوسرا شخص ایسی جرات نہ کر سکے۔

iii۔ جلاوطنی اور ادب:

سفر'ہجرت اور جلاوطنی ایک لحاظ سے بدنی (جسمانی) ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی بھی ہے۔اس سے انسان کو بہت کرب اور غم دامن گیر ہوتا ہے'انسان پر جلاوطنی کے نتیجے میں دکھ'درد'کی ایک فضا چھائی رہتی ہے۔شاعروں اور ادیبوں نے انسانوں کے اس کرب کا مشاہدہ کیا اور خود بھی تجربات سے گزرے تو سفر'ہجرت اور جلاوطنی پر مشتمل کئی اہمیت کے حامل فن پارے ورثے میں دیئے۔قدیم یونان کے ادب پاروں سے ہی اگر بات کا آغاز کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یونان کے ادیبوں میں ہومر کو ایک اہم مقام حاصل ہے'جن کے فن پاروں میں بھی روداد سفر کا المیہ انداز ملتا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر ناہید قمر کا کہنا ہے:

> "یونان کے قدیم ادب کی اہم ترین تخلیق ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی تھیں۔ایلیڈ میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح یونانی قبائل نے ایشیائے کوچک میں ٹرائے شہر کا محاصرہ اور پھر اس پر قبضہ کیا اور اوڈیسی جو اوڈیسیس کی ٹرائے شہر سے اپنی سرزمین اتھاکا کی طرف واپسی کی داستان ہے یہ مسافرت جلاوطنی کی ایک خاص شکل ہے جس میں اوڈیسیس کو مبتلا دکھایا گیا ہے"(۴۵)

بات صرف یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ جوں جوں ادب ترقی پاتا گیا'سفر'ہجرت اور جلاوطنی کی کیفیتوں کا بیان برابر چلتا رہا۔البتہ ان کے بیان کے اسالیب میں عہد'مقام اور تہذیب وثقافت کے اعتبار سے الگ الگ نوعیتوں کے حامل ہیں؛لیکن ہجرت'سفر اور جلاوطنی کے فکر کے بیان میں اشتراکات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔یونانی ادب کے بعد کے اہم جلاوطنی پر مشتمل فن پاروں میں اینیڈ اور مہابھارت کے نام بھی آتے ہیں۔"ورجل کی اینیڈ بھی مسافرت اور ترک وطن کے دکھ سے مملو ہے ہندی ادب کی دو طویل رزمیہ نظمیں مہابھارت اور رامائن میں جنگ وجدل کے ساتھ ساتھ رام اور سیتا کی چودہ سالہ مسافرت اور جلاوطنی کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے"(۴۶)

جدید ناولوں میں ایک ناول ہر من ہسے کا "سدھارتھ" ہے انہوں نے اپنے اس مشہور ناول میں انسان کے جسمانی سفر سے ذہنی سفر کے معنی اخذ کئے ہیں اسے انہوں نے ایک جلاوطنی کی شکل میں بیان کیا ہے۔ جدید دور کے فن پاروں میں ادیبوں اور شاعروں نے جلاوطنی کے بیان میں مزاحمتی انداز بھی اپنایااور وطن سے دور ہو کر وطن کی بہتری کے لیے اپنا مجاہدہ برقرارر کھااس ضمن میں انوار احمد کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر طاہر تونسوی کا کہنا ہے کہ:

"چنانچہ اب 'مجاہدے' کی بہتر صورت یہ ہے کہ شاعر بے بس اربابِ وطن کے ساتھ مل کر جبر کی رات کا سامنا کرے اور اجتماعی جدوجہد میں جذباتی اور فکری قیادت کرے اور دوسری صورت یہ کہ وہ جلاوطنی کا چغہ پہن لے 'اب وہ عافیت کوش بن جائے یا خود اذیتی کی آگ میں جلے اور وطن سے دور ہونے کا خراج ادا کرے "(۴۸)

ادیبوں اور شاعروں نے اپنے مجاہدہ کو استعماریت کے خلاف جاری رکھا کیونکہ نو آبادیات کے نتیجے میں ہی صرف شخص نہیں پورا معاشرہ ہی جلاوطن ہوا اس ضمن میں ناہید قمر کا کہنا ہے کہ "نو آبادیاتی نظام نے بالخصوص انیسویں اور بیسویں صدی کے لوگوں کو اپنے ہی وطن میں بے گھر 'جلاوطن اور اجنبی بنا دیا ہے "(۴۹)

یورپ کے مقابلے میں جلاوطنی کا دکھ ایشیا اور افریقا کے ممالک کو جھیلنا پڑا کیونکہ اکثر جلاوطن انہی کے لوگ ہوئے 'وطن ایک نعمت ہے 'ہر نعمت کا احساس اس وقت زیادہ شدت سے ہوتا ہے جب وہ نعمت چھن جائے 'اسی طرح وطن میں ہو تو وطن کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا جب وطن سے بچھڑ جاتا ہے تو پھر وطن کی تلاش میں انسان لگا رہتا ہے 'اگر شاعر یا ادیب ہو تو اسی وطن کو خوبصورت بنا کے پیش کرنے کے تگ ودو میں لگا رہتا ہے۔ "وطن کے جنت ہونے کا ادراک جلاوطنی میں ہوتا ہے۔ لہذا جلاوطنی ایک ایسا تناظر ثابت ہوتی ہے جو وطن کا ایک نیا معنی روشن کرتی ہے "(۵۰) جلاوطن شاعر ایک طرف اپنے تخیل کے زور سے وطن کی بازیافت کرتا ہے تو دوسری جانب وطن کا بہترین تصور بھی پیش کرتا ہے جہاں ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ ہو 'ظلم کا خاتمہ ہو اور عدل کا بول بالا ہو جلاوطن شاعر وطن کی یاد میں یا اسے جنت سمجھ کر گریہ وزاری نہیں کرتا بلکہ وہ وطن سے جسمانی لحاظ سے دور ہوتے ہوئے بھی وطن کی تشکیل نو کے لیے فکر وسوچ دیتا ہے 'یہ ہر وہ شاعر دے سکتا ہے جس کے پاس عصری اور سماجی شعور کے ساتھ ساتھ زندگی کے بارے میں فلسفیانہ زاویہ نگاہ رکھتا ہو۔ "جلاوطنی میں یادداشت کے ملبے سے 'اگر ایک طرف وطن کی نرول بازیافت ہوتی ہے تو دوسری طرف ایک جنت نما وطن کے تصور کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔ جلاوطن ادیب کا تخیل صرف ماضی کے مانوس خطے میں ہی نہیں پہنچتا 'ایک مثالی خطے کا منفرد تصور بھی تخلیق کرتا ہے "(۵۱)

آج کی یہ تہذیب یافتہ اور ترقی یافتہ دنیا ایک عالمی گاؤں کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ جس میں نت نئی ایجادات ہیں 'تو کئی صنعتی کارخانے بھی 'اس دور میں انسان کی حیثیت سوالیہ نشان بن چکی ہے 'اس پُر ہجوم دور میں انسان پر ایک بیگانگی کی کیفیت طاری ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر انسان اپنے وطن میں بے وطن نظر آتا ہے۔

نو آبادیاتی ممالک میں عرب کے کئی ممالک بھی آتے ہیں جہاں سے بہت سے شعرا نے اپنے وطن سے دور دیار غیر میں زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ ایک رجحان کی صورت میں ان شعرا نے دوسرے ملکوں میں جاکر وطن کی یاد پر مشتمل شاعری کی بعد ازاں لبنان میں خانہ جنگی کے باعث خلیل جبران اور ان کے ساتھ بہت سے عرب شعراء امریکہ اور دوسرے ممالک میں جاکر بس گئے۔ اس تجربے نے ان کے اندر ناسٹلجیا کو جنم دیا۔

۱۹۴۸ء میں اسرائیل معرض وجود میں آیا تو فلسطین کے صرف لوگ نہیں گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر جلاوطن ہو گئے۔ جلاوطن ہونے والوں میں شاعر و ادیب بھی شامل تھے۔ ان میں سے ایک محمود درویش ہیں۔ انہوں نے جلاوطنی کے دکھ کو سہا اور پھر اسے شاعری کا روپ دیا۔ "محمود درویش ایک فلسطینی شاعر ہیں 'جو ارض فلسطین سے اپنی محبت اور جلاوطنی کے شدید اضطراب کو تخلیقی سچائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہر عرب کے دل کی آواز بن جاتے ہیں "(۵۳)

اردو شاعری کی بات کی جائے تو جلاوطن شعرا میں سے ایک نام فیض احمد فیض کا آتا ہے جنہوں نے دوبار جلاوطنی اختیار کی فیض کی جلاوطنی کی شاعری کے بارے میں "انوار احمد کا کہنا ہے کہ غربت و وطن کا مضمون اردو شاعری میں نیا نہیں 'مگر یہ مہاجرت کے احساس سے جدا رنگ رکھتا ہے۔ جب فیض کے ہاں آتا ہے اور یہ بھی ان کے اسی سفر کے نقطہ آغاز کی نشانیاں ہیں (۵۴)

ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں 'ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے
صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکر وطن
تو چشم صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں (۵۵)

iv۔ ادب میں جلاوطنی کی جہات:

ہجرت کی ایک قسم جلاوطنی ہے۔ ہجرت کی دو قسمیں ہیں 'اختیاری اور غیر اختیاری۔ بہتر معاش کی تلاش میں 'بہتر معیار زندگی کی امنگ لے کر اور بہتر تعلیم کی خواہش دل میں لیے وطن سے کہیں دور دیار غیر میں

جا کے آباد ہونا اختیاری جلاوطنی ہے۔ اس کے برعکس اگر بات ہو تو وہ جلاوطنی کی غیر اختیاری صورت ہے اس کی کئی صورتیں ہیں:

۱۔خود ساختہ جلاوطنی

۲۔جلاوطنی (ملک بدری)

۳۔علامتی جلاوطنی (پناہ گزینی)

۴۔وطن میں بے وطنی کی کیفیت (ملک بدیسی)

ملک کو کئی وجوہات کی بنیاد پر خیر باد کہا جاتا ہے ایک یہ کہ انسان معیشت کو بہتر بنانا چاہتا ہے اس وجہ سے وطن سے دور ہو جاتا ہے دوسری یہ کہ حاکم وقت اسے وطن میں بیٹھنے نہیں دیتا اسے ملک بدر کرتا ہے اور تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی حاکم یا آمر اسے ملک بدر نہیں کرتا لیکن ملک میں رہنا اس کے لیے محال ہو جاتا ہے' حقوق جہاں سلب ہو رہے ہوں' ایجنسیوں کا غول جس کا پیچھا کر رہا ہو' اظہار رائے پر پابندی ہو تو وہ شخص اپنے ملک میں رہتے ہوئے اپنے ملک سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور ایک احساس مغائرت جنم لیتا ہے' گو کہ ایک ذہنی کرب اور پریشانی کا عالم نمودار ہوتا ہے نتیجے میں وہ شخص وطن سے مزید قریب ہونے کے لیے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کرتا ہے۔خود ساختہ جلاوطنی کے بارے میں کہنا ہے کہ "فرد یا افراد یا گروہ ریاستی' سماجی قوانین سے ذہنی مطابقت یا ہم آہنگی پیدا نہ کر سکنے کے باعث از خود وطن ترک کر دیتے ہیں عرف عام میں اسے خود ساختہ جلاوطنی سے تعبیر کیا جاتا ہے"(۵۶)

ترک کی اختیاری صورتیں جیسے ترک سکونت یا نقل مکانی (اقتصادی حوالے سے کرنا) جلاوطنی میں شامل نہیں ہو سکتیں جبکہ گھر میں ہوتے ہوئے گھر بدری اور بے گھری کی صورت بھی جلاوطنی میں شامل ہے کیونکہ جلاوطنی کے پہلو میں خوف' جبر یا گھٹن کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔جلاوطنی کی ایک کیفیت یہ ہوتی ہے کی ایک شخص سخت ریاستی قوانین' سماجی استحصال اور اظہار رائے پر پابندی کے باعث اپنے وطن میں ہی جلاوطنی کی کیفیت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر عذرا پروین کا کہنا ہے:

> جلاوطنی کی ایک بڑی صورت ذہن سے بھی تعلق رکھتی ہے جس پر بالعموم کم توجہ دی گئی۔۔۔ریاست میں بسنے والے بے شمار افراد ریاستی قوانین' سماجی جکڑبندیوں یا مذہبی حدود و قیود کو اپنے لیے زنجیر تصور کریں نہ کہ ریاست انہیں ملک بدر کرنے اور نہ وہ یہ استطاعت

یا حوصلہ رکھیں کہ جنم بھومی کو چھوڑ جائیں ایسی صورت میں وہ اپنی زمین پر رہتے ہوئے بھی ذہنی جلاوطنی کے کرب میں مبتلا رہتے ہیں (۵۷)

حکومتی مشینری جسے جلاوطن کر کے نکال باہر کردے اس کے خود ساختہ جلاوطنی کے پس منظر میں یہاں تک کہ ملک بدیسی میں بھی استعمار کی طاقتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے استعمار کو قبول کرنے سے انکار کیا نتیجے میں ذہنی جلاوطنی ڈھیرا جمانے میں کامیاب ہوگئی۔ ڈاکٹر محمد سفیر اعوان کا کہنا ہے کہ "جلاوطنی وطن سے محض جسمانی طور پر دوری نہیں بلکہ یہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔ جو ان لوگوں میں پیدا ہوئی جنہوں نے استبدادی حکومتوں کے سماجی اور معاشی استحصال کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اپنے ملک میں رہتے ہوئے بھی جلاوطن ہی رہے "(۵۸)

جلاوطنی کی ایک اور کیفیت فلسطینی عوام اور فلسطینی شعرا کا خاصہ ہے' جو اپنے ملک سے بے دخل کرنے کی صورت میں ابھر کر سامنے آئی' اس کیفیت میں انسان اپنے آپ کو مسلسل "بے خانماں" محسوس کرتا ہے' اور اپنی ایک شناخت کھو کر ایک اضطراب اور بے چینی کے عالم میں زندگی گزارتا ہے۔ جلاوطنی کی اس جہت کی طرف ایڈورڈ سعید نے رہنمائی دی بقول ناصر عباس نیر" کبھی نہ ختم ہونے والے اضطراب کی زد پر رہنا جلاوطنی کی استعاراتی حالت ہے۔ اس حالت کا محرک حقیقی بے دخلی بھی ہو سکتی ہے اور فکر و اظہار پر بندشیں بھی ہو سکتی ہیں اور اپنے ادبی و علمی نظریات سے سماج کی عدم موافقت (۵۹)

جلاوطنی کی ایک اور صورت پناہ گزینی کی کیفیت ہے۔ جسے علامتی جلاوطنی بھی کہا جا سکتا ہے۔ حالت جنگ میں یا ملک میں انارکی کی کیفیت آجائے تو انسانوں کے گروہ در گروہ ہمسایہ ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں' پناہ لینے والے افراد کو پناہ گزین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ پناہ گزینی کی کیفیت وقتی ہوتی ہے' جب جنگ رک جائے اور ملک میں بہتری آجائے تو ملکی باشندے اپنے ملکوں کو واپس چلے جاتے ہیں لیکن کبھی کبھار یہ جلاوطنی بھی ہمیشہ کی جلاوطنی میں بدل جاتی' وطن جانا تو دور کی بات ' وطن خواب بن کر رہ جاتا ہے۔ کوئی بھی ملک انہیں اپنا شہری بنانے میں حامی نہیں برتتا' نتیجے میں ایک بے یقینی کی فضا ان پر چھا جاتی ہے اور یوں ان میں شناخت کا بحران پیدا ہوتا ہے۔

فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں مزاحمت کی ان جہات میں سے' خود ساختہ جلاوطنی' جلاوطنی (ملک بدری)' گھر بدری ' علامتی جلاوطنی (پناہ گزینی) اور وطن میں بے وطنی کی کیفیت (ملک بدیسی) جیسی جہات پر بحث ہوگی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے گا کہ ان دونوں شعرا نے علامات اور براہ راست انداز میں جلاوطنی کو بیان کیا اس دوران ان پر ناسٹلجائی کیفیتیں بھی غالب رہیں۔

د: بیگانگیت اوراس کے مباحث

i۔ بیگانگیت کا مفہوم:

ڈاکٹر ساجد اللہ تفہیمی نے اپنی کتاب "فرہنگ علوم ادبی اصطلاحات" میں بیگانگیت کے ان الفاظ میں معنی لکھے ہیں: بے گانہ، ناشناس، اجنبی، ناآشنا(۶۰) یگانہ: غیر، ناواقف "درسی اردو لغت" کے مطابق بیگانگی سے مراد: غیر ہونا، تعلق نہ رکھنا(۶۱) بیگانگیت کو انگریزی میں Alienation کہاجاتا ہے یہ سماجی، نفسیاتی اور فلسفیاتی اصطلاح ہے جو کہ ادب کا بھی حصہ بن چکی ہے۔ بیگانگیت کو اجنبیت، وجودیت یا موجودیت اور عدم مطابقیت بھی کہاجاتا ہے۔ بیگانگیت کے کئی زمرے ہیں اور ہر ایک کی اپنی پہچان ہے ایک بیگانگیت کا تعلق تصوف کے نظریہ "وحدۃ الوجود" سے ملتا ہے تو دوسرے کے ڈھانڈے کارل مارکس کے معاشی اجنبیت تک جاپہنچتے ہیں تو تیسرے کا سرا فرانس کے مفکروں اورادیبوں کے نظریہ وجودیت سے ملتا ہے۔ قاضی جاوید کی نظر میں "وجودیت 'ہر قسم کے محض تجریدی 'منطقی وسائنسی فلسفہ کی نفی ہے "(۶۲) گو کہ وجودیت میں انسان کا وجود اہم ٹھہر تا ہے 'یعنی انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی منزل کیا ہے؟ انسان تنہا کیوں ہے؟ اس تنہائی سے نکلنے کے لیے کیا کرنا ہو گا؟ اور یہ کہ خوف 'اور موت کا مداوا کیسے ممکن ہے؟ اس نوعیت کے ابحاث وجودیت میں کئے جاتے ہیں۔ بیگانگیت کی ایک کیفیت یہ بھی ہے کہ ایک شخص کا اپنے معاشرے کے مجموعی افکار سے مطابقت نہیں ہو پاتی جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اجنبی فرض کرتا ہے۔ افتخار بیگ کا کہنا ہے کہ:

> "بیگانگی کا تصور وجودی فلاسفہ کے ہاں دوش / جرم کے ساتھ وابستہ ہے 'اوراس کی مزید توجیہہ بھی کرتا ہے۔ وجودی فلاسفیہ کے ہاں ایک موضوعی کیفیت ہے جس میں فرد شدید داخلی کرب اور جرم / دوش کا شکار ہوتا ہے۔ یہ وجود کی ہستی کی اتھاہ گہرائیوں سے پھوٹتی ہے فرد کو بسااوقات زندگی کی غیر معمولی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ صورت حال فرد کے لیے محدودیت کا باعث بنتی ہے 'محدودیت سدراہ بنتی ہے تو موجود کی خود آگہی اور خود تونگری کا احساس سوالیہ نشان کی زد میں آجاتا ہے یہی لمحہ بیگانگی کا ہوتا ہے "(۶۳)

بیگانگیت کا ایک تناظر مذہبی بھی ہے۔ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کہاں سے آیا؟ کہاں ہے اور کہاں جانا ہے؟ اس حوالے سے کئی نظریات دیکھے جاسکتے ہیں ان میں دو نظریے اہم ہیں ایک الٰہی نظریہ دوسرا مادی نظریہ۔۔ الٰہی نظریہ کے مطابق انسان اور کائنات اللہ کی تخلیق ہے جبکہ انسان اور کائنات ارادہ الٰہی سے فعال ہیں 'انسان زمین پر اللہ کا نائب ہے 'انسان کو کسی مقصد کے تحت خلق کیا گیا 'کائنات اور دنیا مقصد نہیں ہے بلکہ یہ دنیا اور کائنات

ایک وسیلہ ہے جس کو استعمال میں لا کر اصل اور ابدی زندگی یعنی آخرت میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن جب ہم مادی تصور کائنات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعیات سے بھی انکار کا فلسفہ ملتا ہے۔ وجودی نظریہ بھی ایک لحاظ سے مادی تصور کائنات کا شاخسانہ ہے اس کے مطابق انسان کی کوئی پہچان اور شناخت نہیں ہے' انسان کو کائنات میں پھینکا گیا' لہٰذا انسان اپنے وجود کے اثبات کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور اس کی یہ جدوجہد لایعنی اور لاحاصل ہے نتیجے میں بیگانگیت انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔ غفور شاہ قاسم کا کہنا ہے کہ:

> بیگانگی و مغائرت کے معنی موجودیت میں ایک شدید اور کربناک احساس کے ہیں۔ جو انسان کی ساری شخصیت کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ موجودیوں کا کہنا ہے کہ آدمی جب کسی غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہو کر اپنی داخلیت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے تو وہ بیگانگی اور مغائرت کا شکار ہو جاتا ہے وہ اپنی اس مغائرتی کیفیت میں اس اضطراب میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ اس کی فطرت بھی خارجی شے سے مماثلت نہیں رکھتی لہٰذا اس کی کیفیت لامکانی Home Lessness کی سی ہو جاتی ہے"(۶۴)

ایرک فرام کے نزدیک انسان جوں جوں آزاد ہوتا چلا جاتا ہے اسی اعتبار سے انسان اجنبیت کا شکار ہو جاتا ہے پہلے زمانوں میں انسان کو زیادہ آزادی میسر نہیں تھی تو بیگانگیت بھی نہیں اتنی نہیں تھی جوں جوں انسان آزاد ہوتا گیا انسان کی بیگانگیت بڑھتی گئی اس حوالے سے ان کا یہ اقتباس قابل غور ہے:

> "Alienation is that condition when man does not experience himself as the actionbcar~r of his own power and richnes~ but as an impo\erishcd 'thing' dependent on pmvers outside of himself."(۶۵)

ارسطو کے مطابق "انسان معاشرتی حیوان ہے" یعنی انسان کے لیے اپنے معاشرے سے کٹ کر زندگی گزارنا بڑا مشکل کام ہے' پہلے پہل معاشرے میں لوگ ایک دوسرے سے مختلف بہانوں اور موقعوں پر ایک دوسرے سے ملاقات اور ایک دوسرے کے پاس آنا جانا لگا رہتا تھا' کوئی کہانی سناتا اور لوگ اسے سن رہے ہوتے' کسی عالم کے پاس لوگ جاتے اور ایک علمی محفل سج جاتی' مقامی تہوار پر' عید ملن پر لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوتے تھے۔ لیکن جب انسان ایک دوسرے سے بے محتاج ہونا شروع ہوا' مشین کی طرف ضرورت بڑھنے لگی تو انسان' اپنے جیسے انسانوں سے زیادہ مشینوں سے مانوس ہوئے' اس کی وجہ سے انسان رفتہ رفتہ سماج سے جدا ہوتا گیا' جب سماج سے انسان الگ

ہواتوانسان نے تنہائی میں اپنی جانب سفر شروع کیااور خود کو وہ بیگانگی کی کیفیت میں مبتلا پایا۔لہذا سماج سے انسان کے انسلاکات جب ختم ہو جائیں تو انسان کے وجود میں بیگانگیت سما جاتی ہے۔" احساس بیگانگی کو اپنے وسیع مفہوم میں لیا جائے تو مختصر الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ فرد کا اپنے سماجی وجود کے مختلف کلیدی پہلوؤں سے علیٰحدگی ہے "(٦٦)

پہلے پہل فلسفیانہ مباحث میں اور علمی مباحث میں وجود خداوندی زیر بحث رہا جب مادیت کا خول انسان نے چڑھا لیا تو اللہ سے رشتہ توڑ دیا اور آسمانی باتوں کی بجائے زمین اور اس سے پیوستہ چیزوں کی باتیں ہونے لگیں'توحید'نبوت'امامت اور قیامت کی بحثیں ثانوی قرار دی گئیں'انسان اور پھر روٹی'کپڑا اور مکان کی حد تک محدود ہو گئے'جب انسان سے اللہ سے رشتہ توڑ دیا تو اسے ذہنی اور قلبی سکون میسر نہیں آیا'انسان روز و نیاز اور مناجات سے کوسوں دور ہو گئے'مشینوں سے زیادہ مانوس ہو گئے تو روحانی غذا انسان کے لیے میسر نہیں آئے ۔نسوا الله فانساکم انفسکم آج کے انسانوں نے اللہ کو بھلا دیا تو نتیجے میں اللہ نے بھی انسان کو بھلا دیا اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جب انسان کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا تو انسان اپنی خواہشات کو بت بنا کر سجدہ ریز ہوئے اور یوں انسان کثرت گناہ میں پڑ کر اپنے وجدان اور نفس لوامہ کے حضور ندامت کے آنسو پونچھتے رہے'جب انسان برائی کرتا ہے تو اس کا نفس لوامہ ملامت کرتا ہے تو انسان ایک کرب میں ہوتا ہے جب تک توبہ کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا وہ ملامت اسے بے چین رکھتا ہے۔اور وہ اپنے آپ کو احساس جرم اور گناہ کی وجہ سے بیگانگی میں پاتا ہے۔لیکن جب یہی جرم کار اللہ کی بارگاہ میں جھکتا ہے تو اس کے نفس کو سکون ملتا ہے اور وہ بیگانگیت دور ہو جاتی ہے۔الابذکر الله تطمئن القلوب آگاہ رہو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان میسر آتا ہے۔

یہ تو الٰہی نظریہ کے مطابق توجیہہ جس کی وجہ سے انسانوں میں بیگانگیت آتی ہے۔وجودی فکر رکھنے والوں کے نزدیک انسانوں میں بیگانگیت کی وجہ مشینی ترقی ہے۔جب مشینوں نے ترقی کی'انسانوں کے مقابلے میں مشینیں زیادہ کام کر گئیں'نتیجے میں انسان کے اثبات پر سوال اُٹھنے لگے'انسان کی اہمیت ثانوی ہو گئی'اس کے نتیجے میں انسان سماج میں مشین کی موجودگی کی وجہ سے بیگانہ ہوتے گئے۔اس حوالے سے ڈاکٹر اشرف کمال کا کہنا ہے کہ " بیگانگی کی اصطلاح موجودہ ترقی یافتہ دور کی دین ہے۔جس میں مشینوں کی حکومت نے اور سائنس کی ترقی کی وجہ سے ملنے والی آسائشوں نے انسانوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔قریب ہوتے ہوئے بھی دور اور ہجوم میں ہوتے ہوئے تنہا "(٦٧)

بیگانگیت نہ صرف وجودیت کی دین ہے بلکہ بیگانگیت ایک ذہنی کرب ہے جو ہر انسان پر کسی بھی حوالے سے اپنا اثر دکھا سکتی ہے۔لہٰذا بیگانگیت میں سائنس 'مذہب اور منطق کی کلیت سے انحراف کر کے انسان کے اپنے وجود میں سفر کرنے سے عبارت ہے۔یہ فلسفہ کی اصطلاح ہے البتہ اس فلسفہ کو ادب میں زیادہ پزیرائی ملی۔جو آج کے صنعتی انقلاب کے پیچ میں پسنے والے کرب زدہ انسان کو اپنا موضوع بناتی ہے۔افتخار بیگ کا کہنا ہے:

"بیگانگی کی اصطلاح وجودی فلاسفہ سے بیشتر ہیگل'مارکس اور فیورباخ نے بھی استعمال کی تھی بیگانگی وجودی فلاسفہ کے نزدیک خالصتاً ایک داخلی کیفیت ہے'ایک ایسی کیفیت جس میں فرد شدید داخلی کرب کا شکار ہوتا ہے یہ کیفیت ہستی موجود کی اتھاہ گہرائیوں سے پھوٹتی ہے"(۶۸)

یورپ میں جب عقلیت کا رجحان بڑھا'سائنس پر اعتماد کیا گیا'پوپ سے تعلقات کم ہوتے گئے'صنعتی ترقی نے "اشیاء" میں الجھائے رکھا'ان کی وجہ سے انسان کی عدم شناخت کی چھتری میں آ گیا۔ان رجحانات کے رد عمل اورانسان کی شناخت اور پہچان کو واضح کرنے کے لیے وجودی فلسفہ میدان عمل میں آیا'اس نے مذہبی 'سماجی اقدار کو چیلنج کیا'خدا کو طفل تسلی کہا اس فلسفہ میں فرد واحد کا وجود بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔شاہین مفتی کا کہنا ہے:

"صنعتی معاشرے کی عدم شخصیتی کو جنم دینے والی قوتوں کے خلاف ایک فکری بغاوت ضروری سمجھی گئی'وجودیوں نے اندازہ کیا کہ شخص کو ان عناصر سے محفوظ رکھنا ضروری ہے جو اس کی آزادی سلب کر رہے ہیں'مروجہ نظام کی انفرادیت کے لیے سم قاتل ہے یہ فرد کو ایک کل پرزے کے طور پر استعمال کر رہا ہے جس کی معاشرے میں تنہائی اور بیگانگی کا عمل دخل بڑھ رہا ہے---یہ فلسفہ فردواحد'اس کی اہمیت یا اس کے مسائل کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتا'وجودیت کے پیروکاروں نے فردواحد اوراس کے گوناگوں مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا"(۶۹)

وجودیت اور بیگانگیت کی وجوہات میں سے دو اہم وجوہات نو آبادیات کا قیام اور (مقامی اور عالمی) جنگیں ہیں جن کی وجہ سے عوام میں اجنبیت پھیلتی گئی۔نو آبادیات اور جنگوں میں قتل عام کی وجہ سے انسان کی قیمت ختم ہو گئی۔تو جنگ زدہ اور تیسری دنیا کے مقہور و مظلوم لوگوں نے اپنا اثبات چاہا اور اسی اثبات کے پیچھے بیگانگیت کا ہاتھ ہے جو جدوجہد اور کوشش کی طرف فرد اور قوم کی رہنمائی کرتی ہے۔شاہین مفتی کا کہنا ہے:

"فرانس کی شکست وریخت'ایشیا'مڈل ایسٹ'افریقہ'لاطینی امریکہ'کشمیر'فلسطین کی مقامی جنگیں اورانسان کی بے حیثیتی کا نہ ختم ہونے والا ڈرامہ جاری وساری ہے۔ان انتہائی صورتوں

میں وجودیت قاری اور سامع کے دل کی آواز بن گئی ہے کیونکہ وجودیت ایک لحاظ سے برائی کے خلاف فرد کا وہ مزاحمتی رویہ بھی ہے جو فرد کا ذاتی اثبات چاہتا ہے۔پس وجودیت کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ انسانی زندگی کی مجبوری و مقہوری سے کما حقہ آگاہ ہوتے ہوئے بھی فرد کی بے معنی زندگی میں ذاتی آزادی'ذاتی اعتماد اور ذاتی امنگ کا وہ دیا روشن کرتی ہے جو کائناتی ظلمت میں بہت معمولی سی تبدیلی کا ضامن سہی لیکن روشنی کا استعارہ بن کر اپنا اثبات چاہتا ہے"[۷۰]

وجودی فلسفہ کے نزدیک انسان اہم ہے'ان کا مرکزی نقطہ انسان کا وجود ہے'اور پھر وجود کی کیا کیفیت ہے؟وجود کس سمت آمادہ سفر ہے؟اور یہ وجود کس کرب میں ہے اور کیوں ہے؟ان باتوں کی تلاش وجودیت کے فلسفہ میں جاری و ساری رہتی ہے۔آج کے سماج میں انسان اپنے کو اجنبی سمجھتا ہے'ایک بے خانماں زندگی انسان گزار رہا ہے'اور انسان کی زندگی اسی سے مقابلہ کرتے کرتے ختم ہو جاتی ہے'غفور شاہ قاسم کا کہنا ہے کہ "وجودیت نے جہاں زندگی کے لغو اور بے معنی ہونے کا تصور دیا وہاں ارادے اور عمل کی آزادی پر بھی زور دیا"[۷۱] پس وجودی نقطہ نظر ایک لایعنیت سے دوسری لایعنیت تک سفر کا نام ہے۔جس میں دوران سفر جدوجہد پر زور دیا جاتا ہے۔افتخار بیگ کا کہنا ہے:

"ہمہ جدوجہد"وجود"کے اثبات کے لیے ضروری بھی ہے۔وہ ہر سے بے چین و بے قرار ہوا کرتا ہے۔کہ کسی بھی صورت اپنے آپ کو تسلیم کروائے۔سکوت و سکون اس سے کوسوں دور ہوتے ہیں جبکہ عملاً سماجی صورتحال میں وہ اپنے آپ missfit محسوس کرتا ہے۔اور یوں وہ اپنے آپ کو Homeless محسوس کرتا ہے۔اسے لگتا ہے'سو جدوجہد کا جذبہ اسی تنہائی اور بیگانگی سے کسی چشمے کی مانند پھوٹ پڑتا ہے"[۷۱]

اب تک الٰہی نظریہ اور وجودی نظریہ کی روشنی میں بیگانگیت کی توضیح و تشریح دی۔ایک اور بیگانگیت کا نظریہ کارل مارکس نے دیا ہے۔اس کا محور معیشت ہے'یعنی مزدور کی اپنی محنت سے بیگانگی'اس بارے میں کارل مارکس کا کہنا ہے کہ:

"The process of production is one of objectification, whereby men make material objects which embody human creativity yet stand as entities separate from their Creator. Alienation occurs when once objectified, man no longer recognis himself in his

product which has become alien to him, is no longer his own, and stand opposed to him as an autonomous power. Objectification, however, only becomes alienation in the specific historical circumstances of capitalism. In capitalist society one group of people, capitalist, appropriates the productscreated by other. This is the origin ofalienation(۷۲)

سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور جہاں اجنبیت کا شکار ہو جاتا ہے مزدور جب اپنی محنت سے کارخانے میں جوتی بنالیتا ہے لیکن جوتی کی اتنی قیمت ہوتی ہے کہ عام مزدوراسے خریدنے سے قاصر ہے وہ جوتا جسے مزدور نے بنانے میں اپنی توانائیاں صرف کی اب مارکیٹ میں اس جوتی اور مزدور کے درمیان اجنیت آڑے آجاتی ہے وہ مزدور اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے جوتے کو استعمال میں نہیں لاسکتا پس جہاں ایک مزدور طبقہ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے بیگانگی کا احساس کرتا ہے وہاں پورا معاشرہ بھی احساس بیگانگیت کے لپیٹ میں آجاتا ہے۔

ii۔ بیگانگیت اور ادب:

بیگانگیت ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے۔ اب یہ صرف فلسفہ کی اصطلاح نہیں رہی بلکہ یہ ادب کا حصہ بھی بن گیا۔ بقول شاہین مفتی "وجودیوں نے اپنے افکار کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے فلسفیانہ مباحث سے زیادہ شاعری، فکشن، تنقید، ریڈیو، ٹیلی ویژن اورانٹرویوز جیسے وسیلوں سے کام لیا"(۷۳) کیونکہ بیگانگی انسان کا مسئلہ ہے'ادب بھی اس مسئلہ سے بے خبر نہیں رہ سکتا یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر ادبی فن پارے میں وجودیت اور بیگانگیت کے پرتو ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ آفتاب اشرف کا کہنا ہے کہ:

> "آج کل تو ہر شخص دوسرے سے بیگانہ ہے" یہ جملہ ہمیں روزمرہ کی بنیادوں پر سننے کو ملتا ہے۔ جدید عہد کی شاعری اورادب میں بھی ہمیں اس بیگانگی کا تذکرہ جابجا نظر آتا ہے۔ اس مظہر کی عملی جھلک ہم زندگی کے ہر شعبے میں اور سماج کے ہر طبقے میں دیکھ سکتے ہیں۔ انسان کی انسان سے'فرد کی سماج سے'سماج کی فرد سے اورسب سے بڑھ کر انسان کی اپنی ذات سے بیگانگی"(۷۳)

وجودیت اور بیگانگیت اہل مغرب کا مسئلہ تھا' کیونکہ مادی ترقی تو بہت ہوئی لیکن روحانی طور پر تنزلی اور زندگی کا کوئی ہدف اور مقصد رکھنے کی وجہ سے جب مشین سے مانوس اور سماج سے رابطہ کٹا تو بیگانگیت کے لیے راستے ہموار ہوئے۔ رفتہ رفتہ جب استعماریت کی توسیع عمل میں آئی' دو بڑی جنگیں ہوئی' قتل وغارت کا بازار گرم ہوا' بر صغیر کی بات کی جائے تو تقسیم کے نتیجے میں مہاجرت کا احساس تو دوسری طرف سیاسی عدم استحکام اور داغ داغ اجالا نتیجے میں نو آبادیات ملکوں میں اور خاص کر بر صغیر میں بھی بیگانگیت کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔ افتخار بیگ کا کہنا ہے کہ "یہ سب واقعات انسان کی بے توقیری اور تحقیر کا باعث تھے۔ ایسے میں اگر شاعری میں تنہائی اور بیگانگی کا احساس جھلکا تو اچنبھا کا ہے کا"(۷۴)

اردو شاعری میں داخلیت کی کارفرمائی زیادہ رہی ہے' خاص کر غزل میں داخلی کیفیات کی عکاسی زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ البتہ یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ کلاسیکی اردو غزل میں وجودی فکر کا بیان ہوتا رہا لیکن یہ بات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اردو غزل کو وجودیت سے ایک خاص تعلق رہا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا حوالہ دیتے ہوئے افتخار بیگ کا کہنا ہے کہ "اردو شاعری میں داخلیت پسندی کا رجحان شروع سے ہی موجود رہا ہے۔ اایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو غزل اور وجودیت کا رشتہ ازل سے قائم ہے"(۷۵) اردو شاعری میں متصوفانہ وجودیت یا بیگانگیت کی بات کی جائے تو اس کا چلن ابتدائے غزل سے رہا ہے۔ ہر دور کے شعرا کے ہاں متصوفانہ وجودیت یا بیگانگیت ایک رجحان کی صورت میں ملاحظہ کر سکتے ہیں جو کہ تشنہ تحقیق ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غالب نے اس شعر میں متصوفانہ بیگانگیت کو بڑے جاندار انداز میں بیان کیا ہے۔ "نقش" سے مراد انسان جبکہ "شوخی تحریر" سے مراد تخلیق ہے۔ "کاغذی ہے پیرہن" احتجاج سے عبارت ہے' ملاکر مفہوم بیان کیا جائے تو اس طرح سے ہوگا کہ انسان "جزو" ہے اور اللہ "کل" جب "کل" نے اسے بدن کے سانچے میں ڈال کر دنیا میں بھیجا گیا تو جزو دنیا میں آکر "کل" سے جدا ہوا جب کل سے جدا ہوا تو ایک بیگانگی چھاگئی گو کہ اس وسیع کائنات میں انسان نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا۔ اسی بیگانگی کو سامنے رکھ کر جزو یعنی انسان فریادی ہے کہ آخر "مجھے اپنی بارگاہ سے کیوں نکالا" لہذا یہ جزو اپنی اصل (جو کہ "کل ہے) میں ضم ہونے کی جستجو میں صدائے احتجاج بلند کر رہا ہے۔

اردو شاعری بشمول غزل آگے بڑھتی ہے تو پھر اپنے عہد کو دیکھتے ہوئے خاص کر بیسویں صدی میں وجودیت ایک رویے کی صورت میں اپنی جھلک دکھانے لگی۔"اردو شاعری نے فرد کی انفرادیت اور خود یقینیت کو نہ صرف اپنے اندر سمویا بلکہ اس کا انشراح کیا۔ انفرادیت کے یہی رجحانات بیسویں صدی کی اردو شاعری میں بھی جھلکے "(۷۶)

اردو شاعری میں خاص کر بیسویں صدی کی شاعری میں وجودی باتیں ہوتی رہیں 'اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر کوئی وجودی جذبے کو سمجھ سکتا ہے 'اگر نہیں سمجھ سکتا تو شاعر کی لایعنی بات ہوئی؟ جواب یہی دیا جا سکتا ہے کہ وجودیت کے فلسفہ کا بنیادی محور انسان کا وجود ہے اگر اس کو ذہن میں رکھ کر بیسویں صدی کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو شعر کی تفہیم میں کافی حد تک کامیابی ملے گی۔ بیسوی صدی کے اہم شعرا میں ایک نام علامہ اقبال کا بھی آتا ہے۔ ان کی شاعری میں بھی وجودی کیفیتیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ در آئی ہیں۔اقبال کے ہاں تصوف کی بیگانگی بھی ہے تو دوسری جانب وجودیت کی بیگانگی بھی توانا صورت میں ملتی ہے۔

یہ گنبد مینائی یہ عالم تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

جمال الدین افغانی کی عوام میں بیداری لانے کی مہم 'سر سید احمد خان کی مفاہمانہ پالیسی 'مسلم لیگی رہنماؤں کی منظم جدوجہد 'اقبال کے خواب اور قائداعظم محمد علی جناح کی قائدانہ صلاحیتوں نے انگریزوں اور ہندؤں کے ظلم وجور کے بادلوں کی اوٹ سے پاکستان کو بصورت آفتاب دنیا کے نقشے پر چمکایا۔ تو ہر طرف خوشیوں کے چراغاں ہوئے تو بادل نخواستہ مہاجرت کے نتیجے میں عصمتیں لوٹی گئیں 'لاکھوں لقمہ اجل ہو گئے 'لاکھوں بے گھر ہوئے 'تاریخ بدل گئی 'جغرافیہ نئے سرے سے مرتب ہوا 'عزیز و اقارب کے درمیان حد فاصل آڑے آ گئی 'رشتہ دار ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے تو لا محالہ بیگانگیت کی تاریکی سیاہ اور کالی رات کی طرح 'جنگل میں آگ کی مانند ہر طرف پھیل گئی۔ انہی واردات کو ادب نے اپنا موضوع سخن بنایا۔

> "۱۹۴۷ء کی تقسیم جہاں آزادی کی خوشخبری لائی 'وہیں شخصی سطح پر ایسی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی کہ مہاجرت اور اس کا ناسٹلجیا ہمارے ادب کا مستقل موضوع بن کر ابھرا۔۔۔ بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کے درمیانی عرصے میں فرانس اور جرمنی جس سیاسی 'سماجی اور معاشی عذاب سے گزرے تھے '۱۹۴۷ء کا پاکستان اور ہندوستان اسی عذاب کے دہانے پر کھڑے تھے (۷۷)

پاکستان کو"لے کے رہیں گے پاکستان "اور"بن کے رہے گا پاکستان "جیسے زوردار نعروں سے بالآخر حاصل کر لیا'مگر پاکستان سے وابستہ امنگیں پوری نہیں ہو سکیں'پاکستان ایک سوچ اور نظریہ اور کے مطابق بنایا تھا'وہ اب تک کو خواب رہا'حقیقت کا روپ نہیں دھار سکا۔وجہ ہے کہ ہماری اپنی زمینی میراث ورثے میں نہیں ملی'عقائد عربوں سے لیا تو تہذیب اہل فارس سے'اساطیر یونان و بدھ مت سے'جائیں تو کہاں جائیں'نتیجے میں کچھ سجھائی نہیں دیا تو بیگانگیت کی چھتری میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ڈاکٹر شاہین مفتی کا کہنا ہے کہ:

"پاکستانی فلسفہ اور پاکستانی زبان وادب ابھی تک اپنے عبوری دور میں ہیں۔ہم جس قسم کے سماج کی تعمیر نو چاہتے ہیں'اس کا بنیادی ڈھانچہ تشکیل نہیں ہو سکا۔اس کی بڑی وجہ عمرانی عدم تحفظ اور برصغیر کے لسانی امراض ہیں۔یہاں بسنے والوں کے مذاہب/فلسفے/تمدن مانگے کا زیور ہے۔ہمارے مذہبی/اسلامی فلسفے کی جڑیں عربی زبان میں چھپی بیٹھی ہیں۔ہماری تہذیب پر ایرانیوں کی چھاپ ہے۔ہماری اساطیر کہانیوں اور اصطلاحوں کا خمیر عیسائیت'بدھ مت اور سنسکرتی اسطورہ سے ترتیب پاتا ہے۔۔۔یہ ہے ہماری وہ صورحال جو مغائرت اور بیگانگی کے تانے بانے سے بنی گئی ہے اور ہم بہت سارے سوالوں کی موجودگی میں اپنی اور اپنی صورتحال کی معنویت تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ہمارے سامنے ایک خالی آسمان ہے اور ایک بے یقین موسم جس میں دن رات کا تعین نہیں ہو سکتا"(۷۸)

iii۔بیگانگیت کی کی جہات:

بیگانگیت کی چند اہم جہات اور نوعتیں یہ ہیں۔

۱۔وجودی بیگانگی

۲۔مارکسی بیگانگی

۳۔متصوفانہ بیگانگی

۴۔روحانی بیگانگی

وجودی فلسفہ کے نزدیک انسان اہم ہے'ان کا مرکزی نقطہ انسان کا وجود ہے'اور پھر وجود کی کیا کیفیت ہے؟وجود کس سمت آمادہ سفر ہے؟اور یہ وجود کس کرب میں ہے اور کیوں ہے؟ان باتوں کی تلاش وجودیت کے فلسفہ میں جاری وساری رہتی ہے۔آج کے سماج میں انسان اپنے کو اجنبی سمجھتا ہے'ایک بے خانماں زندگی انسان گزار رہا

ہے'اورانسان کی زندگی اسی سے مقابلہ کرتے کرتے ختم ہو جاتی ہے'پس وجودی نقطہ نظر زندگی لایعنی سے لایعنی تک سفر کا نام ہے۔افتخار بیگ کا کہنا ہے:

"ہمہ جدوجہد"وجود"کے اثبات کے لیے ضروری بھی ہے۔وہ ہرسے بے چین وبے قرار ہوا کرتا ہے۔کہ کسی بھی صورت اپنے آپ کو تسلیم کروائے۔سکوت وسکون اس سے کوسوں دور ہوتے ہیں جبکہ عملاً سماجی صورتحال میں وہ اپنے آپ missfit محسوس کرتا ہے۔اوریوں وہ اپنے آپ کو کرتا ہے۔اسے لگتا ہے 'سوجدوجہد کا جذبہ اسی تنہائی اور بیگانگی سے کسی چشمے کی مانند پھوٹ پڑتا ہے"(۷۹)

نٹشے کے ہاں کائناتی بیگانگی کا تصور موجود ہے،اس بسیط کائنات میں زمین کی حیثیت اوراس کرہ ارض پر انسان کی حیثیت کتنی حقیر ہے لہذا فرد کو بیگانگی کا شکار محسوس کرتا ہے۔نٹشے کے ہاں انسان کی ذات اور فطرت اسی اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔اورنہ ہی فطرت لافانی مفاہیم کی حامل ہے۔لہذا فرد بیگانگی کے حصار توڑکر اپنی قوت ارادی کے بل پر فطرت کوایک نیا مفہوم دیتا ہے(۸۱)کارل مارکس ایک الگ نوعیت کی بیگانگی کا تذکرہ کرتا ہے۔جہاں ایک مزدور طبقہ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے بیگانگی کا احساس کرتا ہے وہاں پورا معاشرہ بھی احساس بیگانگیت کے لپیٹ میں آجاتا ہے۔اس بارے میں کارل مارکس کے نظریے کو(اپنے الفاظ میں)ڈاکٹر مدیحہ ہاشمی اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

"یہ(بیگانگی) کیفیت سرمایہ دارانہ (capitalist)نظام کا لازمی جز ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نظام کے تحت کسی بھی انسان کو اپنے نان نفقہ کے لیے روز اپنی محنت پیسے کے عوض بیچنی پڑتی ہے۔اس عمل سے اُس کے اندر بددِلی اور کراہت کے جذبات اُبھرتے ہیں کیونکہ اُس کے دِن کا بیشتر حصّہ ایسے کام میں صرف ہوتا ہے جو وہ دِل سے نہیں کرتا، محض معاوضے کے عوض کرتا ہے۔رفتہ رفتہ یہ بددلی کی کیفیت اُس کی پُوری زندگی کا احاطہ کرلیتی ہے اور وہ ہر چیز سے، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی نفرت محسُوس کرنے لگتا ہے۔اِسی عمل کہ مارکسؔ نے بیگانگیت (alienation)کانام دیا ہے"(۸۲)

ایک اور بیگانگیت کا تصور تصوف سے ملتا ہے۔تصوف کے مطابق یہ پوری کائنات بشمول اللہ ایک کل ہے اوراس کل کا ایک جزوانسان ہے'جب کل کا حصہ تھا توانسان سکون اوراطمینان میں تھاجب کل سے جدا ہو کر دنیا میں آیا تواسی کل سے ملنے کے لئے بے تاب رہتا ہے گویااس وسیع کائنات میں صوفی "کل"سے جدا ہونے کی وجہ سے دنیامیں اجنبیت محسوس کرتا ہے اوراسی "کل"میں ضم ہونے کے متمنی ہے۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا

میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا (احمد ندیم قاسمی)

بیگانگیت کی ایک صورت روحانی بیگانگیت ہے۔ جس میں احساس جرم یا احساس گناہ کی وجہ سے انسان کرب میں رہتا ہے' ضمیر چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ جب انسان اللہ کی رضا کے لیے توبہ کی راہ اختیار کرتا ہے تو اسے عبادت کی شیرینی نصیب ہوتی ہے تب جا کر انسان مطمئن ہو جاتا ہے اور انسان کی بیگانگیت اور کرب ختم ہو جاتا ہے۔

بیگانگیت کی ایک صورت نفسیات سے تعلق رکھتی ہے' انسان سوچتا کچھ اور ہے معاشرے میں ہوتا کچھ اور ہے وہ معاشرے کے ساتھ ذہنی مطابقت نہیں رکھ پاتا جس کی وجہ سے بیگانگیت کی فضا نمودار ہوتی ہے۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں ان تمام بیگانگیت میں سے مارکسی' وجودی اور نفسیاتی بیگانگیت کی کار فرمائی ہے انہی کے حوالے سے بحث و تحقیق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہ: فیض احمد فیض کے حالات زندگی اور ادبی خدمات:

i۔ فیض احمد فیض کے سوانحی کوائف کا اجمالی جائزہ:

فیض احمد فیض قلمی نام ہے ان کا اصل نام فیض احمد خان تھا۔ فیض ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو قلعہ کالا قادر' ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی کا نام چوہدری سلطان محمد خان تھا۔ ان کی دو بیویاں تھیں۔ فیض احمد فیض ملا کے کل چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں ان کی اولاد میں شامل ہیں۔ فیض کی والدہ کا نام سلطان فاطمہ ہے۔

تعلیم کا آغا حفظ قرآن سے کیا لیکن یہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا جس کی حسرت فیض کو ساری زندگی رہی۔ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی کے مکتب سے اردو، عربی اور فارسی کی نحو اور صرف اور کہانیوں کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں اسکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں چوتھی جماعت میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کا باقاعدہ آغاز کیا۔ میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ مرے کالج سیالکوٹ سے انٹر میڈیٹ کے امتحان میں بھی اچھے نمبر حاصل کئے۔ اسی زمانے میں "شمس العلما مولوی میر حسن (جو کہ علامہ اقبال کے بھی استاد گرامی ہیں) سے صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی"(۸۳)

اسکاچ مشن ہائی سکول سے فیض احمد فیض نے میٹرک کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ بعد ازاں دو سال بعد ایف اے کا امتحان ۱۹۲۹ء کو مرے کالج سیالکوٹ سے پاس کر لیا۔ انٹر میڈیٹ کو مکمل کرنے کے بعد فیض لاہور آئے جہاں انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی آرنز کیا۔ فیض احمد فیض نے دو مضامین (انگریزی اور عربی میں) ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

فیض احمد فیض نے ملازمت کا آغاز امر تسر ایم اے او کالج میں انگریزی میں لیکچرر کی حیثیت سے کیا۔ جہاں انہوں نے پانچ سال تدریس کے فرائض سر انجام دیئے۔ یہ پانچ سال ان کے لیے بابرکت ثابت ہوئی۔ یہیں سے ایلس کتھرین سے ملاقات ہوئی۔ اور مارکسزم سے بھی دل لگی ہوئی۔ ان دونوں سے محبت بھری مفارقت ساری زندگی جاری رہی۔ امر تسر کے قیام کے دوران ہی فیض صاحب نے مارکسزم کا تفصیلی مطالعہ کیا اور ترقی پسند رجحانات سے اپنی فکر اور شاعری کی آبیاری کی۔ یہیں ان کی ملاقات مارکسسٹ دانشوروں اور ادیبوں سے ہوئی جن کے قریبی تعلق اور خود ان کے اپنے مطالعے کی بناء پر ان کی فکر و نظر میں گہری تبدیلی آئی اور ان کی شخصیت پر اس کے بہت دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مرکزوں دہلی، لکھنو، کلکتہ اور لاہور کی ہنگامہ پرور زندگی سے دور امر تسر میں فیض صاحب، رشید جہاں اور محمود الظفر کی یہ مثلث اردو کے ترقی پسند ادب کے لیے نیک فال ثابت ہوئی (۸۴)

مارکسزم سے وابستگی کا جو بیج ان کے ذہن میں یہاں پڑا تھا اس نے آگے چل کر ایک گھنے درخت کی شکل اختیار کر لی اور فیض صاحب اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک اسی نظریے سے وابستہ رہے۔ اپنی کتاب " مہ و سال آشنائی "میں اس زمانے کے بارے میں فیض صاحب نے صاف صاف لکھا:

> "۱۹۳۵ء میں جب میں نے امر تسر کالج میں پڑھانا شروع کیا تو وہاں ایک دن میرے ایک رفیق کار صاحبزادہ محمود الظفر نے ایک پتلی سی کتاب میرے حوالے کی اور کہا، لو یہ پڑھو اور اگلے ہفتے اس پر ہم سے بحث کرو لیکن غیر قانونی کتاب ہے ذرا احتیاط سے رکھنا۔ یہ کتاب تھی کمیونسٹ مینی فسٹو جو میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی بلکہ دو تین بار پڑھی۔ انسان اور فطرت، فرد اور معاشرہ، معاشرہ اور طبقات، ذرائع پیداوار کی تقسیم، ذرائع پیداوار اور پیداواری رشتے، پیداواری رشتے اور معاشرے کا ارتقائ، انسانوں کی دنیا کے پیچ در پیچ اور تہ بہ تہ رشتے ناتے، قدریں، عقیدے، فکر و عمل وغیرہ کے بارے میں یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس پورے خزینہ اسرار کی کنجی ہاتھ میں تھما دی ہے۔ یوں سوشلزم اور مارکسزم سے دلچسپی کی ابتدا ہوئی۔ "(۸۵)

۱۹۴۰ء میں فیض احمد فیض نے لاہور کا رخ کیا' یہاں فیض احمد فیض نے دو سال ہیلی کال آف کامرس میں بطور انگریزی لیکچر ملازمت جاری رکھی' اسی دوران فیض اور ایلس سے شادی کا فیصلہ کیا' ایلس سے فیض کا نکاح سری نگر میں پڑھا گیا' نکاح خواں شیر کشمیر شیخ محمد عبد اللہ تھے۔ ایلس کا اسلامی نام کلثوم رکھا گیا۔

ہیلی کالج لاہور سے استعفیٰ دے کر فیض نے برطانوی فوج میں بطور کپتان بھرتی ہوئے۔ میجر سے ہوتے ہوئے کرنل کے عہدے تک رسائی ملی انگریز فوج نے انہیں MBE کا خطاب دیا۔
۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کے بعد پاکستان ٹائمز کی ادارت پر مامور ہوئے۔ ترقی پسندیت کے زیر اثر پاکستان میں بھی سجاد ظہیر اور جلال الدین عبد الرحیم کے ہمراہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی طرح ڈالی۔ بعد ازاں ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر کے عہدے پر براجمان ہوئے۔

لیاقت علی خان پاکستان کے پہلے وزیر اعظم ہیں' جس کی حکومت کشمیر کو حاصل کرنے میں ناکام ہوگئی' یہ بات فوج اور جناح دونوں کو ناگوار گزری'" امریکا سے واپسی پر لیاقت علی خان نے کمیونسٹ پارٹی اور پاکستان سوشلسٹ پارٹی پر پابندی لگادی۔ مشرقی پاکستان میں البتہ، ایسٹ پاکستان کمیونسٹ پارٹی فعال رہی اور دھرنے دیتی رہی"(۸۶) فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک پر پابندی لگنے کے باوجود بھی ترقی پسند فکر اور نظریہ سے دوری اختیار نہیں کی' بلکہ انہوں نے اپنی شعر و شاعری کا سہارا لے کر عوام کی ترجمانی کرتے رہے۔ یوں فیض نے طبقاتی اوراستحصالی نظام کے خلاف کھل کر مزاحمت کی' ان کی عملی اور شعری پیکر میں مزاحمت ارباب اختیار کو ناگوار گزری' فیض کو ناکردہ گناہی کے پاداش میں قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا رکھنے کا نہ رکنے والا سلسلہ روا رکھا گیا۔ پہلی بار فیض کو راولپنڈی کیس میں الجھا کر جیل پہنچایا گیا۔
۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو فیض کو راولپنڈی سازش کیس میں معاونت کے الزام میں حکومتِ وقت نے گرفتار کر لیا۔ آپ نے چار سال سرگودھا، ساہیوال، حیدرآباد اور کراچی کی جیلوں میں گزارے؛ جہاں سے آپ کو ۲ اپریل ۱۹۵۵ء کو رہا کر دیا گیا۔ زنداں نامہ کی بیشتر نظمیں اِسی عرصہ میں لکھی گئیں۔ رہا ہونے کے بعد آپ نے جلاوطنی اختیار کر لی اور لندن میں اپنے خاندان سمیت رہائش پزیر رہے "(۸۷)

جیل سے رہائی ملنے کے افروایشائی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے ماسکو گئے۔ اس دوران آپ سے الیگزنڈر سرکوف نے انٹرویو لیا' اس انٹرویو کا خلاصہ کچھ اس طرح سے ہے کہ ان کے مطابق فیض کی آنکھوں میں اداسی تھی' لب پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی' مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں پوچھنے پر فیض نے بتایا کہ پہلے تو لندن' دوستوں سے جا کر ملنے کا ارادہ پھر پاکستان لوٹ جاؤں گا' فیض سے پھ سوال کیا کہ آپ پاکستان جائیں گ تو یہ آپ کے لیے خطرے کا باعث نہیں ہے پھر تو جیل یقینی ہے ؟ تو فیض نے بڑا خوبصورت جواب دیا" اگر جیل سے بھی بدتر کوئی چیز ہوئی تو پھر یقیناً برا ہو گا۔ لیکن تم جانتے ہو جدوجہد بہر حال جدوجہد ہے (۸۸)

فیض احمد فیض جب کراچی پہنچے تو شروع میں یہ محسوس ہوا کہ خطرہ ٹل چکا ہے لیکن یہ دور بھی مارشل لاء کا تھا ایوب خان کی آمریت نے ایک بار پھر فیض احمد فیض کو جیل کی راہ دکھائی۔ جیل سے رہائی کے بعد فیض کو لاہور آرٹس کونسل کا سیکریٹری بنایا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں فیض احمد فیض کو لینن امن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فیض نے پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے بڑی اچھی تقریر کی۔ اور خاص کر امن پر بہت اچھی بات کہ جیسا کہ فیض نے کہا

"یوں تو ذہنی طور سے مجنون اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور یہ سبھی تصور کرتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت، اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری، اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیے لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے "(۸۹)

لینن امن ایوارڈ لینے کے بعد فیض لندن چلے گئے ۔۱۹۶۲ سے ۱۹۶۴ء تک فیض لندن میں قیام پذیر رہے۔ لندن واپسی کے بعد ہارون کالج میں بطور پرنسپل فرائض سرانجام دیئے۔ فیض احمد فیض کو ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں کچھ چین سے رہنا نصیب ہوا۔ وزارت تعلیمات کے ثقافتی امور کے مشیر کی حیثیت سے انہوں نے سب سے پہلے پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کی بنیاد رکھی اور اس کے پہلے چیئرمین بنے۔ بعد میں جب اس ادارے کو پارلیمنٹ کی منظوری حاصل ہوئی تو انہیں صرف اس ادارے کا ایک مشیر مقرر کیا گیا۔ لیکن مارشل لاء پھر اپنی جڑیں مضبوط کرنے لگا۔ بالآخر فیض وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے۔ اس ضمن میں اشفاق احمد اپنی کتاب فیض: فن و شخصیت میں لکھتے ہیں۔

"فیض صاحب کسی حکومت کی طرف سے جلاوطن تو نہیں کیے گئے تھے لیکن سن اٹھتر سے سن تراسی تک پاکستان سے باہر ان کی موجودگی اور پھر اس دوران ان کی شعری تخلیقات میں بے وطنی اور اور لیلائے وطن سے دوری کا احساس اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ خود کو ان دنوں ذہنی طور پر ضرور جلاوطن محسوس کرتے تھے "(۹۰)

اس جلاوطنی کے دوران پہلے بیروت گئے وہاں "لوٹس" کی ادارت کی ۔بعد ازاں لندن رہائش پذیر ہوئے۔ ۱۹۷۸ سے ۱۹۸۲ء تک فیض احمد فیض سے جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ جب واپس پاکستان لوٹے تو مارشل لاء

کے بادل پورے ملک میں چھائے ہوئے تھے ملک میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی ۔بلکہ وہی "داغ داغ اجالا" اور "انتظار کاموسم" ہی دیکھنانصیب ہوا۔"فیض احمد فیض دمے کے مرض کا شکار تھے۔شدید حملے کے سبب ۱۸نومبر کی رات میو ہسپتال لاہور میں داخل کرائے گئے مگر جانبر نہ ہو سکے اور ۲۰نومبر ۱۹۸۴ء کو منگل کے روز دوپہر ایک بج کر پندرہ منٹ پر شمع حیات گل ہوگئی۔لاہور میں آسودہ خاک ہیں"(۹۱)

i۔ تصانیف:

الف۔شعری تصانیف:

فیض احمد خان ایک ادیب'نقاد'دانشور ہونے کے ساتھ ایک اچھے شاعر انسان بھی تھے'ان کی شاعری کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ان کے شعری مجموعوں میں" نقش فریادی"۱۹۴۱ ء،"دست صبا"۱۹۵۲ء،زنداں نامہ"۱۹۶۵ء،"دستِ تہہ سنگ "۱۹۶۵ء،"سر وادی سینا"۱۹۷۱ء،"شام شہر یاراں"۱۹۷۸ء،"مرے دل مرے مسافر"۱۹۸۰ء،غبار ایام"شامل ہیں۔پہلی بار ان کے شعری مجموعے کلیات کی شکل میں پہلے"سارے سخن ہمارے"کے نام سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئے۔بعد ازاں"نسخہ ہائے وفا"کے نام سے کلیات ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آگئی۔

ب۔نثری تصانیف:

فیض احمد فیض نے جو فکری'ادبی اور تنقیدی تحریریں لکھیں اور تقاریریں کیں ان کو بعد میں کتابی شکل دی گئیں۔ان کی نثری تصانیف وتالیفات میں"میزان"(تنقیدی مضامین)۱۹۶۲ء،"صلیبیں مرے دریچے میں"(خطوط)۱۹۷۱ء،"متاع لوح و قلم"(تقاریر اور متفرق تحریریں)۱۹۷۳ء،"سفر نامہ کیوبا"۱۹۷۴ء،"ہماری قومی ثقافت"۱۹۷۶ء،"مہ وسال آشنائی"(سفر نامہ،یادیں،تاثرات)۱۹۸۰ء،"پاکستان ٹائمز کے اداریے"۱۹۸۰ء،"قرضِ دوستاں"(مقدمے،دیباچے،فلیپ)،"اقبال"(مقالات اور منظوم خراج تحسین)۱۹۸۷ء،"مقالات فیض"،"فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت"(تحریریں'تقریریں)۲۰۰۶ء شامل ہیں۔

ii۔اعزازات:

فیض احمد فیض کو اپنے کام اور شاعری کی وجہ سے کئی اعزاز ملے'برطانوی حکومت نے ایم بی ای کا اعزاز عطا کیا(۱۹۶۲ء)'سویت یونین نے لینن امن انعام سے نوازا(۱۹۶۴ء)اور پاکستانی حکومت نے انہیں نشان امتیاز عطا کیا گیا(۱۹۹۰ء)

۱۹۳۸-۳۹میں ماہنامہ "ادب لطیف"لاہور کے مدیر رہے۔۱۹۴۷ءسے ۱۹۵۸ء تک آپ پاکستان ٹائمز'روزنامہ امروز'ہفت روزہ لیل ونہار لاہور کے مدیر اعلیٰ رہے(۹۱)

و: محمود درویش حالات زندگی وادبی خدمات:

i۔ محمود درویش کے سوانحی کوائف کا اجمالی جائزہ:

محمود درویش نہ صرف عربی ادب میں ایک مقبول اور معروف شاعر ہیں بلکہ عالمی سطح پر شہرت یافتہ شاعر ہیں محمود درویش فلسطین کا قومی شاعر ہیں۔انہیں فلسطین کا سانس بھی کہا جاتا ہے محمود درویش کا اصل نام محمود سلیم درویش ہے۔ان کے والد بڑی اراضی کے مالک کاشتکار تھے۔محمود درویش ۱۹۱۲ء کو فلسطین میں گلیلی کے ایک گاؤں البروہ میں پیدا ہوئے۔جب محمود درویش چھ سال کے تھے تو اسرائیلی فوجون نے راتوں کارات ایسا حملہ کیا کہ پورا گاؤں ملبہ میں بدل گیا'محمود درویش اپنے چچا کر ہمراہ بیروت پہنچے'کہاں ریڈکراس کے راشن پر ایک سال گزراوقات کرتے رہے۔بچپنے میں ہی جلاوطن ہونا پڑا اوریوں ساری زندگی جلاوطنی اور بے خانماں کی زندگی گزارتے رہے۔منوبھائی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ "محمود درویش کی معصوم زندگی کے اس پہلے ہی صدمے نے انہیں شاعر بنا دیا"(۹۲)

بیروت میں ایک سال کی پناہ گزینی کے گزارنے کے بعد اپنے گاؤں کے ارادہ سے نکلے تو گاؤں اسرائیلی گولیوں سے ملبہ بن چکا تھا'اوروہاں جانے کی بھی پابندی تھی'نہ چاہتے ہوئے محمود درویش کو دیر الاسد میں رکنا پڑا۔محمود درویش کو شروع میں مردم شماری میں آنے کے سبب شناختی کارڈ تک میسر نہیں آسکا بعد ازاں کارڈ تو مل گیا لیکن وطن کبھی نہیں ملا۔گھمبیر حالات وواقعات نے درویش کو اوائل عمری میں بھی شاعر بنادیا تھا۔انہوں نے بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی شاعری کا آغاز مزاحمتی انداز میں کیا۔" محمود درویش کا بچپن ایک چھینی ہوئی زمین سے روشناس تھااور طفولیت کے مزے سے محروم'وہ صرف اس کی تلخیوں کو جانتے ہیں۔انہیں نہ کبھی اپنے بچپن کے محفوظ وجود کا احساس ہوااور نہ ہی انہوں نے خواب کے لطف اٹھائے'ان کا وجود خوفناک تھا'ہر لمحہ درد'رنج والم سے ڈراہوا سہاہوا"(۹۳)

جیسا کہ محمود درویش جس سکول میں پڑھتا تھا ایک تقریب کا اہتمام واانعقاد ہوا جہاں محمود درویش نے بھی شاعری کی وہ بھی چونکا دینے والی شاعری'اس بارے میں محمود درویش خود بتاتے ہیں کہ "سکول میں اسرائیلی ریاست کے قیام کی سالگرہ منائی جارہی تھی۔ہیڈماسٹر نے انہیں بھی کچھ سنانے کو کہا محمود درویش بتاتے ہیں۔میں وہاں پہلی بار مائیک کے سامنے کھڑاہوااور ایک نظم پڑھی جو عرب بچے کی یہودی بچے کے سامنے فریاد تھی"(۹۴)مضمون کچھ یوں تھا۔

تم کھلی دھوپ میں جیسے چاہو کھیل سکتے ہو
مگر میں نہیں کھیل سکتا
تمہارے پاس کھلونے ہیں
مگر میرے پاس نہیں ہیں
تمہارا ایک گھر ہے
مگر میرا نہیں ہے
تم جشن مناتے ہو
میں نہیں منا سکتا
ہم دونوں اکٹھے کیوں نہیں کھیل سکتے؟

اس شاعری کی وجہ سے محمود درویش کو اسرائیلی اہلکار نے کافی ڈرایا اور کہا کہ اب دوبارہ اس طرح کی حرکتیں کیں تو تمہارے والد کو پتھر کے کام سے روکا جائے گا۔ محمود درویش اسرائیلی دھمکیوں کے باوجود لکھتے رہے' اس بنا پر انہیں بار بار جیل جانا پڑا' جیل گویا اس کے لیے دوسرا گھر تھا۔ بعد ازاں گھر بھی اس کے لیے جیل کی حیثیت اختیار کر گیا" بچپن سے جوانی تک کوئی ایسا سال نہیں گزرا جس میں محمود درویش نے کم از کم تین مہینے اسرائیل کی جیلوں میں نہ گزارے ہوں ۱۹۶۲ سے ۱۹۶۷ء تک وہ حیفہ میں اپنے گھر میں نظر بند رہے"[(۹۵)]

گریجویشن کے بعد سیاست میں باقاعدہ قدم رکھا۔ محمود درویش کارل مارکس کے نظریات سے کافی متاثر ہوئے' ان کی شاعری اور اسرائیل کی کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں کسی نہ کسی طور شریک رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مارکسزم سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ مارکسی انقلاب بھی چاہتے تھے۔ گو کہ ۱۹۶۱ء میں اسرائیلی کمیونسٹ پارٹی (RAKH) میں شمولیت اختیار کی۔ انہوں نے مختلف عربی اخبارات میں صحافتی فرائض بھی انجام دیئے جیسے "الاتحاد" اور "الجدید" سے وابستہ رہے "شؤن فلسطینہ اور "الاھرام" میں بھی کام کیا۔ منو بھائی اس حوالے سے مزید بیان کرتے ہیں:

"۱۹ سال میں اپنا پہلا مجموعہ اسرائیلی شہر حیفہ میں شائع کروانے کے بعد وہ لبنان اور پھر سویت یونین پہنچے۔ ایک سال ماسکو یونیورسٹی میں پڑھتے رہے لیکن بے چین طبیعت وطن کی محبت

کے بوجھ تلے دبی ہوتی تھی سو مصر سکونت اختیار کر لی جہاں وہ مشہور اخبار "الاھرام" میں ملازم بھی رہے "(۹۶)

اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ماسکو یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ آپ نے آزادی فلسطین کے لیے سیاست میں بھی حصہ لیا۔ اس حوالے سے انہوں نے PLO میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ اس کے ترجمان شؤن فلسطینہ کے ایڈیٹر کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ محمود درویش ۱۹۷۱ء میں روس چلے گئے' جہاں ماسکو یونیورسٹی میں تعلیم جاری رکھی' روس سے قاہرہ جا پہنچے وہاں محمود درویش نے "الاھرام" میں کام کیا' قاہرہ سے بھی مہاجرت کر کے محمود درویش نے بیروت کو اپنا مسکن بنایا

آصف فرخی کا کہنا ہے کہ: "۱۹۸۸ء میں فلسطین کی آزادی کے اعلان نامے کو تحریر کرنے والوں میں بھی محمود درویش کا نام شامل تھا۔ ۱۹۸۷ء میں وہ پی ایل او کی مجلس عامل کا کارکن بن گیا"(۹۷) یاسر عرفات نے اسرائیلیوں سے اوسلو معاہدہ کرنے کی ٹھان لی دوسری جانب محمود درویش کو یہ معاہدہ پسند نہیں محمود درویش آیا۔ انہیں منوانے کی یاسر عرفات نے کافی کوشش کی لیکن محمود درویش اپنی دھن کے پکے تھے' چنانچہ "۱۹۹۳ء میں جب اسرائیل سے اوسلو معاہدہ ہوا تو وہ مجلس انتظامیہ سے مستعفی ہو گئے (۹۸)

محمود درویش نے کئی مرتبہ جلاوطنی کاٹی ان کی جلاوطنی کبھی خود ساختہ طور پر ہوئی تو کبھی اسرائیلی حکام کے ذریعے ہوئی' ۱۹۹۵ء میں جا کر محمود درویش اور ان کی بوڑھی ماں کو مغربی کنارے جہاں فلسطینی حکام کے زیرانتظام شہر رام اللہ اور اردن کے شہر "امان" میں غیر معینہ مدت تک کے لیے قیام کی اجازت مل گئی۔ وہ فلسطین کے قومی ترانے کے بھی خالق ہیں۔ سن اُنیس سو ترانوے میں اُنہوں نے خود سے فلسطینی عوام کے لئے ایک ایک منشور بھی مرتب کیا تھا۔ وہ اوسلو معاہدے تک فلسطینی لبریشن آرگنائزیشن کی ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن رہے۔

محمود درویش کی شاعری کے اردو سمیت بیس سے زائد زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ انہوں اپنی شاعری کے لیے کئی بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔ محمود درویش نے شاعری صرف عربی زبان میں کی تھی لیکن وہ انگریزی، فرانسیسی اور عبرانی بڑی روانی سے بولتے تھے۔ سلمٰی اعوان کا کہنا ہے کہ:

"دنیائے عرب میں گذشتہ نصف صدی کی نسل میں محمود درویش ایک عظیم شاعر کے طور پر جانا اور مانا گیا ہے۔ عربی کے چوٹی کے سات آٹھ شعرا میں سے وہ ایک ہے جس نے اپنی زندگی میں بہت سارے ایواڈز کے ساتھ افرشیائی اہل قلم کا ادبی ایوارڈ لوٹس بھی حاصل کیا۔ اُس کی

نظموں کے ترجمے دنیا کی ہر اہم زبان انگریزی، فرنچ، روسی، اطالوی، جرمن، بلغارین کم از کم بیس زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ جنہیں بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے"[(۹۹)]

محمود درویش ایک متعہد شاعر تھے'انہوں نے جلاوطنی برداشت کی'جیل گئے'وطن کے دکھ' درد سہے لیکن اسرائیلیوں کے سر تسلیم خم نہیں ہوا۔وہ فلسطین کو تلاشتے رہے'فلسطین ہی ان کی شاعری کا بنیادی موضوع رہا۔ سلمیٰ اعوان کا کہنا ہے کہ "درویش کی شاعری فلسطینیوں کے ضمیر اور دل کی آواز تھی اسے بار بار دبانے اور کچلنے کی کوشش کی گئیں'درویش گرفتار ہوتے رہے یا پھر جلاوطن لیکن وہ ایک خود مختار فلسطین کے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوئے"[(۱۰۰)]کشور ناہید کے محمود درویش کے بارے میں نظمیہ اشعار (شاعر اور فلسطین) قابل دید ہیں:

نہیں رکا لکھنے سے محمود درویش
کہ جس کی نظم
پھٹے ورق کی صورت'اس کے ہاتھ بھی
اس کے پاؤں نیچے ایسی کوئی زمین نہ تھی
جسے اپنا کہہ کے مرنا چاہے تو بھی مر سکے[(۱۰۱)]

محمود درویش کئی برس عارضہ قلب میں مبتلا رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔ یہ خوبصورت اور رُلا دینے والی شاعری کا خالق ۶۷ سال کی عمر میں (۹ اگست ۲۰۰۸ کو) ہارٹ سرجری کے نتیجے میں ہوسٹن کے ہرمن اسپتال میں فوت ہوا۔

انہوں نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں کیں مگر اولاد کی نعمت سے محروم رہا۔ انکی آخری خواہش فلسطین میں دفن ہونے کی تھی۔ فلسطینی صدر نے ان کی رسومات ایک قومی شاعر کے طور پر کیں۔

ii۔ محمود درویش کی شعری تخلیقات:

جب محمود درویش اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچے تو ان کا پہلا شعری مجموعہ عصافیر بلا اجنحہ (پروں کے بغیر پرندے) ۱۹۶۰ء میں چھپا'دوسرا مجموعہ اوراق الزیتون (زیتون کے پتے) ۱۹۶۲ء میں تیسرا مجموعہ عاشق من فلسطین ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۷ میں آخر اللیل (آخر شب) شائع ہوا۔

ان کے علاوہ ان کے شعری تخلیقات یہ ہیں: یومیات جرح فلسطین ۱۹۶۹ء، الکتابۃ علیٰ ضوء البندوقیہ ۱۹۷۰ء، العصافیر تموت فی الجلیل ۱۹۶۹ء، حبیبتی تنھض من نومھا ۱۹۷۰ء، (احبک اولا احبک) تم سے محبت کرتا ہوں

میں تم سے محبت نہیں کرتا ۱۹۷۲ء، (محاولہ رقم ۷) کوشش نمبر سات ۱۹۷۴ء، (تلک صورتھا وھذا انتحار العاشق) وہ اس کی تصویر ہے اور یہ عاشق کی خودکشی ۱۹۷۵ء، (اعراس) شادیاں ۱۹۷۷ء،

مدیح الظل العالی قصیدة تسجیلیة ۱۹۸۳ء، حصار مدائح البحر ۱۹۸۴ء، ھی اغنیة اغنیة ۱۹۸۶ء، ماساة النرجس ملھاة الفضة ۱۹۸۷ء، اریٰا ارید ۱۹۹۰ء، احد عشر کوکبا ۱۹۹۲ء، لماذا ترکت الحصان وحیداً ۱۹۹۵ء، سریر الغریبة ۱۹۹۹ء، جداریة ۲۰۰۰ء، حالة الحصار ۲۰۰۲ء، لاتعتذر عما فعلت ۲۰۰۴ء، کذھر اللوز اوابعد ۲۰۰۵ء، لااريد لهذه القصيده ان تنتهی ۲۰۰۹ء۔

iii۔ محمود درویش کی نثری تخلیقات:

محمود درویش کی نثری تخلیقات میں شيئ عن الوطن (خواطر ومقالات) ۱۹۷۱ء، یومیات الحزن العادی (خواطر ومقالات) ۱۹۷۳ء، وداعاً ایتھا الحرب وداعاً ایھا السلام (مقالات) ۱۹۷۴ء، ذاکرة اللنسیان ۱۹۸۷ء، فی وصف حالتنا (نص) ۱۹۸۷ء، فی انظار البرابرة ۱۹۸۷ء، الرسائل محمود درویش و سمیح القاسم ۱۹۸۹ء، عابرون فی کلام عابر (قصیدة ومقالات) ۱۹۹۱ء، فی حضرة الغیاب ۲۰۰۶ء، حیرة العائد (مقالات) ۲۰۰۷ء اور اثر الفراشہ (۲۰۰۸ء) قابل ذکر ہیں۔

iv۔ اعزازات:

محمود درویش نے "لوٹس ایوارڈ اور لینن ایوارڈ جیسے کئی ادبی ایوارڈ حاصل کیے۔ ان میں سے جائزة البحر المتوسط ۱۹۸۰ میں 'درع الثورة الفلسطینیة عام ۱۹۸۱ میں لوحة اوروبا للشعر ۱۹۸۱ میں جائزة ابن سینا في الاتحاد السوفیتي ۱۹۸۲ء میں حاصل کیے۔

حوالہ جات

۱۔ ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ، مصباح اللغات، مکتبہ برہان، اردو بازار، نئی دہلی، ۱۹۸۵، ص ۳۳۴

۲۔ ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ، مصباح اللغات، ص ۱۴۷

۳۔ المنجد عربی اردو، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۵ء، ص ۸۵۰

۴۔ وارث ہندی، "قاموس مترادفات" اردو سائنس بورڈ، لاہور، اگست ۱۹۸۶ء، ص ۹۸۸

۵۔ درسی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲، طبع سوم، ص ۱۲۹۰

۶۔ deedbanmagazine.net ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۸ء،

۷۔ شگفتہ حسین، ڈاکٹر، مزاحمتی ادب اور ماہنامہ ادب لطیف، مشمولہ: ادب لطیف، لاہور، شمارہ نمبر ۱۲، ۱۱، ص ۹۷

۸۔ ادب لطیف، لاہور، شمارہ نمبر ۱۲، ۱۱، ص ۸۷

۹۔ www.urduweb.com ۹ نومبر ۲۰۱۸am، 2:20pm

۱۰۔ www.urduweb.com آٹھ دسمبر ۲۰۱۸، 2:30pm

۱۱۔ Deedbanmagazine.net ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۸ء، 3:20pm

۱۲۔ Deedbanmagazine.net ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۸ء، 12:10am

۱۳۔ Deedbanmagazine.net ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۸ء، 1:20pm

۱۴۔ انیس ناگی، ریت اور دوسری نظمیں، مشمولہ: دانشور، سہ ماہی ادبی رسالہ: محمود درویش، ۱۹۹۰ء، شمارہ ۶، ص ۳۰

۱۵۔ شگفتہ حسین، ڈاکٹر، مطالعہ، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ، بار اول، جون ۲۰۰۴ء، ص ۸۳

۱۶۔ Deedbanmagazine.net ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۸ء، 5:20pm

۱۷۔ kashmiruzma,.com ۵ نومبر ۲۰۱۸ء 12:01am

۱۸۔ Deedbanmagazine.com ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۸ء، 1:55pm

۱۹۔ Danish.pk ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۸ء، 7:14pm

۲۰۔ روبینہ شہناز، ڈاکٹر، اردو تنقید میں پاکستانی تصور قومیت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۷

۲۱۔ www.urduweb.com ۳ دسمبر ۲۰۱۸، 2:55pm

۲۲۔ Deedbanmagazine.com ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۸ء،

۲۲۔ www.dunyapakistan.com ۳ دسمبر ۲۰۱۸، 3:05pm

۲۴۔ www.deedbanmagazine.com ۱۸اکتوبر۲۰۱۸ء، 12:04am

۲۵۔ www.deedbanmagazine.com جنوری۲۰۱۹، 6:30pm

۲۶۔ https://mcjmumbai.academia.edu ۳جون۲۰۱۸ء، 8:25pm

۲۷۔ www.deedbanmagazine,com ۱۸اکتوبر۲۰۱۸ء، 5:5m0p

۲۸۔ عبدالرؤف ملک، فیض شناسی (فیض کی ہمہ جہت شخصیت کے اوجھل پہلو)، پاکستان سٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، اشاعت اول، اپریل ۲۰۱۱ء، ۶۳

۲۹ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورپ اکادمی، طبع اول، ۲۰۱۰ء، ص ۷۰

۳۰۔ www.urdu.link.com ۱۸اکتوبر۲۰۱۸ء، 9:30pm

۳۱۔ روبینہ شہناز، ڈاکٹر، اردو تنقید میں پاکستانی تصور قومیت، ۲۱۷

۳۲۔ www.deedbanmagazine,com ۱۸ اکتوبر۲۰۱۸ء، 6:40pm

۳۳۔ عبدوالغفور بلوچ، ڈاکٹر، مسئلہ فلسطین پر فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری، مشمولہ: معیار اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد، شعبہ اردو، شمارہ ۷،، ۲۰۱۲ء، ص ۵۷

۳۴۔ شگفتہ حسین، ڈاکٹر، مطالعہ، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ، ص ۷۹، ۸۰

۳۴۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، ادب اور نفی ادب، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱

۳۶۔ ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ مصباح اللغات، ص ۸۹۸

۳۷۔ ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ مصباح اللغات، ص ۵۹۵

۳۸۔ Awadhnama.com ۷مارچ۲۰۱۹ء، 7:45pm

۳۹۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، فیض کی تخلیقی شخصیت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۸۳

۴۰۔ عذرا پروین، ڈاکٹر، پاکستانی اردو افسانے میں جلاوطنی کے تجربے کا اظہار، مشمولہ: الماس جرنل ۱۶: ص ۱۹۳

۴۱۔ تحقیقی زاویے، جنوری 'الخیر یونیورسٹی بھمبر، شعبہ اردو، جون ۲۰۱۴، ص ۱۷۹

۴۲۔ محمد سفیر اعوان، ڈاکٹر، فیض، انقلاب اور نوآبادیاتی نظریہ، مشمولہ معیار، جنوری، جون، ۲۰۱۳ء، اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد، شعبہ اردو، ص ۵۰۷

۴۳۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، فیض کی تخلیقی شخصیت، ص ۲۸۵

۴۴۔ تحقیقی زاویے، جنوری 'جون ۲۰۱۴، ص ۱۷۹

۴۵۔ محولہ بالا

۴۷۔ روبینہ الماس، اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹

۴۸۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، فیض کی تخلیقی شخصیت، ص ۲۸۵

۴۹۔ تحقیقی زاویے، جنوری'جون ۲۰۱۴، ص ۸۰

۵۰۔ www.humsub.com.pk ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۸ 2:23pm

۵۱۔ www.humsub.com ۱۸ دسمبر ۲۰۱۸ء، 3:20pm

۵۲۔ www.iiu.edu.pk ۱۸ اگست ۲۰۱۸ء، 3:55pm

۵۳۔ تحقیقی زاویے، جنوری'جون ۲۰۱۴، ص ۱۸۰

۵۴۔ طاہر تونسوی، فیض کی تخلیقی شخصیت، ص ۲۸۴

۵۵۔ فیض احمد فیض، دست صبا، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۴۹

۵۶۔ عذرا پروین، ڈاکٹر، پاکستانی اردو افسانے میں جلاوطنی کے تجربے کا اظہار، شمارہ ۱۶، ص ۱۹۳

۵۷۔ محولہ بالا، ص ۱۹۴، ۱۹۵،

۵۸۔ محمد سفیر، ڈاکٹر، فیض، انقلاب اور نو آبادیاتی نظریہ، مشمولہ معیار، ص ۵۰۸

۵۹۔ www.aikrozan.com ۲۱ دسمبر ۲۰۱۸ء، 2;40PM

۶۰۔ ساجد اللہ تفہیمی، ڈاکٹر، فرہنگ علوم ادبی اصطلاحات، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۵۸

۶۱۔ درسی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۱۲

۶۲۔ قاضی جاوید، وجودیت، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۷، ص ۱۵

۶۳۔ افتخار بیگ، اردو شاعری پر وجودیت کے اثرات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد، شعبہ اردو، ۱۹۹۹ء، ص ۴۳

۶۴۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب (شناخت کی نصف صدی)، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۰ء، ص ۸۵

۶۵۔ Mitchell Duncan G. A new Dictionary of Sociology - Rautledge & Kegan London page :5

۶۶۔ libbazmeurdu.net ۱۶ جولائی، 12:09pm

۶۷۔ اشرف کمال، محمد، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴۸

۶۸۔ افتخار بیگ، مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت، ۱۹۹۶، ص ۱۴۴

۶۹۔ شاہین مفتی، جدید اردو نظم میں وجودیت، مقالہ پی ایچ ڈی اردو۔ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۱۹۹۸، ص ۵

۷۰۔ محولہ بالا ص ۴۵

۷۱۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب (۱۹۴۷ تا حال)، بک ٹاک، لاہور،، ص ۲۶

۷۱۔ افتخار بیگ، مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت، ص ۱۴۴

The Penguin Dictionary of Sociology, Peng: m Group, England - ۱۹۹۴ pag:۱۳

۷۳۔ شاہین مفتی، جدید اردو نظم میں وجودیت، ص ۵

۷۴۔https//chingaree.com ۳ جنوری ۲۰۱۹ء، 5:30pm

۷۵۔ افتخار بیگ، اردو شاعری پر وجودیت کے اثرات، ص ۲۲۹

۷۶۔ محولہ بالا، ص ۲۳۰

۷۷۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱، ص ۴۵

۷۸۔ محولہ بالا، ص ۵۱

۷۹۔ افتخار بیگ، مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت، ص ۱۴۴

۸۱۔ محولہ بالا، ص ۵۰

۸۲www.faizghar.com ۱۲ اگست ۲۰۱۸ 9:23pm

۸۳۔ ایوب، مرزا، ڈاکٹر، فیض نامہ، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، بھارت، ۲۰۰۲ء، ص ۱۶

۸۴۔ اشفاق حسین، فیض احمد فیض فن اور شخصیت، ص ۳۷

۸۵۔ فیض احمد فیض، مہ و سال آشنائی، مکتبہ دانیال ۲۰۰۸ء، ص ۱۱

۸۶۔ http://www.wikiwand.com ۸ دسمبر ۲۰۱۸، 10:20pm

۸۷ http://www.wikiwand.com ۱۲ اگست ۲۰۱۸، 2:54pm

۸۸۔ الیگزنڈر سرکوف، ایک حوصلہ مند دل کی آواز مشمولہ: نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کارواں، لاہور ۱۹۸۴ء، ص ۳۹۱

۸۹۔ فیض احمد فیض، متاع لوح و قلم مکتبہ دانیال، کراچی ۱۹۷۳ء، ص ۳۹

۹۰۔ اشفاق حسین، فیض: فن اور شخصیت، ص ۱۵۱

۹۱۔ فیض بنام افتخار عارف، ڈاکٹر راشد حمید، (تحقیق و ترتیب)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶۶ تا ۱۷۲

۹۱۔ شیما مجید، فیضان فیض، مکتبہ عالیہ' لاہور، باراول ۲۰۰۶ء، ص ۱۷

۹۳۔ منو بھائی، مترجم: فلسطین فلسطین (محمود درویش کی انقلابی نظمیں)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۹

۹۴۔ عبد الحق حقانی القاسمی، فلسطین کا ممتاز مزاحمتی شاعر: محمود درویش مشمولہ: فکر و نظر، دہلی، شمارہ، جلد ۳۱، ۱۹۹۴ ص ۶۴

۹۵۔ www.dunya.com ۲ دسمبر ۲۰۱۸ء، 10:20pm

۹۶۔ منو بھائی، مترجم: فلسطین فلسطین (محمود درویش کی انقلابی نظمیں)، ص ۱۱

۹۷۔ www.dw.com ۱۷ جولائی، ۲۰۱۹ء، 5:30pm

۹۸۔ آصف فرخی، آخری آسمان کے بعد پرندے کہاں پرواز کریں؟ مشمولہ: دنیازاد، کتاب ۲۳، شہرزاد، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۸، ص ۲۷۲

۹۹۔ pu.edu.pk ۴ جنوری ۲۰۱۹ء، 10:30pm

۱۰۰۔ سلمٰی اعوان، عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں، جامعہ کراچی، دارالتحقیق برائے علم و دانش، ص ۳۸۲

۱۰۱۔ ارض فلسطین کا جیالا شاعر، فضل توصیف، ذہن جدید، سہ ماہی مشمولہ: دہلی، جلد ۱۸، اگست ۲۰۰۸، ص ۲۲۱

۱۰۲۔ دنیاداز، کتاب ۷، شہرزاد، کراچی، ستمبر ۲۰۰۷ء، ص ۳۷

باب دوم

فیض احمد فیض اور محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کا تقابل:

الف۔ فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری کا فکری پس منظر:

اگر اس بات سے اتفاق کر لیں کہ ہر نیا ادب مزاحمت ہے تو اور بات لیکن اگر اس بات سے اگر اختلاف ہو تو یہ بات بہ آسانی کہی جاسکتی ہے کہ عالمی ادب عالیہ کی طرح اردو شاعری کی ابتدا سے اب تک مزاحمت کئی صورتوں میں اپنے وجود کا احساس دلاتی رہی ہے یعنی ہر دور کے اردو شاعر نے اپنے عہد اپنی ذات اور سماج کے تقاضوں کے عین مطابق مزاحمتی رویہ اپنائے رکھا ہے۔ کہیں صوفی شعرانے کل سے جدا ہونے کا مرثیہ کہا تو کہیں پر جعفر زٹلی جیسے شعرا دربار کے خلاف بولتے رہے تو کہیں مرثیوں میں اردو شعرانے مزاحمتی لب ولہجہ کے ساتھ رثائی ادب اہل اردو کے حوالے کیے ہیں۔ آگے جا کر اقبال کی شاعری میں کسی حد تک مزاحمانہ انداز تفکر ملتا ہے لیکن فیض وہ شاعر ہے جس نے اپنی شاعری میں مزاحمت کو اس انداز میں سمویا کہ جس کی شاعری سے مزاحمتی شاعری کو عالمی سطح پر شہہ ملی اور بعد ازاں پاکستان میں مارشل لاؤں کے دور میں یہ ایک رجحان کی صورت میں ابھرا جس کا سہرا فیض سے سر جاتا ہے۔ آغا ظفر حسین کا کہنا ہے کہ "یوں تو اردو شاعری میں مزاحمت کی ایک کسی قدر توانا روایت ابتدا سے موجود تھی مگر جس فنکار نے اسے مزاحمتی ادب کے عالمی منظر نامے پر متعارف کیا وہ فیض احمد فیض ہے"(۱)

فیض احمد فیض کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے انہوں نے اپنی شاعری کو بھی مجاہدہ کا نام دیا۔ اور اس کے نوک پلک سنوارنے میں پوری زندگی صرف کی۔ قیام پاکستان کے بعد فیض پاکستان سے وابستہ و پیوستہ رہا لیکن فیض نے اپنی آنکھوں سے جمہوریت کا جنازہ نکلتے دیکھا اور چند استحصالی قوتوں کے جھولی میں ملکی خزانے کو جاتے دیکھا تو فیض سے رہا نہ گیا فیض نے عملی میدان میں مساویانہ طرز حکومت کے قیام کا جب بیڑا اٹھایا تو راولپنڈی کیس میں الجھا کر فیض کا راستہ روک دیا گیا۔ اس ضمن میں فتح محمد ملک کا کہنا ہے:

> "فیض نے جب سے قیام پاکستان کو اپنے ایمان کا جزو بنا کر برطانوی ہند کی فوج کو خیر باد کہا اور "پاکستان ٹائمز" کی ادارت اختیار کی تب سے سن اکاون میں راولپنڈی سازش کیس میں اسیری تک وہ پاکستان کے تصور، پاکستان کی تحریک اور پاکستان کے قیام کے بعد ہماری قومی تعمیر نو کے خواب وخیال کو اپنے قارئین کے دل ودماغ میں جاگزیں کرنے میں ہمہ تن

منہمک رہے تھے۔۔پاکستان ٹائمز کے اداریے میں دو موضوعات کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اول:تصور پاکستان کی روشنی میں پاکستانی سیاست اور معاشرت کی نئی تشکیل و تعمیر دوم:قومی تعمیر نو کے اس مشن کی تکمیل میں حائل قوتوں سے پنجہ آزمائی'ہر دو محاذوں پر انہوں نے دولتانہ حکومتوں کی زبردست مزاحمت کی فیض تحریک پاکستان کے خواب وخیال کو زندگی کے میں ڈھالنے کی جدوجہد میں اسی جذب وجنوں کے ساتھ سرگرم عمل تھے کہ مارچ پچپن میں اچانک راولپنڈی سازش کی انہونی گھڑی آپہنچی۔خود فیض نے اس سازش کو سازش اغیار سے تعبیر کیا ہے"(۲)

قصہ سازش اغیار کہوں یا نہ کہوں

شکوہ یار طرحدار کروں یا نہ کروں

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے (۳)

فیض احمد فیض کے مطالعے میں کلاسیکی شاعری بھی رہی اور ساتھ ہی معاصر ادبی فن پارے بھی فیض کی نظروں میں رہے۔یہی وجہ ہے فیض کی شاعری میں غالب'اقبال'حسرت موہانی'اور جوش جیسے شعراکے اثرات ملاحظہ کر سکتے ہیں لیکن فیض صرف متاثر نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے ان شعرا کے الفاظ وتراکیب اوراستعارات کو اپنے عہد میں ضم کرتے ہوئے نئے مفاہیم کے کئی دروازے وا کئے ہیں۔ڈاکٹر مصدق ملک کا کہنا ہے:

"ایسی نظریاتی سوچ کے علمبردار اور مثبت جدیدیت کے حامی بلند پایہ مفکر بھی ہیں۔فیض نے انتہائی ہنگامہ خیز اور متلاطم عہد میں شاعری کا آغاز کیا تھا۔علامہ اقبال کا عہد تھا'صداقتیں مستند ہو چکی تھیں'حسرت موہانی کی استادانہ شاعری'اُن کے تغزل کا رچاؤ اوراس میں تغزل کا رچاؤ اوراوراس میں دھیمے پن کی کیفیت'مجاز کی ابھرتی ہوئی کھنک دار آواز اور نغمگی'شاعری میں اصطلاحوں کا ارتقاپذیر نظام'جوش کی گھن گرج۔یعنی ان چمکتے ہوئے آفتابوں اور دمکتے ہوئے ستاروں کی درخشانی سے فیض کی آنکھیں چکاچوند ہونے کے بجائے پُر معنی ذہانت اور فکر وشعور کی کرنوں سے اپنی زبان کو نکھارااور شاعری کو مزاحمتی و نظریاتی رنگ عطا کیا۔جس سے ایسا اندازبیان تشکیل پایا کہ تمام گلشن میں وہی طرز فغاں ٹھہرا"(۴)

فیض احمد فیض صرف شاعری تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ ایک دانشور، نقاداور بہترین مدیر بھی تھے۔ فیض احمد فیض کی شاعری کا بیشتر حصہ مزاحمت،احتجاج،سیاست اور مجبور، مقہور اور مظلوم طبقے کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔ انہوں انسانیت، انسان دوستی اور امن آشتی کی بات ہے۔

فیض ان تمام بہیمانہ طلسمات سے انسانیت کو نجات دلانا چاہتے ہیں جو انسانیت کے لیے ناسور بن چکے ہیں۔ فیض بنیادی طور پر انسانیت کے شاعر ہیں یہی وجہ ہے ان کی شاعری انسانیت اور انسانیت کی آزادی کے گرد گھومتی ہے۔ ان کا درد غم صرف اپنے تک محدود نہیں بلکہ عالمگیر وسعت کا حامل ہے۔ اس کی شاعری میں آزادی' مساوات، غربت 'سماجی پستی 'استحصال جیسے قومی اور عالمی مسائل سے بحث کرتی ہے۔ فیض پر امید ہے کہ ایک نہ ایک دن سچ کی فتح ہوگی' انسان دشمن قوتیں نابود ہو جائیں گی' یوں فیض نے معاشرے کے استحصال' عدم مساوات اور ظلم وجبر کو موضوع سخن بنائے رکھا' ان کی مزاحمتی شاعری میں رجائی پہلو غالب ہے۔ اس ضمن میں افتخار عارف کا کہنا ہے کہ " ان کی شاعری میں مزاحمتی رویہ مثبت اندازِ فکر کا حامل ہے جو ہمیشہ نسلِ انسانی کو حرکت اور عمل پر آمادہ رکھے گا کیونکہ دکھی انسانیت کے لئے رجائیت سے بھرپور شاعری مرہم کا کام کرتی ہے "(۵)

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

فیض ہمہ جہت پر شخصیت رکھتا ہے' وہ بیک وقت ادیب' نقاد' دانشور' استاد اور مدیر بھی تھے۔ فیض کی شخصیت کے ان تمام پہلو میں انسان دوستی جابجا نظر آتی ہے۔ فیض احمد فیض کو صرف مزاحمتی شاعر کہنا فیض کی شاعری کو محدود کرنے کے مترادف ہے البتہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فیض کی شاعری میں سیاسی بیانات بہت ہیں۔ وہ فکری طور پر کارل مارکس سے متاثر تھے' ان کی کئی نظمیں مارکسزم کی اردو زبان میں تشریح و تعبیر ہے ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے کہ " مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ "چند روز اور مری جان" "کتے "بول" اور موضوع سخن اس عہد کے مروج

ترقی پسند شعری نظریے کی زندہ تفسیریں ہیں"(۶)فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ان کی یہ وابستگی ساری زندگی قائم رہی۔ان کے مطابق "ترقی پسند ادب سے مراہر وہ تحریریں ہیں جو سماجی ترقی میں مدد دیں اورادب کے فنی معیار پر پوری اتریں"(۷)یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری سماج میں انصاف کی طلبگار ہے دوسری جانب فیض نے فن کا اظہار بھی سلیقے سے کیا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فیض صرف مزاحمتی شاعر تھے؟اگر فیض کو مزاحمتی شاعر قرار دیں تو فیض کی رومانوی شاعری کہاں جائے گی؟جواب یہی دیا جائے گا کہ فیض کی ساری شاعری مزاحمتی شاعری نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری میں رومانوی عناصر بھی ملاحظہ کرسکتے ہیں'لہذا فیض کی شاعری میں جہاں رومانویت ہے وہاں مزاحمت بھی ہے گویا فیض نے اپنی شاعری میں مزاحمت اوررومانویت کو آپس میں مدغم کیاہے۔اور مزاحمت کے بیان میں براہ راست پیرایہ اظہار کے ساتھ اشاروں اور کنایوں کا سہارالیا۔یوں اس کی شاعری میں مزاحمانہ اور غیر مزاحمانہ انداز کا متوازن اسلوب ملتا ہے یہی فیض کا ہنر ہے کہ مزاحمت بھی ہوگئی اور بچ نکلنے کی راستہ بھی اپنے لیے بنائے رکھا۔ظفر اقبال کا کہنا ہے:

"فیض سمیت کسی بھی شاعر کو مزاحمتی کہنا اس کا سکوپ اور کردار محدود کرنا ہے۔چنانچہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ شاعر اپنے اندر رواں دواں مزاحمت کو اپنی شاعری میں کیونکر لاتا ہے۔شاعری چونکہ سیاسی بیان نہیں ہوتی'اس لیے اس میں بات براہ راست کہنے سے گریز کیا جاتا ہے۔اوراشاروں'کنایوں اوراستعاروں میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس کے باوجود مزاحمت سات پردوں میں سے اپنا سر باہر بھی نکالتی دکھائی دیتی ہے اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں شاعر اپنے آپ کو ورکر یا سیاسی لیڈر بننے سے روکتا ہے یا اس میں ناکام رہ جاتا ہے۔شاعری تخلیق حسن ہونے کی بناء پر ایک تناسب اور توازن کی بھی متقاضی ہے۔چنانچہ جب بھی مزاحمت کا پلڑا بھاری ہوتا ہے'وہ غیر مزاحمت کے مدار سے نکال باہر کرتا ہے وعلیٰ ھذا القیاس۔اور فیض نے مزاحمت اور غیر مزاحمت کو گوندکر جو آمیزہ تیار کیا ہے وہی اس کے ہنر کا کمال بھی ہے کہ اس نے اس لحاظ سے اپنے کلام کو کہیں بھی غیر متوازن نہیں ہونے دیا اوراس کٹھن مرحلے سے گزر کر ہی شعر میں اصل سامان رسانی بھی کی جاسکتی ہے"(۸)

فیض احمد فیض کی شاعری میں جہاں رومانیت'انسان دوستی اور حب الوطنی کے عناصر ملتے ہیں وہاں فیض ظلم وبربریت کے خلاف مزاحمت کرنے کو بھی اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے کہ:"وہ انقلابی فکر کو جمالیاتی احساس سے اور جمالیاتی احساس کو انقلابی فکر سے الگ ہونے نہیں دیتے(۹)

فیض احمد فیض کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے انہوں نے اپنی شاعری کو کو بھی مجاہدہ کا نام دیا۔ اوراس کے نوک پلک سنوارنے میں پوری زندگی صرف کی۔ قیام پاکستان کے بعد فیض پاکستان سے وابستہ رہا پیوستہ رہا لیکن فیض نے اپنی آنکھوں سے جمہوریت کیا جنازہ نکلتے دیکھا اور چند استحصالی قوتوں کی جھولی میں ملکی خزانے کو جاتے دیکھا تو فیض سے رہا نہ گیا۔ اور یوں فیض نے مقصدی شاعری کو فروغ دیا۔ فیض نے عملی میدان میں مساویانہ طرز حکومت کے قیام کا جب بیڑا اٹھایا تو راولپنڈی کیس میں پھنسا کر فیض کا راستہ روک دیا گیا۔ راولپنڈی کیس میں اسے الجھانے کی وجہ یہی تھی کہ ان کا مسلک ترقی پسندی تھا' ان کی شاعری کا اکثر بیانیہ ترقی پسندیت پر مشتمل ہے۔ محسن نواز کا کہنا ہے کہ

> "فیض پاکستان میں مزاحمت کی ایک اہم علامت ہیں، صرف اپنی شاعری کی بنیاد پر ہی نہیں بلکہ اپنی عملی جدوجہد کی بنیاد پر بھی۔ سر وادی سینا میں الیگزانڈر سرکوف نے فیض سے اپنی ملاقات میں ان کا ایک جملہ لکھا ہے "اگر جیل سے بھی بدتر کوئی چیز ہوئی تو پھر یقیناً برا ہو گا، لیکن تم جانتے ہو جدوجہد بہر حال جدوجہد ہے" اور فیض نے صرف یہ کہا نہیں، عملی طور پر کر کے دکھایا۔ فیض کو جب بھی یاد کیا جائے گا، ان کے نظریے اور اس کی خاطر ان کی جدوجہد کا ذکر بھی ہو گا۔ فیض کو جاننے کے لیے کمیونزم کو جاننا بھی ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر شاید فیض، فیض نہ ہوتے "(۱۰)

فیض کی شاعری کے موضوعات کو اگر یکجا کیے جائیں تو ان میں دو اہم موضوعات عشق اور انقلاب کے ملتے ہیں۔ فیض کے عشق میں بھی انقلاب آیا یوں فیض محبوب مجازی سے لیلائے وطن تک کا سفر طے کیا پھر انسانیت کے دروازے پر جا کر دستک دی' اور جب انقلاب کی بات کی جائے تو فیض الفاظ کو عشق کی خمیر میں گوندھ کر انقلابی اور مزاحمتی شاعری کرتے رہے' گویا ان کی شاعری میں عشق و انقلاب کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ فاطمہ حسن کا کہنا ہے کہ

> "فیض کی شاعری کے دو نمایاں رخ ہیں۔ مزاحمت، جو سامراج اور استحصالی نظام کے خلاف ہے، عشق، جو جیتی جاگتی محبوبہ سے ہے۔ رومانس، دونوں شامل ہے۔ اس طرح یہ دونوں رخ خانوں میں بٹے ہوئے نہیں ہے بلکہ اکثر نظموں میں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ چنانچہ ان

کی مزاحمت بھی بہت فطری لگتی ہے۔ پھر ان کا اپنا ڈکشن ہے۔ جو ہر طرح کے جذبات میں یکساں رہتا ہے۔ خواہ وہ حالات کی تلخی ہو یا محبت کی شیرینی، شعریت اور جمالیات ان کی شاعری میں موجود رہتی ہیں۔ بلکہ دونوں کا بہت خوبصورت امتزاج محسوس کیا جا سکتا ہے "(۱۱)

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں۔۔
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی (۱۲)

فیض احمد فیض کی شاعری کا عہد بہ عہد مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ فیض نے رومانوی شاعری سے آغاز لیا اور آخر تک اسی رومانوی پہلو اور جمالیاتی آہنگ کو ملحوظ خاطر رکھا' ترقی پسندی کے باوجود حسرت موہانی' اختر شیرانی جیسے رومانوی رنگ کے شعراء کے اثرات ان کی شاعری پر غالب رہے۔

علی محمد فاطمی اپنی کتاب "فیض ایک نیا مطالعہ میں" لکھتے ہیں کہ:" نقش فریادی اور دست صبا کی بعض نظموں کو ملاحظہ کیجئے ان میں اضطراب ہے مزاحمت بھی' لیکن اسلوب سے سمجھوتہ نہیں (۱۳)

لیکن جوں ہی فیض کی روس' فلسطین' بیروت اور لندن میں آمدورفت ہوئی تو ان کی ملاقات ناظم حکمت' پابلو نرودا' سارتر جیسے بڑے ادباء سے ہوتی ہے تو ان کی شاعری میں تبدیلی آتی گئی اور یوں غم جاناں کی جگہ غم روزگار لینے لگا" تجھ سے بھی دلفریب غم روزگار کے " پاکستان میں مارشل لاء کی تاریکی چھائی تو فیض میدان میں اترے اور مزاحمتی اور انقلابی لحن میں شاعری کی موسیقی الاپنے لگے۔ اس ضمن میں علی محمد فاطمی کا کہنا ہے:

فوجی آمریت نے شکنجے کسے' حبس اور گھٹن کا ماحول ملا' ظلم و جبر کے دائرے تنگ ہوئے تو فیض باقاعدہ نہ صرف قومی صحافت سے وابستہ ہوئے بلکہ مزدوروں اور ملازمین کی تحریکات سے بھی وابستہ ہوتے گئے۔۔۔ فیض کا جمال جلال میں تبدیل ہوا اور ان کے نہ صرف فکری بلکہ لفظیاتی اسلوب میں بھی غیر معمولی تبدیلی آتی گئی یہی وجہ ہے ان کی وہ انقلابی نظمیں جو عوام کی سطح پر بے حد مقبول ہوئیں ان میں سے اکثر بعد کے دور کی ہیں (۱۴)

فیض احمد فیض غالب و اقبال کے بعد اردو کے بڑے شاعروں میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کو سمجھتے ہوئے ایسی شاعری کی ہے جو صرف فیض کے اپنے دور تک محدود نہیں بلکہ آنے والے وقتوں میں بھی ان کی شاعری کی

بازگشت سنائی دیتی رہے گی۔ ان کی شاعری میں اردو کی روایت کے ساتھ نئے موضوعات بھی ملتے ہیں'کلاسیکی لفظیات کو نئی روح دی۔ فیض کی شاعری آہ وبکا اور مرثیہ یا نوحہ نہیں پڑھتی بلکہ ایک واضح راہ پر چلنے کی تلقین کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا ایک پہلو مزاحمتی اور احتجاجی پیرایہ اظہار ہے۔ انہوں نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مزاحمت کا کامیاب فنی اظہار کیا ہے۔ ابرار احمد کا کہنا ہے:

> "فیض بلاشبہ ہمارے عہد کے اہم ترین شاعروں میں سے ہیں اورانکی شاعری مزاحمت اوراحتجاج کا نہایت کامیاب فنی اظہار ہے اردو کی پوری روایت ان کے ہاں پوری آب وتاب سے جلوہ گر ہے اورقدرت کلام کی بدولت وہ اس میں نئے موضوعات کا اضافہ کرتے چلے گئے ہیں۔ فیض نظریاتی طور پر ایک واضح راہ پر چلنے والے اوردوسروں کو اس کی تلقین کرنے والے شاعر ہیں اوراس راہ میں گریہ وزاری اورآنسوؤں کی گنجائش نہیں دی "(۱۵)

ب۔ فیض کی شاعری میں مزاحمت کی جہات:

فیض کی شاعری میں مزاحمت کی کئی سطحیں اور جہات ملتی ہیں جن کو ان عنوانات ساتھ بیان کرسکتے ہیں۔

i۔ ملکی آمریت کے خلاف مزاحمت

ii۔ عالمی استعماری قوتوں کے خلاف مزاحمت

iii۔ مذہبی اجارہ داری کے خلاف مزاحمت

iv۔ سماجی اور طبقاتی استحصال کے خلاف مزاحمت

V۔ فیض کا مزاحمت سے بغاوت کی طرف میلان

Vi۔ فیض کی شاعری کا علامتی پہلو

i۔ ملکی آمریت کے خلاف مزاحمت:

فیض احمد فیض امن دوست اور انسان دوست شاعر ہیں۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں رومانویت کا جہاں تذکرہ ملتا ہے وہاں فیض "تجھ سے بھی دلفریب ہے غم روزگار کے "کا نعرہ بلند کرتے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ "اور بھی دکھ ہے زمانے میں محبت کے سوا" کے ایسے گن گاتے ہیں کہ محبوب سے پہلی سی محبت کا تقاضانہ کرنے کی فرمائش بھی کر گزرتے ہیں۔ فیض عشق مجازی سے اپنے سفر عشق کا آغاز کرتے ہیں بالآخرہ ان کا عشق انسانیت تک پہنچ جاتا ہے'یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری میں ظلم وجبر فضا کے خلاف مزاحمانہ رویہ ملتا ہے۔ جمیل جالبی کا کہنا ہے:

"فیض جبر واستحصال کے دشمن تھے۔اور عدل وانصاف کے داعی تھے۔عوام کو انسانی قوتوں کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔وہ عوام جن سے قوموں کی کھیتیاں سرسبز وشاداب ہو جاتی ہیں۔صنعت وحرفت پھلنے پھولنے لگتی ہے اور زندگی کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔ان کی شاعری عوام کی اسی قوت کی ترجمان ہے"(۱۶)

یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب ایک انسان کو آزادی اظہار حاصل نہ ہو اور بنیادی ضرورتیں روٹی'کپڑا اور مکان میسر نہ آئیں تو وہ زندگی میں بقا کی جنگ کے لیے مزاحمت کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور اسی مزاحمت اور کوشش سے اس کا جینا آسان ہو جاتا ہے بلکل اسی طرح فیض احمد فیض بھی اپنے عہد کو دیکھ کر آنکھیں بند نہیں کیں بلکہ اپنے عہد کی بربریت اور سفاکیت کے خلاف بند باندھنے کے لیے مزاحمتی شاعری کا سہارا لیا۔

"جب کسی ملک میں، کسی معاشرے میں، کسی فرد کو شخصی آزادی حاصل نہ ہوگی۔جب کسی شخص کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کی آزادی نہ ہو تو اس شخص کے لیے وہ ملک'معاشرہ قفس میں قید پرندے کی طرح ہے جو اپنی آزادی کی خاطر غم کا نوحہ سنا رہا ہے'پر اس کا نوحہ سننے والا کوئی نہیں۔اسی طرح ایک ایسا شخص اپنی بنیادی ضرورتوں'روٹی'کپڑا اور مکان سے محروم اپنی بنیادی خواہشیں اپنے حکمران،اپنے شہر حکم سنانا چاہتا ہے۔پر اس کا وہ حاکم اس کو اس کی اس عدل وانصاف کے لیے کس کے باب پر دستک دے گا تو ایسے حالات وواقعات میں فیض کا قلم مزاحمت کو موضوع بحث بناتا ہے"(۱۷)

فیض احمد فیض کا شمار ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے'بلکہ ترقی پسند تحریک کو ایک نئی جلا فیض کی شاعری سے ملی'لیکن قیام پاکستان کے بعد اس تحریک پر پابندی لگی تو فیض خود ایک تحریک بن کر ترقی پسند فکر کا ابلاغ کرتے رہے'نتیجے میں فیض کو راولپنڈی کیس میں دھر لیے گئے۔

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن'نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا،خطائے نظر سے پہلے،عتاب جرم سخن سے پہلے (۱۸)

تقسیم کے بعد وہ پاکستانی ادب جو ترقی پسند تحریک کے عہد میں لکھا گیا۔اس میں اشارے موجود ہیں۔یوں تو بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔لیکن فیض احمد فیض کی آواز اس دور میں بہت نمایاں رہی۔"فیض کو پنڈی سازش کیس میں ۱۹۵۳ءمیں گرفتار کیا گیا تھا۔ان کی یہ قیدوبند ان کی شاعری کا مزاج بنانے میں بھی بہت مددگار ثابت ہوئی۔اور انہوں نے لاتعداد نظمیں اور غزلیں لکھیں جن میں ان کا مزاحمتی احساس بہت نمایاں ہے"(۱۹)

فیض احمد فیض کی شاعری میں مزاحمتی جہات میں سے ایک جہت آمریت کے خلاف مزاحمت ہے فیض نے وقتی فائدہ کو دیکھتے ہوئے آمر حکمرانوں کے ساتھ ساز باز کر کے مفاہمانہ اور منافقانہ شاعری نہیں کی بلکہ سلطان جابر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کا پرچار کرتے رہے اور مجبور و مقہور عوام کی ترجمانی کرتے رہے ان کی شاعری میں انفرادی عناصر کی جگہ اجتماعی مسائل کا بیان زیادہ ملتا ہے گویا انہوں نے صرف اپنی بات نہیں کی بلکہ انسانیت کی بات ہے اور فیض سمیت دیگر لوگوں کے لیے آمریت ایک ناسور تھی جس کی وجہ سے فیض نے کبھی علامتوں میں اور کبھی براہ راست مزاحمتی شاعری کی تاکہ آمریت کا بھیانک سایہ ختم ہو سکے اور عادلانہ اور مساویانہ حکومت کا قیام ممکن ہو سکے۔ پس فیض کے مزاحمتی شاعر ہونے کی بنیادی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ اور سبب ملک میں مارشل لاء کا نفاذ ہے جسے انسانیت کے لیے نہایت ہی ناشائستہ قرار دیا کیونکہ اس کے نتیجے میں آزادی اظہار پر مکمل پابندی لگ جاتی اور مطلق العنایت بھی آجاتی ہے۔ قاسم یعقوب کا کہنا ہے کہ "مزاحمتی ادب کی ایک قسم مارشل لائی جبر کے خلاف لڑنا ہے۔ اسے مزاحمتی ادب کی سب سے واشگاف اور بلند آواز بھی کہا جا سکتا ہے۔ عموماً ایسا ادب اکہرا اور تادیر نہیں ہوتا (۲۰)

فیض احمد فیض کی شاعری میں رومانوی فضا کے پیچھے جمالیاتی ذوق پر مبنی کلاسیکی شاعری ہے تو دوسری طرف ناکامی عشق کارفرما ہے۔ فیض کی شاعری میں ایک ارتقاء کی کیفیت نظر آتی ہیں۔ فیض نے اپنے آپ کو صرف عشق مجازی تک محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے اپنے زمانے کی سیاسی اور سماجی حالات سے بھی گہرا شعور حاصل کیا اور ایک زمانہ شناس کی طرح زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر انہوں سے اس طرح سے مزاحمتی شاعری کی کہ ان کی شاعری اس دور کی آمریت کے خلاف تھی لیکن ایسی انہوں نے شاعری کی کہ وہ اب صرف اس دور کی شاعری نہیں رہی بلکہ ہر آمر کے خلاف مظلوم کی پکار اور صدا بن گئی ہے۔

۱۹۵۸ء میں پاکستان میں پہلا مارشل لاء لگا' اہل وطن کے لیے یہ پہلا تجربہ تھا' فیض جب ماسکو پہنچے تو قریبی دوستوں نے مارشل لاء کے ہوتے ہوئے پاکستان نہ جانے کا مشورہ دیا دیا تو فیض نے جواب دیا کہ "اگر دنیا میں جیل سے بھی بدتر کوئی چیز ہے تو ملک کی خاطر اور اُن جیالوں کی خاطر جو مارشل لا کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں مجھے وہ قبول ہے" اس کسمپرسی کے عالم میں صحافی' ملازمین' پولیس' صنعت کار اور اہل قلم خاموش تھے' فیض نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے غریب عوام کی مجموعی صورتحال کو نمایاں کیا' جہاں وطن تاراج ہو رہا تھا' چمن اجڑ رہا تھا' ہر گھر میں تاریکی چھاگئی تھی ان کیفیات کی عکاسی فیض احمد فیض نے ان الفاظ کے ساتھ کی ہے:

دیار یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر
رہِ یقین تری افشانِ خاک وخوں پہ سلام
مرے چمن ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر
ہر ایک خانہ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر، خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتہ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدہ پرنم کی آب وتاب کی خیر
رواں رہے یہ روایت، خوشا ضمانت غم (۲۱)

فیض نے اپنی اس نظم میں مارشل لاء کے نتیجے میں کیا کچھ ہوا اس کی جھلکیاں ان الفاظ میں دکھارہے ہیں کہ یہ مارشل لاء ایک ایسی مصیبت ہے جس کی وجہ سے وطن عزیز کی حالت کچھ غیر ہوگئی ہے 'ملک میں انارکی کی کیفیتیں گھر کر گئیں 'چمن ویران ہو چکا تھا 'حق غصب کیے جارہے ہیں 'آئین کا احترام جاتا رہا ہے 'ہر آنکھ گریہ کناں ہیں' کہیں امان نام کی کوئی شی باقی نہ رہی اور سکون بھی چھن گئے جائے تو کہاں جائے 'چین پائے کہاں سے گویا ایک اجنبی کیفیت طبع شاعر پر طاری ہو جاتی ہے۔ وطن کی ان دگر گوں حالات پر شاعر سلام ہی بھیج سکتا ہے۔

مارشل لاء کے دور میں فیض کو ہر جا رکاوٹوں اور مشکلات کی دیواریں نظر آئیں۔ خوابوں کو چکنا چور ہوتے بھی فیض دیکھ رہے تھے 'ہر جگہ مقتل گاہ بنی' اور بھی کڑی مصیبتیں مارشل لاء اپنے ہمراہ لائیں۔ تو فیض وطن پر ترس کھا گئے' وطن کے ان دگر گوں کیفیات کو اپنی ایک نظم "موضوع سخن" میں فیض احمد فیض ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں:

یہ ہر اک سمت پراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر ایک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ
یہ بھی ہیں' ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے

لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ

ہائے اس جسم کے کم بخت دلآویز خطوط

آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں

طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں (۲۲)

فیض احمد فیض لکھنے سے باز نہیں آئے متاعِ لوح و قلم کے چھن جانے کے باوجود خونِ دل سے شاعری لکھنے کی فیض نے طرح ڈالی اور مایوسیت میں پڑے بغیر امید افزا شاعری کرنے میں فیض کامیاب ٹھہرے۔ آغا ناصر کا کہنا ہے:

"فیض نے جیل میں بھی کئی نظمیں اور غزلیں تحریر کی ہیں 'بلکہ "دستِ صبا" کی ساری شاعری جیل کی کوٹھری میں تخلیق ہوئی۔ فیض نے دورانِ قید ایک ترانہ لکھا۔ یہ ترانہ فیض کو بہت محبوب تھا کیونکہ فیض کو بھی اس ترانہ سے کافی حوصلہ ملا اور ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کو بھی برابر حوصلہ ملتا رہا یہ ترانہ جبر اور فریب کی قوتوں کے خلاف ایک احتجاج اور فتح کی ایک ناقوس ہے۔ اس ترانہ کے بارے کہنا ہے "ایک ایسا احتجاج جو عزم اور رجائیت سے بھرپور ہونے کے علاوہ حق اور باطل کی اس جنگ میں فتح کی آخری نوید بھی دیتا ہے" (۲۳)

اس نظم کے چند اشعار کچھ اس طرح سے ہیں:

اے خاک نشینو! اُٹھ بیٹھو' وہ وقت قریب آ پہنچا ہے

جب تخت گرائے جائیں گے' جب تاج اچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں

جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں' تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

اے ظلم کے ماتو لب کھولو' چپ رہنے والو چپ کب تک

کچھ حشر تو ان سے اُٹھے گا' کچھ دور تو نالے جائیں گے (۲۴)

ایوب خان کے مارشل لاء کے بعد ایک مارشل لاء ضیاء الحق کا بھی آتا ہے۔ یہ مارشل لاء بھی ایوب خان کی مارشل لاء سے زیادہ سخت نہیں تھا تو کچھ کم بھی نہیں تھا' حق بات تو یہ ہے کہ یہ مارشل لاء مذہبی بنیاد پرستی کو نافذ کرنے کی ایک کوشش تھی' جس میں بھٹو جیسے عوامی رہنما کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ اس مارشل لاء میں زبانیں گنگ ہو چکی

تھیں۔اس دوران فیض نے اپنی شاعری کو صیقل کیااوریوں آمریت کی مزاحمت میں عوام اوروطن میں چھائی ہوئی زبوں حالی اور بیگانگیت کی فضا کو اپنی ایک نظم "ہم تو مجبوروفاہیں" میں اس انداز میں بیان کر رہے ہیں:

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیئے اے ارض وطن
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہو گا
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گل زار کریں
ترے ایوانوں میں پرزے ہوئے پیماں کتنے
کتنے وعدے جو نہ آسودہ اقرار ہوئے
ہم تو مجبور وفاہیں مگر اے جان جہاں
اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا[۲۵]

اس نظم میں غور کیاجائے تو مارشل لاء کی تلخی بھی ہے'ابتر صورتحال پر طنز کے نشتر بھی'اور بحیثیت انسان 'ارباب اقتدار سے شکایت بھی اور حالات کے آئے روز دگرگوں ہونے کی وجہ سے اجنبیت کا احساس بھی چھلکتا ہے۔"ہم تو مجبوروفاہیں" میں تلخی بھی ہے'طنز بھی ہے،شکایت بھی اور شاید مایوسی بھی ایسا پیرایہ فیض صاحب نے کم ہی اپنی شاعری میں اختیار کیاہے"[۲۶]

فیض کو ایک بار جیل سے باہر پولیس کے حصار لوگوں سے ملاقات ہوئی تو فیض نے ایک نظم اسی پس منظر میں لکھی جو" آج بازار میں پا بجولاں چلو" کے نام سے مشہور ہوئی۔اس میں شاعر اپنی اور تمام لوگوں پر بیتنے والی کیفیات کی ترجمانی پورے جمالیاتی پہلو کے ساتھ کی ہے'جس میں موسیقیت اور نغمگیت دونوں ہیں۔" یہ نظم ظلم کے خلاف مزاحمت کا بہترین نمونہ ہے۔اورجب حکومت کو ان کی انقلابی فکر سے پریشانی ہوئی ہے تو انہیں ناکردہ گناہی میں جیل کی سزا کا حکم سنادیا جاتا ہے۔لیکن پھر بھی چپ نہیں رہتے بلکہ حاکم وقت کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں"[۲۷] نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

چشم نم'جان شوریدہ کافی نہیں

تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو
دشتِ افشاں چلو'مست ورقصاں چلو
خاک بر سر چلو'خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو(۲۸)

فیض احمد فیض انسانیت کا درد رکھنے والے شاعر ہیں'انہوں نے شاعری کو اپنی شہرت کے لیے استعمال نہیں کیا ان کی نیت خالص تھی'یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شاعرانہ تعلیٰ سے کام نہیں لیا۔انہوں نے اپنی شاعری کو غریب ونادار لوگوں'کسانوں اور مظلوم مقہور لوگوں کے حقوق کے لیے وقف کر دی۔ان کی محبتیں بھی انہی لوگوں کے لیے تھیں'نفرت کسی شخصیت نہیں تھی بلکہ ان کو نفرت ظلم اور جبر سے تھی۔ان کی نظموں میں سے ایک نظم "انتساب"جو کلرکوں'پوسٹ مینوں'کسانوں'محنت کشوں 'بہنوں الغرض غریب اور مظلوم لوگوں کے نام سے منسوب ہے۔اس نظم کے حوالے انوار احمد لکھتے ہیں:

" کبھی وہ اپنی نظم(انتساب)میں سب کے دکھوں کی بات کرتے ہیں۔اس نظم کا شعری منشور موجود ہے۔اس میں وہ'آج'،'آج کا غم'،دیس،کلرکوں،پوسٹ مینوں،تانگے والوں،ریل بانوں،کارخانوں کے بھوکے جیالوں،کسانوں،دکھی ماؤں،بن بیاہی حسیناؤں،محنت کشوں،کڑیوں،محلوں،طالب علموں،اسیروں کے نام انتساب کرتے ہیں۔اس نظم میں انہوں نے تمام مظلوموں اور مقہوروں کی خوبصورت تصویریں پیش کر دی ہیں۔ان میں سے کسانوں کی تصویر'میں درد کے رنگ زیادہ گہرے ہیں"(۲۹)

یہ نظم یوں تو درد کا استعارہ ہے'لیکن کسانوں کے درد کو قدرے گہرے درد کے ساتھ بیان کیا ہے فیض ان کے بارے میں یوں گویا ہوئے:

بادشاہِ جہاں والئی ماسوا نائب اللہ فی الارض
دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکالے گئے ہیں
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھالے گئے ہیں

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے (۳۰)

آغا ناصر کا کہنا ہے کہ

"یہاں سے شہر کو دیکھو" جس زمانے میں لکھی تھی، ایوب خان ان دنوں ایک جابر اور مطلق العنان آمر کی حیثیت سے اپنے اقتدار کو طول دینے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ انہوں نے خود کو جنرل کی بجائے فیلڈ مارشل کہلوانا شروع کر دیا تھا۔۔۔ یہ وہ دور تھا جب لوگ ان کی سخت گیری اور تند مزاجی کے سبب خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور سہمے سہمے رہتے تھے۔ یہ ظلم و استبداد کا دور تھا (۳۱)

فیض احمد فیض نے جب کراچی شہر کی 'گلیوں' بازاروں اور سڑکوں کو (اپنے ہاؤسنگ سوسائٹی والے گھر کے بلند ٹیرس پر بیٹھے) دیکھا کرتے تو انہیں احساس تھا کہ سارا ملک زندان میں بدل چکا ہے۔ اسی کربناک تجربے کو فیض ان الفاظ کے ساتھ شعری قالب میں بیان کر رہے ہیں:

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل
ہر ایک راہ گزر گردشِ اسیراں ہے
نہ سنگِ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کہ سبیل۔۔
ہر ایک مرد جواں مجرم رسن بہ گلو
ہر ایک حسینہ رعنا، کنیز حلقہ بگوش (۳۲)

فیض احمد فیض نے اس نظم میں آمر کا نام نہیں بتایا یہی فیض کا کمال ہے جو صرف ظلم کو بیان نہیں کرتا بلکہ ظلم کے پیچھے جو وجوہات کار فرما ہیں ان کی طرف بھی نام لیے بغیر اشارہ کر دیتے ہیں' ایک عام قاری بھی بہ آسانی ان وجوہات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ یہ جو ملک میں بدحالی' زندان کی کیفیت' ظلم و جبر کی فضا چھائی ہوئی ہے ان کے پیچھے آمریت کار فرما ہے' اس کی نشاندہی فیض کی نظموں اور غزلوں سے ہوتی ہے۔

فیض احمد فیض کی شاعری میں آمریت کی مخالفت ملتی ہے'اور فیض عوام کو حوصلہ بھی دیتے ہیں کہ یہ دو'چار دنوں کے اقتدار میں مست حکمران'عوام سے ناروا سلوک سے پیش آرہے ہیں'انشاءاللہ وہ دن دور نہیں جب ان سب کی پکڑ ہو گی۔

گر آج تجھ سے جدا ہیں'تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے'طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں (۳۳)

"ان کے یہ اشعار غیر جمہوری اور فاشست دور میں مزاحمت کرنے والے طالب علموں، استادوں، صحافیوں اور دانشوروں کے لیے ایک وعدہ، ایک تسلی، ایک خانہ سوزوار فتگی کا جواز بنے رہے ہیں" (۳۴)

فیض حق بات کو اعلانیہ کہنے کا حوصلہ رکھنے کے ساتھ ساتھ آزادی اظہار کے بھی قائل تھے۔ظالم و جابر کے خلاف بولنے کو جہاد سمجھتے تھے۔ان کی ایک نظم "کتے" ہیں اس نظم میں فیض نے مظلوم طبقے کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کی طرف اشارہ دیا ہے کہ مظلوم طبقہ اگر ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو ان کی طاقت بھی بڑی ہو گی'احتجاج بھی توانا ہو گا اور مزاحمت بھی جب عروج کو چھوئے گی تو پھر انقلاب آنے میں دیر بھی نہیں لگے گی۔

مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دُنیا کو اپنا بنالیں
یہ آقائوں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی ان کو احساس ذلت دلادے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلادے (۳۵)

فیض احمد فیض کو دریچے میں 'مسیحا کا خون لیے صلیبیں گڑی ہوئی نظر آتی ہیں'خزاں کا موسم چھایا ہوا نظر آتا ہے اور ساتھ ہی کشت خون میں غلطاں کئی بے گناہ تختہ دار پر لٹکائے دیکھتے ہیں تو دوسری جانب حلقہ یاراں پر کرم کی بارسات ہو رہی ہوتی ہیں اس تضاد کو فیض برداشت نہیں کر پایا'یوں فیض احمد فیض اپنی ایک نظم "دریچہ" میں لکھتے ہیں:

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں

ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی امنگ لیے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دو نیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں (۳۶)

فیض احمد فیض جب مارشل لاء کے ظلم و جبر اور سنسر شپ کو دیکھتے ہیں تو فیض لوگوں پر برہم ہوتے ہیں کیوں یہ لوگ آواز نہیں اٹھاتے' گر منہ میں زبان رکھتے ہیں تو پھر بولتے کیوں نہیں' اب کچھ حشر سے پہلے حشر کیوں نہیں اٹھاتے' روزِ عدل سے پہلے عدالت کے ترازو کو نصب کیوں نہیں کرتے؟ آخر کس چیز کا انتظار ہے؟ اس حوالے سے فیض کا انداز تخاطب دیدنی ہے:

گر تن نہیں، زباں سہی آزاد کچھ تو ہو
دشنام، نالہ ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو (۳۷)

آمریت کے دور کو فیض نے بڑے قریب سے دیکھا ایک آمریت غروب کر گئی تو دوسری آمریت بھیانک چہرے کے ساتھ نمودار ہوئی اور برائے نام جمہوریت کا ڈھونگ رچایا' ریلیوں پر گولیاں برسائی گئی۔ غریبوں پر پرچے کاٹے' بھٹو جیسے دلیر لیڈر کو تختہ دار تک پہنچایا۔ جب ان حالات کو فیض نے خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تو ایک نظم نظم "شورش زنجیر بسم اللہ" لکھی اس کے چند اشعار یہ ہیں:

گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ
درِ زنداں پہ بلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے، پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی تقسیر بسم اللہ

سر دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمار نالہ شب گیر بسم اللہ
ستم کی داستان' کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مصر ہے محتسب رازِ شہیدان وفا کہیے (۳۸)

ظلم کے خلاف بولنا بڑا مشکل کام ہے' اس کے لیے بیباکی چاہیئے' جرات چاہیئے اور ساتھ ہمت بھی تب جاکر سلطان جابر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی جا سکتی ہے۔ جب آمریت کے خلاف بولنا ہو تو پھر اپنی جان کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے جیسا کہ فیض اپنی ایک نظم "سوچ" میں فیض احمد فیض لکھتے ہیں:

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھوٹیں گے' خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم نہ رہیں' غم بھی نہ رہے گا (۳۹)

فیض کو وطن اور وطن کے غریبوں کا دکھ اور بھی شدید تر ہوا' جب انہوں نے ملک کو مطلب پرست اہل ہوس سیاسی طالع آزماؤں کے حصار میں گرفتار دیکھا۔ وہ جابر و ظالم حکمران جو دو' چار دنوں کے اقتدار کو طول دینے کے لیے طرح طرح کے بہانے بناتے اور ظلم و ستم کا بازار گرم رکھتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے مخالفوں کو تیغ ستم کا نشانہ بناتے ہیں تو فیض کہتے ہیں۔

بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

پاکستان ایک جمہوری ملک ہے' ایک جمہوری ملک میں عوام کو رائے عامہ کے اظہار کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ قائداعظم کے بعد بڑے افسوس سے ملکی حالات بڑی گھمبیر رہیں۔ کسی نے بھی زبان کھولنے کی جرات کی اسے جیل کی راہ دکھادی۔ اس بارے میں آغا ناصر کا کہنا ہے:

"جب بھی کوئی زبان کھولنا چاہتا ہے یا اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو اس کو قید و بند جیسی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ جیسے فیض نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ الغرض ہمیں فیض کی آواز دنیا کے ہر اس گوشے 'ہر اس نگر سے سنائی دے گی جہاں جہاں انسانوں کا انسانوں کے ہاتھوں استحصال ہو تا رہا ہو گا' الغرض یہی وہ وجوہات ہیں جن کے باعث فیض کو اپنی شاعری میں مزاحمتی انداز اختیار کرنا پڑا"(۴۰)

فیض احمد فیض کی شاعری قنوطیت کی شاعری نہیں البتہ کہیں کہیں مقامات پر فیض نے قنوطیت کے دروازے پر دستک دی ہے 'جہاں انہیں کوئی خضر نظر نہیں آیا جو آمریت کا قلع قمع کر سکے نتیجے میں مطلق العنانیت بڑھتی گئی اور ظلم کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئیں' امن کی فاختائیں کوہ قاف کی وادیوں میں جا آباد ہوئیں' لا محالہ ہر جگہوں پر ظلم کے کانٹے نکل آئے' انہی کانٹوں پر چل کر لوگوں نے اپنے پیروں میں مہندی لگائی۔ اسی حوالے سے فیض احمد فیض اپنی ایک نظم "پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو" میں لکھتے ہیں:

ہم کیا کرتے کس رہ چلتے
یوں پاؤں لہولہان ہوئے
سب دیکھنے والے کہتے تھے
یہ کیسی ریت رچائی ہے
یہ مہندی کیوں لگائی ہے

فیض احمد فیض کو راولپنڈی کیس میں قید کے بعد جب رہائی ملتی ہے تو حیرانگی کی انتہا ہو گئی' فیض جب جیل سے باہر آئے تو ملک کے بارے میں جو خیال جیل میں کیا تھا اس کے بر عکس نکلا' ملک میں وہی انارکی تھی' وہی دہشت تھی اور وہی جبر اور تاریکی گو کہ فیض کو کوئی نئی چیز دیکھنے کو نہیں ملی تو فیض یہ کہتے ہوئے نظر آئے:

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر تیرے رخ پر بکھر گئی ہو گی

ظلم وجبر کے خلاف جنگ طول تاریخ سے چلتی آئی ہے'یہ سلسلہ نہ رکا ہے اور نہ رکے گا جب تک انسان میں احساس باقی رہے گا تب تک ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت بھی جاری و ساری رہے گی۔فیض بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کررہے ہیں:

یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے'نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

فیض کی نظموں میں سے ایک نظم "تین آوازیں ہیں"اس نظم میں آمریت کے خلاف شدید مزاحمت کا انداز ملتا ہے۔اصل میں یہ تین آوازیں ظالم'مظلوم اور غیبی آوازیں ہیں۔اس نظم میں جلال کے ساتھ ساتھ تلخی'تیزی اور شدت بھی ہے ۔اس نظم سے یہ اندازہ لگایاجاسکتاہے کہ فیض نے یہ نظم بہت طیش میں آکر لکھی ہے۔فیض کی یہ نظم بھٹو کی سزائے موت کے بعد کی ہے۔فیض کی نظم" تین آوازیں"میں پہلی آواز ظالم کی ہے۔عام خیال یہی کیاجاتا ہے کہ اس سے مراد جابر حکمران کی آواز ہے۔آغاناصراس بارے میں لکھتے ہیں" میرے بزرگ دوست ڈاکٹر آفتاب احمد نے تو واضح طور پر اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے کہ "ظالم کی آواز دراصل ضیاء الحق کی آواز ہے"[۴۱]"پہلی آواز"جو کہ ظالم کی آواز ہے'فیض اس آواز کو ان الفاظ میں بیان کررہے ہیں:

ساری آنکھوں کو تہہ تیغ کیاہے میں نے
سارے خوابوں کا گلا گھونٹ دیاہے میں نے
میرامسلک بھی نیاراہ طریقت بھی نئی
میرے قانون بھی نئے میری شریعت بھی نئی

ظالم کے بعد مظلوم کی آواز ہے جو خود شاعر کی آواز ہے۔مگر یہ تنہا آواز نہیں ملک کے ان گنت محروم ومحکوم لوگوں کی آواز بھی اس میں شامل ہیں۔اس آواز میں جو درد و کرب ہے وہ اپنے پروردگار سے فریاد کا جو لہجہ ہے'وہ پہلی بار فیض صاحب کے ہاں نظر آتا ہے۔اس میں اپنے خالق سے ایک طرح کا گلا بھی[۴۲]

ظالم کے بعد دوسری آواز مظلوم کی آواز ہے۔یہ شاعر کی اپنی آواز نہیں بلکہ کئی مظلوموں اور محکوموں کی آوازیں ہیں جو درد اور کرب سے پر ہیں۔ نظم کے اس حصے میں مظلوم اور محکوم کے کرب اور درد کے بیان میں فیض نے

شکایت اور گلا کا لہجہ اپنایا ہے' جہاں مقہور و مظلوم اپنی قسمت کو سامنے لا کر اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر حرف شکایت زبان سے جاری کر رہے ہیں۔ فیض اس شکایت اور گلا کو ان الفاظ میں پیش کر رہے ہیں:

یا خدا یہ مری گردان شب و روز و سحر
یہ مری عمر کا بے منزل و آرام سفر
کیا یہی کچھ مری قسمت میں لکھا ہے تو نے
ہر مسرت سے مجھے عاق کیا ہے تو نے
وہ یہ کہتے ہیں تو خوشنود ہر اک ظلم سے ہے
وہ یہ کہتے ہیں ہر اک ظلم ترے حکم سے ہے
گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں؟
ان کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں؟ (۴۳)

نظم کے پہلے حصے میں ظالم دوسرے میں مظلوم اور پھر تیسرے حصے غیبی آواز کا بیان ہے۔ یہ غیبی آواز وقت اور تاریخ کی آواز ہے یہ اللہ کے فیصلے کی آواز ہے۔ جس میں آمریت 'مطلق العنانیت اور ظلم و جبر کی حکمرانی کرنے والوں کے لیے واشگاف الفاظ میں تنبیہہ ہے۔ کہ جب انقلاب کے لیے مظلوم و مقہور اُٹھ کھڑے ہوں گے تو پھر ظالموں کو بچانے والا کوئی نہیں ہو گا' ظالموں کے لیے جزا و سزا یہیں پہ منعقد ہو گی اور محشر کا شور یہیں سے اٹھے گا' حساب و کتاب کا دفتر یہیں کھلے گا' لہٰذا" ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو گٹ جاتا ہے" ظالم کو صرف اس دنیا میں نہیں بلکہ اپنے ظلم کا خمیازہ موجودہ دنیا میں بھگتنا ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اٹل فیصلہ ہے۔ فیض کی زبانی شعر ملاحظہ ہو:

ہر ایک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فرد عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہو گا کہ جو بچا لے
جزا و سزا سب یہیں پہ ہو گی
یہیں عذاب و ثواب ہو گا

یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر

یہیں پہ روزِ حساب ہو گا

فیض احمد فیض کی شاعری میں قنوطیت کی نسبت رجائیت کی چاؤ زیادہ ہے۔یوں تو فیض کو جیلوں میں کبھی بند رکھا گیا تو کبھی پہرے بٹھائے گئے تو کبھی جلاوطن ہونے کی اذیتوں سے بھی گزرنا پڑا لیکن اپنی دھن کے پکے تھے ماحول اورآمریت کی فضا نے فیض پر بیگانگیت کے بادل چھائے رکھے مگر فیض نے امید کے دامن کو کبھی نہیں چھوڑا فیض پُر امید رہا کہ ایک نہ ایک دن یہ طبقاتی تفاوت ختم ہو جائے گا اور ایک اجتماعی عادلانہ نظام وجود میں آکے رہے گا۔

ہمارے دم سے کوئے جنوں میں اب بھی خجل

عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی

ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے

ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

صبا نے پھر درِ زندان پہ آکے دی دستک

سحر قریب ہے 'دل سے کہو نہ گھبرائے

فیض احمد فیض نے شعر برائے شعر نہیں کہے بلکہ ان کی شاعری میں جوش کا انقلاب بھی ہے اور اقبال کا پیغام بھی ہے۔فیض ظلم کو برداشت نہیں کر سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ظلم کے خلاف ایک للکار نظر آتی ہے۔اس معاملے میں فیض کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتتے۔ ظلم کے خلاف بولنے کو انہوں نے اپنا وطیرہ بنایا ہوا تھا چاہے ظلم کرنے والا حکمران ہی کیوں نہ ہو سلطان جابر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ظلم کے خلاف بولنا کمال ہے 'فیض نے اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ظلم و بربریت کے خلاف مزاحمتی شاعری کی۔اوران کی مزاحمتی شاعری وقتی نظر نہیں آتی بلکہ ان کی مزاحمتی شاعری میں عمومیت پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ فیض کی مزاحمتی شاعری کی تازگی اب بھی باقی ہے یہ فیض کے فن شاعری کا کمال ہے۔

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق

نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی

یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول

نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

ii۔عالمی استعماری قوتوں کے خلاف مزاحمت:

شاعری جزویست از پیغمبری یعنی شاعر اپنے پیغامات کو شاعری کے ذریعے عوام تک ابلاغ کرتا ہے اور یہ ابلاغ مؤثر اور دیرپا ہوتا ہے۔ فیض احمد فیض نے بھی ادب اور شاعری کو برائے فن نہیں لیا بلکہ اپنا پیغام عوام تک یا عوامی امنگیں ایوانوں تک پہنچانے میں بہترین وسیلہ اظہار شاعری کو قرار دیتے ہوئے مشاہدہ کو مجاہدہ سے صیقل کر کے اہل ظلم وجور سے ٹکر لیتے رہے اور یوں فکری مزاحمت کے ساتھ ساتھ عملی میدان میں بھی مزاحمت سے نہیں گھبرائے۔ عبدالرؤف ملک کا کہنا ہے:

"مزاحمتی ادب و شعر کی تخلیق اُن ملکوں کے ادیبوں اور شاعروں کا خاصہ رہا ہے۔ جو غیر ملکی استعماریت کا شکار رہے۔ کیونکہ مغربی ممالک کو اس صورت حال کا سامنا نہ تھا۔ اس لیے وہاں کے ادب میں ہمیں ظلم و جبر اور استبداد کی وہ منظر کشی نہیں ملتی جیسی افریقہ و ایشیا کے ملکوں کے ادب، شعر میں عام طور پر نظر آتی ہے"(۴۴)

پاکستان میں جب تک تھے آمریت کے خلاف بولتے رہے 'بیرون ملک گئے تو عالمی استعمار اور استکبار کے مذموم عزائم کے خلاف زبان سے شاعری کی صورت میں مزاحمت کی تو دوسری جانب بیروت میں قیام کے دوران فلسطینیوں کے حوصلے بڑھاتے رہے اور خود بھی کسی حد تک فلسطینیوں کے حق میں میدان عمل میں بھی آگے آگے رہے اور اتنی انسیت فیض کو فلسطین سے ہوئی کہ وہ فلسطین کو اپنا وطن تصور کرنے لگے۔ احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے:

"فیض کو سامراج سے نفرت ہے، سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نفرت ہے، غلامی اور محکومی سے نفرت ہے، گنے چنے انسانوں کے ہاتھوں کروڑوں انسانوں کے سفاکانہ استحصال سے نفرت ہے، جبر و ظلم سے نفرت ہے، اتنی بہت سی نفرتیں جب اظہار پاتی ہیں تو شاعری میں چیخوں اور فریادوں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ مگر فیض کے ہاں شور کی کوئی کیفیت ہی نہیں۔ در اصل ان سب نفرتوں پر فیض کی بنی نوع انسان سے محبت آسمان کی طرح چھا گئی ہے۔ یہ ساری نفرتیں فیض کی ہمہ گیر انسان دوستی کی لپیٹ میں آتی ہیں اور یوں فیض کی مقصدی شاعری اس اعلیٰ معیار کی شاعری ہے جس کے علاوہ کوئی اور معیار ابھی تک انسانی ذہن کو سوجھا ہی نہیں(۴۵)

فیض کی انقلابی اور استعمار کے خلاف جد وجہد کی شاعری کو سمجھنے میں ان کی نثری تخلیقات سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ لینن پرائز وصول کرتے ہوئے انھوں نے جو تقریر کی اس میں فیض کی استعمار کے خلاف جد وجہد کے خطوط واضح ہیں۔ اور ان کی زبان میں ہی مؤثر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"انسانیت کی ابتداء سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں بر سرِ عمل اور بر سرِ پیکار رہی ہیں۔ یہ قوتیں ہی تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی و تیرگی، انصاف و دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں، یہی صورت آج بھی ہے، اور ایسی نوعیت کی کشمکش آج بھی جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گزشتہ دور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیتوں سے بھی فرق ہے دورِ حاضر میں جنگ کے دو قبیلوں کا باہمی خون مراد نہیں نہ آج کل امن سے خون خرابے کا خاتمہ مراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی میں ابن آدم کی بقاء اور فناء ہے۔ بقاء و فناء دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتم یا تسلسل کا دار و مدار ہے"(۴۶)

ایک طرف ملک میں آمریت ہے تو دوسری جانب استعماری سازشیں بھی ہیں' انقلابیوں میں اب نئے سرے سے روح پھونکنے کی ضرورت ہے' ان کو جوش اور ولولے کے جام پلانے کی ضرورت ہے تا کہ ان میں مقابلہ کرنے کی سکت اور حوصلہ آ جائے اسی بات کو فیض ان الفاظ میں بیان کر رہے ہیں:

بیزار فضا درپئے آزار صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدم دیرینہ خفا ہے
ہاں بادہ کشو آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب و ہوا ہے
اُمڈی ہے ہر ایک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے

گوپی چند نارنگ اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ایک بار جب عشق کا Parameter ذاتی سے وطنی و قومی و عوامی ہو گیا' اور فیض کا انقلابی شاعر ہونا ہی جس کی تصور آفرینی کرتا ہے۔ تو اب صریحی معنی کو صریحی معنی سے ضرب دینے کا معاملہ اور بھی آسان ہو گیا۔ اس کے بعد لفظ اور ترکیب اپنے آپ اسی کے طے شدی محور پر گھومنے لگتی ہے۔ مثلاً بیزار فضا' وطن کی سیاسی فضا ہے' صبا جو درپے آزاد ہے' نو آبادیاتی نظام

اوراس کا جبر ہے۔'بادہ کشو' سے مراد انقلاب کی راہ کے ساتھی یا یارانِ طریقت ہیں اور جو "ہمدم دیرینہ خفا" میں یا تو انقلابی مسلک سے ہم آہنگی نہیں یا نو آبادیاتی نظام یا فیوڈل سسٹم کا حصہ ہیں۔ عشق میں دیوانگی اور رسوائی چونکہ وجہِ افتخار ہے 'اس لیے 'ملامت کی گھٹا' چھائی ہوئی ہے۔ اور 'الزام کی برسات' کا ذکر ہے۔ نیز جام 'صراحی' جذبہ حریت کی داد دے رہے ہیں (۴۷)

فیض کی معروف نظم "ہم بھی دیکھیں گے" ایرانی انقلاب کے حوالے سے تخلیق ہوئی ہے۔ ۱۹۷۹ میں انقلاب ایران ظہور پذیر ہوا، فیض جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور لندن میں مقیم تھے۔ فیض نے انقلاب ایران پر نظم لکھ کر یہ واضح اشارہ دیا کہ ایک نہ ایک دن یہ آمریت اور یہ مطلق العنانیت اور یہ استعمار اپنے خاتمے کو پہنچے گا۔ جس طرح ایران میں استعماری پشت پناہی رکھنے والی رضا شاہ کی مضبوط شہنشاہت عوامی انقلاب کے پاؤں روندی جاسکتی ہے تو ایک نہ ایک دن دنیا کے غریبوں اور مستضعفین کے ہاتھوں بڑی عالمی طاقتوں کا قلع قمع ہو گا اور اجتماعی عدالت کا میزان سجے گا۔ ایرانی انقلاب پر مبنی نظم کے ورود کے بارے میں آغا ناصر لکھتے ہیں:

"فیض صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے، اور ڈیسک کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ کر کچھ لکھنے لگے۔ جب انھوں نے یہ کام ختم کر لیا تو ایک کاغذ پر لکھی ہوئی دو نظمیں مجھے عنایت کیں اور کہا "پاکستان لے جاؤ" دوستوں میں تقسیم کر دینا۔ ان میں سے ایک نظم ہم نے ایران کے انقلاب پر لکھی ہے "(۴۸)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انقلاب اسلامی ایران کے پس پردہ ولایت فقیہہ کا تصور کارفرما ہے۔ جبکہ فیض کا ذہنی میلان اور فکری جھکاؤ مارکسزم کے ساتھ ہے 'تو انقلاب اسلامی ایران پر نظم لکھنا چہ معنی دارد؟ اس کو جواب خود فیض دے گئے ہیں۔ آغا ناصر کے استفسار پر فیض نے کہا: " بھئی انقلاب اسلامی و غیر اسلامی نہیں ہوا کرتے، جب لوگ تخت و تاج کو الٹنے اور بادشاہی نظام کو تاراج کرنے کے لیے سڑکوں اور گلیوں میں نکل آئیں تو پھر یہ عوامی انقلاب بن جاتا ہے "(۴۹)

فیض کی یہ نظم فکر اور آہنگ دونوں اعتبار سے بذات خود انقلابی نظم ہے۔ فیض کی زندگی میں برپا ہونے والا یہ انقلاب ان کی نظریاتی ترجیحات کے مطابق تو نہ تھا لیکن ایک عوامی انقلاب ہونے کے باعث فیض اس کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ہم دیکھیں گے

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑ کے گی

"ایرانی طلبہ کے نام" (جو ایرانی پولیس سٹیٹ کے ظلم کا شانہ بنے) جس دور میں ان طلبہ کا خون بہایا گیا وہ رضا شاہ کا دور تھا۔ اس نظم میں آمد سے زیادہ آورد کی شعوری کوشش ملتی ہے۔ اس میں اصوات کی تکرار اور انتخاب میں شاعر کا شعور صناعی کی طرف زیادہ میلان کر گیا ہے۔ حمید نسیم کا کہنا ہے:

> ایرانی طلبا کے نام (جو ایرانی پولیس سٹیٹ کے ظلم کا نشانہ بنے) اور جن کے خون کا بدلہ اس سفاک پست قامت درندے رضا شاہ سے قدرت نے لیا۔۔۔ اس نظم کا آہنگ خود فیض صاحب کی شاعری میں بھی نیا ہے۔ یہاں اصوات کے انتخاب اور ان کی تکرار میں شعوری صناعی ہے۔ اس حوالے سے حمید نسیم کا کہنا ہے" یہ اس شعوری صناعی کے ڈھنگ سے کی ہوئی نظم اپنی سیاست کے باوجود ایک بڑی نظم ہے۔ احتجاجی اور مزاحمتی ادب میں ہمیشہ یادگار رہنے والی نظم ہے (۵۰)

فیض احمد فیض ایک آفاقی ذہنیت کے حامل شاعر ہیں۔ ان کی نظریں صرف پاکستان کی آمریت تک نہیں رہی بلکہ ان کی تیز نگاہیں عرب و عجم سے ہوتی ہوئی افریقہ تک جا پہنچی اور ہر مظلوم کی پکار پر لبیک کہا۔

"فیض احمد فیض عالمی پیغامبر امن ہیں وہ ہر جگہ امن کا علمبردار بننے کو ترجیح دیتے ہیں۔ کہیں بھی کسی بھی جگہ کسی کے بھی ملک یا قوم پر جنگ مسلط کی جارہی ہو یا کوئی قوم اور ملک آزادی کی جدوجہد کر رہا ہو تو فیض ان کی آواز میں آواز ملا کر اسے ایک نیا جوش وولولہ دیتے ہیں۔ وہ کبھی ایرانی طلبا کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں جو امن و آزادی کی جدوجہد میں شہید ہوئے کبھی دور دراز افریقہ میں سرگرم حریت قوم کو الفاظ و جذبات کا نذرانہ پیش کرتے ہیں"(۵۱)

فیض کی نظریں صرف پاکستان'ایشیا تک محدود نہیں رہیں بلکہ فیض ایک کشادہ فکری اور وسعت قلبی کے مالک انسان تھے انہوں نے مذہب کے خول سے نکل کر انسانیت کے لیے سوچا اور انسان سے درد رکھتے ہوئے انسانیت پر مبنی شاعری کی یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں افریقہ کے مظلوم عوام کے لیے بھی درد اور تڑپ دیدنی ہے۔بقولِ قمر رئیس:

"فیضؔ نہ صرف برصغیر بلکہ ساری دنیا کے امن دوست محنت کش انسانوں کی زندگی اور ایک بہتر مستقبل کے لئے ان کی جدوجہد سے ان کا رشتہ استوار رہا۔ایشیا،افریقہ،لاطینی امریکہ کے کروڑوں انسان، فلسطینی مجاہدین اور خود برصغیر کے عوام ظلم و تشدد اور استحصال کے شکنجوں سے آزادی کے لئے جو مقدس جدوجہد کر رہے ہیں،جو قربانیاں دے رہے ہیں،ان کا رزمیہ آہنگ فیضؔ کی شاعری کے رجائی اور غنائی لب ولہجہ میں محسوس کیا جا سکتا ہے"(۵۲)

فیض احمد فیض نے صرف لفظی بازی گری نہیں کی بلکہ انہوں نے دبے کچلے انسانوں سے اس قدر وفور سے پیار کیا اور اس قدر والہانہ شیفتگی سے اپنی محبوباؤں کو چاہا ایسا لگتا تھا کہ فیض خود اس موج خون سے گزر رہے ہیں۔فیض نے پوری دنیا کے محنت کش'مزدوروں اور مظلوموں کے دکھ درد کو اپنی روح کی گہرائیوں میں سمو لیا اور ان کو اپنا دکھ 'درد سمجھا'یہی دنیا کے دکھی انسانوں سے احساس یگانگت فیض کی شاعری کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

انسانیت کی خاطر کبھی فیض لیلائے وطن کے گیسو سنوارتے ہیں تو کبھی فلسطین کو اپنا وطن گردانتے ہیں یہاں پر رکے نہیں فیض آگے جا کر افریقہ کا روپ بھی دھار لیتے ہیں:

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ آجاؤ ایفریقا
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں افریقہ ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تُو ہوں، میری چال ہے تیری، ببر کی چال
آجاؤ ایفریقا
آؤ ببر کی چال
آجاؤ ایفریقا(۵۳)

میجر اسحاق نے لکھا ہے:

"اُن کے درد دل نے دنیا بھر کے اسیروں کے رنج و غم کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ کینیا کے لوگوں پر بے پناہ ظلم و ستم اور مصائب فیض صاحب کے لیے سوہان روح بنے ہوئے تھے وہ افریقی عورتوں کے کارہائے نمایاں سے خاص طور پر متاثر تھے کئی دفعہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ پاکستانی نہیں رہے افریقی بن گئے ہیں۔ اُن کی نظم "آجاؤ افریقہ" اس کی مظہر ہے۔ یہ افریقی حریت پسندوں کا ترانہ ہے جو مختلف افریقی ملکوں میں ڈھول کی تھال پر ایک مخصوص رقص کے ساتھ گایا جاتا تھا اس میں ولولہ ہے جوش ہے اور توانائی ہے "(۵۴)

فیض احمد فیض کی مشہور نظموں میں سے ایک نظم "بول تیرے لب آزاد ہیں" ہے اس نظم میں انہوں نے افریقی عوام کا حوصلہ بڑھایا ہے گویا فیض کے لیے سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے محبوب وطن میں خدا کا نام لے کر خدا کی مخلوق کا استحصال کیا جاتا ہے۔ فیض شیخ، ناصح، واعظ، اور زاہد کی اجارہ داری سے سخت نالاں، جو سادہ دل بندوں کو ورغلائے ہوتے انھیں حالات پر صابر شاکر رہنے یا بالفاظ دیگر ظلم سہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

گر یہ سچ ہے تیرے عدل سے انکار کروں؟
ان کی مانوں کہ تیری ذات کا اقرار کروں؟

"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" بھی فیض نے افریقی عوام کے لیے لکھی ہے۔ اس نظم کو پورے ہندوستان میں شہرت ملی یہ نظم اپنے حقوق کی بحالی کے لیے سامراج سے لڑنے والے افریقیوں کی پیٹھ پر ایک طرح کی تھپکی ہے تاکہ انھیں اپنی پنہاں صلاحیتوں کا احساس بھی ہو اور ان کے استعمال کا حوصلہ بھی آغا ناصر نے فیض کے حوالے سے اس نظم کا پس منظر بیان کیا ہے۔ ان کے بقول:

ایک بار اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں (فیض) نے کہا تھا کہ انگریزی اور دیگر سامراجی آزادی کی اس تند و تیز ہوا میں چراغ سحری کی طرح پھڑ پھڑا کے گل ہوگے۔ افریقہ اور ایشیاء میں آزادی کی لہر دوڑ گئی، افریقہ اور ایشیاء کے عوام جاگ اُٹھے سو ہم نے بھی لکھا تھا(۵۵)

فیض نے بارہا وضاحت کی کہ پاکستان میں جمہوریت، انصاف اور رواداری پر مبنی نظام کا قیام اور عالمی سطح پر استعماری قوتوں کی مزاحمت ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ بقول فیض:

"آج کی دنیا میں سنجیدہ ادیب کے لیے لازم ہے کہ وہ تمام سامراجی نسل پرست اور نو آبادیاتی قوموں کی مذمت کرے اور مشرق و مغرب میں ان تمام لوگوں سے محبت، احترام اور

> تعاون کا رشتہ استوار کرے جو آزادی اور بنیادی قومی اور انسانی حقوق کے لیے جد وجہد کر رہے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ وہ قلم سے سامراجی طاقتوں کے خلاف بند باندھ دے جو انسانیت کو تباہ کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ اپنے قلم کو ان قوتوں کا عَلم بنادے جو نوع انسانی کو عالم آزادی اور عالمی امن کی منزل سے ہمکنار کرنے کی کوشش کر رہی ہیں (۵۶)

فیض استعمار کے آلہ کار کبھی نہیں بنے فیض نے عالمی امن اور انسانیت کی آزادی کی خاطر قلم سے اور شاعری کے ذریعے استعماریت اور سرمایہ داری کا کھل کر مقابلہ کیا اور اپنی بساط بھر مزاحمت جاری رکھی' اسی کو وہ مجاہدہ نام دیتے تھے۔ اس خاطر فیض نے کلاسیکی استعاروں کا سہارا لیا لیکن ان میں گھسے پٹے معنی نہیں بلکہ عصری اور سماجی حالات وکیفیات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ یہیں سے فیض کا کمال ہنر کر نکھر کر سامنے آتا ہے۔ حسن جعفر زیدی کا کہنا ہے کہ:

> "انسانی تاریخ میں استعماری توسیع پسندوں اور اس کی مخالف قوتوں کے مابین جدل جاری ہے۔ اور جب تک ظالم و مظلوم موجود ہیں۔ یہ جدل جاری رہے گی۔ فیض کی شاعری کے استعارے جو ان قوتوں کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ وہ بھی اس جدل کے ساتھ زندہ رہیں گے۔ فیض کے کلام میں ظالم اور استعمار کے لیے پنجہ، اعداء، مقتل، قتل گاہ، بازوے قاتل، خزاں، صیاد، ستم گر، لشکر اغیار وغیرہ استعارے ہیں" (۵۷)

استعمار لوٹ کھسوٹ کر کے اپنی حکومت کے پھیلاؤ کا فلسفہ ہے۔ ان کا ہم وغم کمزور طاقت کے حامل ملکوں پر قابض ہو کر ان کی دولت' خزانہ اور اپنی بالا دستی قائم رکھنا ہے۔ اس حوالے سے برطانیہ پیش پیش رہا' اس کام میں برطانیہ کو کافی تقویت ملی' اس بارے میں ڈاکٹر اصغر کا کہنا ہے:

> "برطانوی سامراج، بیرونی حملہ آور ہونے اور لوٹ کھسوٹ پر مبنی ایجنڈے کی تکمیل کی حد تک تو آریاؤں سے لے کر درانیوں اور ابدالیوں کا پیر بھائی تھا لیکن صنعتی انقلاب کے جلو میں صارفین کی ۔۔۔ ہتھیانے، سرمائے کی بین الاقوامیت تلاشنے اور مملکت کی حدود میں سورج غروب نہ ہوسکنے کی ہوس نے انگریزی استعمار کو افقی اور عمودی ہر اعتبار سے جبر واستحصال اور بالادستی کے ایسے ہم پہلو زاویئے بہم کیے کہ پوری انسانی تاریخ میں باید وشاید کہنے کو اٹھارہوں، انیسویں اور بیسویں صدی کے ہم عصر فرانسی، اطالوی، ہسپانوی اور ۔۔۔ سماج بھی اس قدر انسانیت کش اور استحصالی تھے۔ لیکن توسیع پسندی کی اس بساط پر جو وسعت اور ہمہ گیری، سلطنت برطانیہ کو حاصل ہوئی کسی اور سامراجی قوت کے نصیب نہ ہو سکی" (۵۸)

فیض نے استعماریت کے خلاف مزاحمت کی اوراشتراکیت کا خیر مقدم کیا'استعمار کی بنیاد ظلم'جبر'دھوکہ اور سازش پر رکھی گئی ہے جبکہ اشتراکیت انصاف'برابری اور مساوات کی بات کرتی ہے اس وجہ سے فیض نے اشتراکیت کو گلے لگایااوردام'درہم اور سخنِ سرمایہ داریت اوراستعماریت اوراستعماری توسیع پسندی کا شدت سے اختلاف کیا۔

فیض کی شاعری میں سوشلزم کے تصورات کی روح کارفرما نظر آتی ہے یوں فیض کی فکر کا بنیادی محور سماجی و معاشی استحصال ہے۔ اس لیے وہ سرمایہ دارانہ نظام کو معاشرے کی تمام اقتصادی، اخلاقی اور سماجی بُرائیوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، فیض کی شاعری میں تصور استعمار اور استعمار کی مختلف جہتیں نظر آتی ہیں۔ لیکن صرف شاعر ہی کیوں پورے فیض کی تفہیم و تعبیر کے لیے ان کی شخصی تگ وتاز میں گندھی ہوئی سامراج دشمنی اور استعمار تک کے جملہ حربوں کے خلاف عملی جدوجہد کو بھی مانع رکھنا ہو گا کہ کسی پہلو سے شاعر محض نہیں تھے۔ استعماریت، عوام دوستی اور معاشی و معاشرتی مساوات ان کی شاعری اور کردار دونوں کا اختصاص تھے۔ سامراج کی تنقید فیض کے ہاں اپنی کلیت اور جاذبیت دونوں میں استقرار کرتی ہے[۵۹]

عالمی سامراج کی چیرہ دستیوں کو خوب خوب پہچانتے ہوئے تیسری دنیا کے افتادگانِ خاک کی اس طرح دل جوئی بھی کرتے ہیں۔

یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے'نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی[۶۰]

فیض کا تصور استعمار محدود تصور نہیں ہے ان کے مطابق سماج سے بین الاقوام تک ہر نوع کا استحصال'جبر اور ظلم قابل مذمت اور قابل گرفت ہے۔اس حوالے سے فیض خم گردن کو عَلم تو دوسری جانب خوں ریز ہاتھوں کو قلم دیکھنا چاہتے ہیں۔اس کے لیے جب تک تمام مظلوم افراد اُٹھ کھڑے نہیں ہوں گے کوئی کارآمد اور خاطر خواہ انقلاب نہیں آسکتا اس وجہ سے فیض اعلان بغاوت کا اعلان بلند کرتے ہیں کہ محمود وایاز ایک صف میں کھڑے ہونے سے بات نہیں بنتی'اس کے لیے عملی میدان میں اتر کر جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔اس حوالے سے فیض کی ایک نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کی مثال دے سکتے ہیں:

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے عَلم

اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے (۶۱)

فیض کی نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کا پس منظر بہت عجیب و غریب ہے۔ ایک امریکی سائنسدان جوڑے کے سویت یونین کے لیے جاسوسی کرنے کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی اور ان پر الزام یہ تھا کہ انھوں نے جوہری توانائی سے متعلق خستہ معلومات سویت یونین کو فراہم کی ہیں۔ فیض اس وقت جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے۔ فیض پر اس واقعے کا بہت زیادہ اثر ہوا اور انھوں نے یہ لازوال نظم لکھی آغا ناصر اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں: "یہ ایک آفاقی نظم ہے جو وقت، زمانے اور جغرافیائی حدود سے آزاد ہے۔ جب بھی اور جہاں بھی کسی مظلوم کو ناحق سولی پر لٹکایا جائے گا اس نغمہ کی گونج دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہے گی۔ سولی پر لٹکائے جانے والا پاکستان کا ذوالفقار علی بھٹو ہو یا ترکی کا عدنان میندریس یا لیبیا کا عمر مختار ان سب کی مدت تاریخ اور وقت کو ایک ہی پیغام دیتی ہے کہ مستقبل میں آنے والی نسلیں ہمیشہ عزم اور جہد مسلسل کے پرچم بلند کرتی رہیں گی" میجر اسحاق اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" روز بزرگ جوڑے کی بے مثال قربانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ یہاں وہ مرتے دم تک انسانیت کے مستقبل، انقلاب یا محبت ان سب کے ساتھ اپنی وفاداری جتاتے رہتے ہیں۔ اس نظم کی آفاقیت (Universality) عجیب و غریب ہے۔ اس نے صدیوں کو پاٹ کر ہر زمانے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے، ہر ملک کے شہیدوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ یہ نظم کربلا، پلاسی، سرنگاپٹم، مدکی، جھانسی، جلیانوالہ، قصہ خوانی، ملایا، کینیا، کوریا، تلنگاہ، مراکش، تیونس، سبھی سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ اور تہران، کراچی اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر دم توڑتے طلباء، مراکش، تیونس، کینیا اور ملایا کے خون میں لت پت مجاہد سب ایک ہی جان افروز نعرہ دہراتے سنائی دیتے ہیں"(۶۲)

فیض کی کاکمال یہ ہے کہ وہ ایک واقعہ کو دیکھتے ہیں 'تو اس واقعہ کو اپنے اندر جذب کر کے جزئی بات کیے بغیر ایک کلی بات کر جاتے ہیں یعنی ایک عام واقعہ سے بڑے نتائج نکالنے کا ہنر فیض جانتے ہیں 'جس کی وجہ سے فیض کی مزاحمتی شاعری ہنگامی نہیں ہوتی بلکہ عالمگیر ہونے کے ساتھ ساتھ دیرپا بھی واقع ہوئی ہے۔ آج بھی جہاں کہیں ظلم ہو تو فیض کی شاعری بیان کرسکتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ فیض کی شاعری زندہ شاعری ہے۔ انسان اور انسانیت کی شاعری ہے' گو کہ فیض کی شاعری انسانیت کی آواز ہے۔ ڈاکٹر تبسم شاکر کہنا ہے کہ "فیض آزادی اور انقلاب کے عالمی تصور کے داعی تھے۔ ان کا پیغام مقامی طور پر اپنے معاشرے اور اپنے ملک کے استحصال زدہ طبقوں کے لیے تھا اور ساتھ ہی عالمی سطح پر اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے ہر آدمی کی آواز ہے (۶۳)

فیض کا "پاکستان ٹائمز" کی ادارت سے لے کر "لوٹس" کی ادارت تک اور پاکستان کی جیلوں سے نظر بندی تک سماج اور خاص کر استعماری اور سامراجی معاشرہ مرکز نگاہ رہا۔ اس کی شاعری میں استحصال زدہ معاشرے کی عکاسی ہے تو دوسری جانب تیسری دنیا کا مجبور اور مقہور انسان کی تصویر بھی چھلکتی ہے۔

فیض کی نظموں میں سے ایک نظم "سپاہی کا مرثیہ" ہے یہ نظم ۱۹۶۵ء میں لکھی۔ یہ نظم کسی شہید ہونے والے سپاہی کی ماں کے دل کی آواز ہے۔

اب جاگو میرے لال
گھر گھر بکھرا بھور کا کندن
گھور اندھیرا اپنا آنگن
جانے کب سے راہ تکے ہیں

فیض سے جب پوچھا گیا یہ نظم آپ سے ویتنام کی جنگ میں ناکام ہونے والے سپاہیوں کے بارے میں لکھی ہے؟ تو فیض نے جواب دیا:

> بھئی یہ مرثیہ ہم نے پاکستان اور بھارت کی ۱۹۶۵ کی جنگ کے موقع پر لکھا تھا۔ یہ ایسے پاکستانی سپاہی کا مرثیہ ہے جس نے انتہائی خلوص اور جذبے کے ساتھ مادر وطن کے دفاع کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ رہی یہ بات کہ یہ مرثیہ ویت نام کے کسی "حریت پسند" کے لیے ہے تو شاید یہ بھی اتنی غلط بات نہیں ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ظلم و جبر اور بے انصافی جہاں بھی ہو گی، جس

مقام، جس ملک میں بھی بلا لحاظ رنگ و نسل، دین و مذہب، مظلوم عوام آواز اُٹھائیں گے اور جنگ کریں گے تو ہماری آواز ان کی آواز میں شامل ہو گی (۶۴)

فیض کی اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فیض آفاقی ذہنیت کے حامل شاعر تھے 'جو ایک سپاہی کے مرنے پر نظم لکھتے ہیں تو وہ پوری دنیا میں شہادت پر فائز ہونے والوں کے لیے نظم بن جاتی ہے۔بڑے تجربے سے بڑا شعر کہنا کمال نہیں 'کمال تو یہ ہت کہ تجربہ چھوٹا ہو لیکن شعر بڑا ہو۔فیض اللہ کی توفیق سے یہ ہنر بھی رکھتے تھے۔اس کی ایک زندہ مثال " سپاہی کا مرثیہ " ہے۔اس مرثیہ کے پس منظر میں بھی انسانی ہمدردی کار فرما نظر آتی ہے۔فیض کی ساری شاعری انسانی ہمدردی کے گرد گھومتی ہے۔اس حوالے سے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:۔

"فیض کو سامراج سے نفرت ہے۔سرمایہ داری اور جاگیر داری سے نفرت ہے۔گنے چنے انسانوں کے ہاتھوں کروڑوں انسانوں کے سفاکانہ استحصال سے نفرت ہے۔جبر اور ظلم سے نفرت ہے۔اتنی بہت سی نفرتیں جب اظہار پاتی ہیں تو شاعری میں چیخوں اور فریادوں سے کان پڑی آوازیں سنائی نہیں دیتیں، مگر فیض کے ہاں شور کی کوئی کیفیت ہے ہی نہیں۔دراصل ان سب نفرتوں پر فیض کی بنی نوع انسان سے محبت آسمان کی طرح چھا گئی "(۶۵)

فیض احمد فیض نے پاکستان کو من و عن قبول کیا لیکن فیض پاکستان کے قیام کے بعد کے حالات کا بغور جائزہ لیا تو " داغ داغ اجالا " دکھائی دیا جب دنیا میں نگاہ دوڑائی تو نو آبادیات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ نظر آیا تو فیض نے ملکی سطح پر آمریت کے خلاف مزاحمت کا علم بلند کیا وہاں پر استعماریت مخالف شاعری کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹے۔اس بارے میں مغرب سازش کرتا ہے اور میڈیا کے ذریعے اپنی بالا دستی قائم رکھنا چاہتا ہے 'انہی کارستانیوں کو فیض نے کمال زیرکی کے ساتھ ادراک کیا اور قارئین کو رہنمائی کی کہ کبھی بھی مغرب اور امریکہ کی سازشوں کا شکار نہ ہونا یہ لوگ دوسروں کا کندھا استعمال کر کے بندوق چلاتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر محمد سفیر اعوان کا کہنا ہے کہ "فیض کی شاعری اس عالمی مزاحمتی شاعری کا حصہ ہے جو مابعد نو آبادیاتی دنیا میں لکھی گئی اور وہ سرمایہ دارانہ نظام کی چالوں 'جو ذرائع ابلاغ اور تعلیم اداروں کے ذریعے کر رہا ہے 'کو ہدف تنقید بناتے ہیں ایک نظریاتی چیلنج پیش کرتے ہیں "(۶۶)

فیض احمد فیض اردو کے بڑے اور معتبر شعرا میں سے ہیں فیض احمد فیض کی شاعری جہاں رومانویت سے مملو ہے وہاں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے ناتے مقامی اور بین الاقوامی سطح کی سیاسی و سماجی نظام کے خلاف مزاحمتی اور احتجاجی رویہ بھی برابر ملتا ہے۔

تاریخ میں فلسطین کوایک خاص مقام حاصل ہے۔آسمانی کتابوں کے پیروکارعیسائی 'یہودی اورخاص طورپر مسلمان اسے قبلہ اول گردانتے ہوئے نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔جس قدر فلسطین کی اہمیت ہے اسی اعتبار سے سرزمین فلسطین تاریخ میں ہمیشہ مظلوم واقع ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے مسلمان شعرا کی شاعری کاایک اہم ترین موضوع فلسطین رہاہے۔فیض احمد فیض کی شاعری میں بھی فلسطین کے حق میں اور صیہونیت کے خلاف مزاحمتی شاعری بھی ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالغفور بلوچ اپنے ایک مضمون "مسئلہ فلسطین پر فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری اوراس کے اثرات میں لکھتے ہیں:

"یہ ایک روشن'تاریخ ساز اورناقابل تردید حقیقت ہے کہ" فلسطین" جسے انبیاء کرامؑ کی سرزمین اوراہل ایمان کے قبلہ اول'بیت المقدس ہونے کے سبب اسلام میں انتہائی تقدس اورادب واحترام حاصل ہے۔یہ ہمارے دینی اور ملی وجود کا جزولازم'جرات وشجاعت'عزیمت واستقامت'دلیری اورزندہ دلی کااستعارہ کاجذبہ حریت وفدائیت کی ایک مسلسل اورناقابلِ فراموش تاریخ اور مسلمانوں کے مزاحمتی ادب کاایک زندہ وتابندہ موضوع ہے"(۶۶)

فیض نے ظلم اور ظالم کاساتھ نہیں دیابلکہ مظلوم کے خیر خواہ رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری میں ایک معتد بہ حصہ فلسطین کے بارے میں ملتاہے'فیض کے لیے فلسطین دوسرا گھر ہے'وہ فلسطین کو بھی اپناوطن تصور کرتے ہیں۔

فیض احمد فیض سوتے جاگتے فلسطین کاخواب دیکھتے ہیں اور اس خواب کو حقیقت بناتے کی خاطر جدوجہد کررہے ہیں۔فیض کے نزدیک اہل فلسطین سرفروشیاں اور قربانیاں حریت بشر کی تاریخ کاسنہراباب ہے۔تمام آلام ومصائب کے باوجود ان کے عزم اور حوصلے جوان ہیں اور وہ سر سے کفن باندھے پتھر کاسہارالے کر دشمن کے مقابل صف آراء ہیں۔

فیض صاحب نے انھی مجاہدوں سے محبت اور اخوت کارشتہ جوڑااور بیروت میں تین سال تک گولوں کی بارش میں ان کے رفیق رہے۔ان کاحوصلہ بڑھاتے رہے اور فلسطینیوں کو بھی فیض سے اتنی انسیت ہوگئی تھی کہ وہ فیض کواپنوں میں سے سمجھتے تھے۔

جون ۱۹۶۷ءمیں فیض احمد فیض جب فیض کراچی میں تھے تو عرب اسرائیل جنگ چھڑ گئی'اس دوران یوں توفیض کی شاعری میں عموماً دھیمی ہوتی تھی'اچانک فیض کو عرب'اسرائیل جنگ کی وجہ سے جوش آیا۔یوں انہوں نے

ایک نظم "سر وادی سینا" لکھی۔ اس نظم میں میدان کارزار کی گھن گرج بھی سنائی دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا فیض میدان جنگ میں کھڑے ہو کر اپنے مجاہدین کو حوصلہ دے رہے ہیں اور اپنے دشمنوں سے رجز خوانی کر رہے ہیں۔

پھر رنگ پہ ہے شعلہ رخسار حقیقت

پیغام اجل دعوت دیدار حقیقت

فیض احمد فیض کی زندگی بڑی مصیبتوں کی حامل زندگی تھی' کبھی جیل' کبھی گھر میں نظر بندی تو کبھی جلاوطنی' مگر فیض نے حوصلہ نہیں ہارا۔ فیض ان تمام تر مشکلات اور مصائب کے باوجود محب وطن رہے۔ وہ غدار نہیں تھے البتہ ظلم اور ظالم کے مخالف ضرور تھے۔ جب فیض جلاوطنی اختیار کر کے بیروت پہنچے تو ایک طرف وطن کی یاد تھی' دوسری جانب بیروت میدان جنگ بنا ہوا تھا' اس جنگ میں فیض نے اپنے آپ کو فلسطینی ظاہر کیا اور فلسطین کو وطن قرار دیتے ہوئے فلسطینیوں کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ قیام بیروت نے فیض کو فلسطینیوں کے معاملات و مسائل سے بہت قریب کر دیا، بیروت کی دیگر شہرتیں اپنی جگہ لیکن مصر، شام، عراق اور دیگر ممالک کے جلاوطن شعراء کے لیے وہ ایک جنت سے کم نہیں تھا۔ شعراء یہاں مختلف الوطن ہونے کے باوجود خود کو متحد الخیال محسوس کرتے تھے۔

بیروت نگار بزم جہاں

ہر ویراں گھر' ہر ایک کھنڈر

ہم پایہ قصر دارا ہے

ہر غازی اشک سکندر

ہر دختر ہمسر لیلیٰ ہے۔۔۔

بیروت بدیل باغ جناں

ڈاکٹر محمد سفیر اعوان کا کہنا ہے کہ

"بالادستی اور استحصال کے خلاف فلسطین مزاحمت کا ایک استعارہ بن چکا ہے۔ غم میں لطف اندوز ہونے اور ظلم کے خلاف مکمل بے بسی دکھانے کے باوجود، فیض نے اپنی کچھ نظموں میں امید کا ایک بہت ہی مضبوط پیغام چھوڑا ہے۔ اس وقت وہ اقبال کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ جو وقت کے ظالموں کو چیلنج کرتے تھے۔ اور ان کے شکار افراد کو ظلم کے تاریک راستوں کے آخر میں روشنی کا مینار دکھاتے تھے۔ وہ عوام کو استعماری قوتوں کے خلاف جدوجہد کرنے پر آمادہ

کرتے ہیں۔ جب فیض اپنے محبوب کو مخاطب کرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس میں انقلاب کی تجسیم کر رہا ہے۔ جیسے محبوب کا آنا اور ملنا محب کے لیے سرشاری کا سبب ہوتا ہے۔ اس طرح انقلاب عوام میں امید پیدا کرتا ہے۔ اور قانون کی بالادستی کے لیے راستہ تیار کرتا ہے"(۶۷)

فیض نے مسئلہ فلسطین میں فلسطینیوں کی حمایت کی یہاں تک کہ دوران جنگ بیروت میں قیام پذیر رہے۔ اور دامِ سخنے فلسطینیوں کا ساتھ دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی ملاقات میں یاسر عرفات اپنے تاثرات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ "ایسا محسوس ہوا جیسے فیض ساری زندگی ہمارے درمیان موجود رہے ہوں' اورانہوں نے ہماری تمام صعوبتیں برداشت کہ ہوں اور جدوجہد کے تمام سالوں میں ہماری تمام امیدوں میں شریک رہے ہوں(۶۸)

فیض کو بیروت میں ادیبوں کی رفاقت نصیب ہوئی اور ایک دوسرے کو سننے اور سمجھنے کا موقع ملا' فیض کو عربی میں مہارت پہلے بھی تھی' اب بیروت میں ادیبوں کے ساتھ نشست و برخاست نے عرب اور عربی ادب سے اور قریب تر کر دیا۔ یوں فیض نے محمود درویش جیسے مزاحمتی شعرا سے راہ رسم بر قرار رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں کافی حد تک مماثلتیں دیکھی جاسکتی ہے۔ فیض جب تک بیروت رہے وہاں پر ادیبوں کی رفاقت کے حسیں لمحات بھی تھے لیکن اسی دوران میں جب بیروت جنگ کا میدان بنا رہا تو فیض بھی عرب شعرا کی صف میں شامل ہوتے ہوئے اسرائیل کی مخالفت اور فلسطین کی حمایت میں ایسی نظمیں لکھی' جن کو بہت حد تک شہرت اور پذیرائی ملی۔

بیروت پر حملہ صرف عرب' اسرائیل جنگ کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس کے پس منظر میں استعماری قوتیں کارفرما نظر آئیں گی۔ جو استعماریت کا پھیلاؤ چاہتی ہیں۔ آج دنیا کے کونے کونے' مشرق وسطیٰ' برصغیر پاک و ہند الغرض ہر جگہ استعمار کی جڑیں نظر آئیں گی جو ہمیشہ اس تاک میں ہوتی ہیں کہ کسی بھی وقت موقع ملے اور اپنی بالادستی قائم کرکے نو آبادیات وجود میں لائی جائے۔ اس حوالے سے عوام کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کہ استعمار کی چالیں بدلتی رہتی ہے مگر مقصد وہی رہتا ہے۔ ڈاکٹر محمد سفیر اعوان کا کہنا ہے کہ

"بالادستی اور استحصال کے خلاف فلسطین مزاحمت کا ایک استعارہ بن چکا ہے۔ غم میں لطف اندوز ہونے اور ظلم کے خلاف مکمل بے بسی دکھانے کے باوجود، فیض نے اپنی کچھ نظموں میں امید کا ایک بہت ہی مضبوط پیغام چھوڑا ہے۔ اس وقت وہ اقبال کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ جو وقت کے ظالموں کو چیلنج کرتے تھے۔ اور ان کے شکار افراد کو ظلم کے تاریک راستوں کے آخر میں روشنی کا مینار دکھاتے تھے۔ وہ عوام کو استعماری قوتوں کے خلاف جدوجہد کرنے پر آمادہ

کرتے ہیں۔ جب فیض اپنے محبوب کو مخاطب کرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس میں انقلاب کی تجسیم کر رہا ہے۔ جیسے محبوب کا آنا اور ملنا محب کے لیے سرشاری کا سبب ہوتا ہے۔اس طرح انقلاب عوام میں امید پیدا کرتا ہے۔اور قانون کی بالادستی کے لیے راستہ تیار کرتا ہے"(۶۹)

فیض احمد فیض نے اپنی شاعری میں فلسطین پر گریہ اورنہ ہی فلسطین کامرثیہ پڑھانہ ہی فاتحہ بلکہ فیض نے فلسطینی عوام کو حوصلہ دیا'امید دلائی اور کہا کہ ایک نہ ایک دن اللہ کا کیاہو اوعدہ پورا ہو گا جہاں مستضعفین حکمرانی کریں گے 'ظلم کا خاتمہ ہو گا اور عدل وانصاف کا ترازو نصب ہو گا فلسطینیوں کو چھینا ہو اوطن واپس ملے گا۔

ہم جیتیں گے
حقاہماک دن جیتیں گے
قد جاءالحق وزھق الباطل
فرمودہ رب اکبر(۷۰)

اپنی ایک نظم "فلسطینی بچے کے لیے لوری" میں فیض احمد فیض لکھتے ہیں:

مت رو بچے
رو رو کے ابھی
تیری امی کی آنکھ لگی ہے
مت رو بچے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابانے
اپنے غم سے رخصت لی ہے
مت رو میرے بچے۔۔
سارے اک دن بھیس بدل کر
تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے(۷۱)

فیض کی چند ایک نظمیں مجاہدین فلسطین اور مسئلہ فلسطین کے حوالے سے کی گئی عالمی مزاحمتی شاعری میں ایک تاریخ ساز حیثیت رکھتی ہیں جو کہ ناقابل فراموش ہیں۔ڈاکٹر نثار ترابی لکھتے ہیں:

"اردو ادب میں ترقی پسند تحریک نے دنیا بھر کے مظالم اور انسانی آزادی کے حوالے سے یادگار ادب تخلیق کر کے جہاں عالمی ادب کے وسیع تناظر میں اپنے حصے کا کردار ادا کیا ہے۔۔۔فیض انسانی دردمندی کے جذبے سے سرشار ایسے شاعر ہیں جن کی فلسطین اور تحریک آزادی فلسطین سے تعلق بہت سی جہتیں ہیں۔ان کی شاعری نظریاتی اور افادی موضوعات کے اعتبار سے بھی لائق تحسین اور اس میں جمالیات کی بھی ایک دنیا آباد ہے"(۷۲)

فیض احمد فیض کو فلسطین سے خاص قسم کی وابستگی تھی'ایک تو بحیثیت مسلمان فیض فلسطین کو قبلہ اول ہونے کے ناتے اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے'دوسرا یہ کہ فلسطین کی تاریخ میں ایک اہم کردار رہا ہے۔اور آنے والے دور میں بھی فلسطین اہم جگہ ثابت ہو گی جہاں پر پوری دنیا کی نظریں ہوں گی۔یہی وجہ ہے کہ فیض فلسطین کے مسئلہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں'بقول فیض"جب تک ایک فلسطینی باقی ہے۔فلسطین باقی ہے(۷۲)فیض نے فلسطینیوں کی عظیم جدوجہد اور قربانیوں کو دیکھتے ہوئے امید افزا ایک نظم لکھی'اس میں مظلوم و مقہور عوام کی فتح کی نوید سنائی ہے'یہ نظم " ویبقیٰ وجہ ربک" کے نام سے مشہور ہوئی۔"ویبقیٰ وجہ ربک میں اسی کثیر قومی کمپنیوں یا ان کے نام نہاد گرو امریکہ سے آزادی کی طرف ایک نئے سفر کے آغاز کی بات کی گئی ہے اور ایک تیقن ہے کہ جن اچھے دنوں کی آس میں افتادگانِ خاک ایک طویل خواب دیکھے چلے جا رہے ہیں وہ ضرور پورا ہو گا(۷۳)

فیض کی شاعری کی ایک خوبی یہ ہے انہوں نے"میں"کا لفظ استعمال کیے بغیر"ہم"استعمال کیے ہیں'ان سے یہ اندازہ لگانے میں اسانی ہو جاتی ہے انہوں نے انفرادی کم اور اجتماعی مسائل وافکار کو زیادہ بیان کیے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری میں انسانیت کا درد جا بجا ملتا ہے۔محمد حمید شاہد کا کہنا ہے:

آج تو دہشت دہشت کھیلنے کا زمانہ چل رہا ہے کہ اس کی آڑ میں نئی نئی منڈیاں تلاش ہو رہی ہے یوں دہشت منڈی کی چیز ہو کر بہت اہم ہو گئی ہے۔لہذا دوسروں کے قومی وسائل اور توانائی کے سرچشموں پر دھونس دھاندلی اور طاقت سے قبضہ کرنا جائز ہوا۔۔۔ایسے میں فیض کو یاد کرنا اور اس کی شاعری کو یاد کرنا جو سامراج پر کاری ضرب لگاتی ہے'کسی کی بھی پرواہ کیے بغیر'واقعی بڑے حوصلے کی بات ہے(۷۴)

جیسا کہ فیض اس انداز میں مزاحمت کرتے نظر آتے ہیں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے (۷۵)

فیض کی شاعری صرف آمریت کے گرد نہیں گھومتی بلکہ فیض کی شاعری ہر ظلم کے خلاف بر سر پیکار نظر آتی ہے۔"وہ (فیض) صرف اپنے دکھ غم کی نہیں' اجتماعی غم والم کی بات کرتے ہیں۔ فیض ایک دردِ دل رکھنے والا انسان ہے' جب وہ اپنے ارد گرد معاشرے میں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی نظر ڈالتے تھے تو وہ اپنے قلم کو ظلم کے خلاف بغاوت کے طور پر استعمال کرتے (۷۶) فیض احمد فیض کی شاعری میں استعماریت اور سرمایہ داریت کے خلاف مزاحمتی شاعری توانا صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ فیض نے نو آبادیات میں پسنے والے مجبور و مقہور عوام کی ترجمانی کی ہے' خاص کر فلسطین کی شاعری میں فلسطین کا غم بھی اتر آیا ہے' لیکن یہ بات نہایت ہی مستحسن ہے کہ فیض نے صرف استعمار اور صیہونیت کے مظالم کے حوالے سے غریب اور مظلوم عوام کا مرثیہ نہیں پڑھا۔ بلکہ ان کے مظالم کو روکنے کے لیے حوصلہ افزا اور امید افزا شاعری کی' استعمار و صیہونیت کا مکروہ چہرے سے نقاب اُٹھایا اور سوئی ہوئی قوم کو جگایا' صرف یہی نہیں بلکہ فیض کی شاعری ان مظالم کے آگے بند باندھنے بھی کسی حد کامیاب ٹھہری ہے۔

iii۔ مذہبی اجارہ داری اور ظاہر داری کے خلاف مزاحمت:

فیض احمد فیض مارکسی شاعر ضرور ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں مذہب سے اظہار بیزاری کیا ہو' فیض احمد فیض کو ابتدا سے ہی حافظ قرآن بننے کی آرزو تھی جو کہ تادم مرگ پوری نہ ہو سکی۔ فیض کی شاعری میں مذہب سے انسلاک کے کئی اشارے "و یبقیٰ وجہ ربک" جیسی نظموں میں ملتے ہیں۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں اگر شیخ' فقیہہ اور محتسب کے خلاف اگر باتیں ملتی ہیں تو یہ مذہب بیزاری کی دلیل نہیں بلکہ اگر طالب علمانہ نظر دوڑائی جائے تو فیض نے ان الفاظ و علامات کے ذریعے ظاہر داریت' منافقت اور وقتی مفادات کے پیچھے چلنے والوں کی حوصلہ شکنی کی اور ان کے دوغلاپن بہروپیے کو سامنے لانے کی کوشش کی ہیں۔ اشفاق حسین کا کہنا ہے کہ "جلاوطنی کے دکھ کے علاوہ فیض کے آخری سات برسوں کی شاعری میں تیسرا اہم موضوع اُن کے اپنے ملک میں بنیاد پرستی (Fundamentalism) کے خلاف ایک صدائے احتجاج بلند کرنا رہا ہے" (۷۷)

فیض احمد شخص کے مخالف نہیں رہے بلکہ وہ سوچ اور نظریے سے اختلاف کرتے رہے' فیض نے شدید طور سے ان آمر حکمرانوں کی شدید مخالفت کی اور مزاحمت پر شاعری کی جنہوں نے مذہب کا سہارا لے عوام کو اندھیرے

میں رکھ کر اپنا قبلہ درست رکھا۔مارشل لاء کے عہد میں مذہبی بنیاد پرستی کی ہوا چلنی شروع ہوئی تو فیض نے خداوندان مذہب پر کاٹ کرتے ہوئے کہا:

بنا پھرتا ہے ہر اک مدعی پیغام بر تیرا
ہر اک بت کو صنم خانے میں دعویٰ ہے خدائی کا
خدا محفوظ رکھے از خداوندانِ مذہب ہا
چلا پھر سوئے گردن کاروانِ نالہ شبہا(۷۸)

فیض احمد فیض دین کے خلاف نہیں ہے بلکہ فیض دین کا لبادہ اوڑھ کر دین کا چہرہ مسخ کرنے والے مفتیوں کے خلاف ہیں جنہیں دین سے صحیح آشنائی نہیں جو اپنے ذاتی اور مسلکی مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے آمریت کے دستر خوان کی ہڈیاں چباتے ہیں اور یہ کہ یہی نام ونہاد مفتی آمریت کے حاکم بنے رہنے کو جواز بھی فراہم کرتا ہے اور بے گناہوں کو خون میں غلطاں کرانے میں بھی انہی ظاہر پرست مفتیوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔البتہ یہاں وہ مفتی مراد نہیں جن کے دن اوررات اسلام کی تبلیغ میں گزرتے ہیں'جن کا اوڑھنا بچھونا اسلام ہوتا ہے'پیٹ نہیں ہوتالہذا فیض بھی ریاکار'مفاد پرست اورآمریت کی پشت پناہی کرنے والے مفتیوں کے خلاف کاٹ کرتے ہوئے مزاحمتی شاعری کرتے نظر آتے ہیں تاکہ معاشرے سے مذہبی اجارہ داری کا خاتمہ ہو'ریاکاری کا قلع قمع ہوسکے'اور یہ کہ اسلام کا اصل چہرہ لوگوں کے سامنے آشکار ہوسکے۔فتح محمد ملک کا کہنا ہے:

”فیض کے لیے سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے محبوب وطن میں خدا کا نام لے کر خدا کی مخلوق کا استحصال کیا جاتا ہے۔فیض شیخ، ناصح، واعظ، اور زاہد کی ٹھیکیداری سے سخت نالاں، جو سادہ دل بندوں کو ورغلائے ہوتے انھیں حالات پر صابر شاکر رہنے یا بالفاظ دیگر ظلم سہنے کی تلقین کرتے۔۔فیض بھی خاصانِ زمین کی حکمتِ فرعونی اور مفتی دین کی پیروی کذب وریا کے خلاف بغاوت کا درس دیتے ہوئے دل کو مصفا دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں۔انہیں یقین ہے کہ لوح دل مصفا ہوتے ہی اس پر سے ظل الٰہ کی اطاعت کا صدیوں پرانا نقش محو ہو جائے گا(۷۹)

اس حوالے دے فیض کے یہ اشعار قابل دید ہیں:

پھر دل کو مصفا کرو'اس لوح پر شاید
مابین من وتو نیا پیماں کوئی اُترے

اب رسم ستم حکمتِ خاصان زمین ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتی دیں ہے (۸۰)

فتح محمد ملک اس جملہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فیض نے مذہبی ظاہر داری کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔ یہ روایت طول تاریخ سے چلتی آئی ہے کہ ظالم وجابر نے اپنے ظلم کی تائید کے لیے درباری ملا پال رکھے تھے' جن کے فتوؤں سے کئی بے گناہ تختہ دار تک جا پہنچے' فیض کو اپنے دور میں بھی ایسے مفاد پرست مفتی نظر آئے جو ستم کی تائید کرنے میں پیش پیش رہے' اس صور تحال کو دیکھتے ہوئے فیض نے انکار کے فرمان کے اترنے کی آرزو کی جیسا کہ فیض کا یہ شعر ملاحظہ ہوں:

اب صدیوں کے اقرار اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرمان کوئی اترے (۸۱)

دین اور مذہب کی تعلیمات یہی سکھاتی ہیں کہ آپس میں پیار و محبت سے زندگی گزاریں' ایک حدیث کا مفہوم بھی یہی ہے کہ دین محبت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ھل الدین الا الحب ؟ فیض احمد فیض نے اشتراکی پلیٹ فارم سے ظلم کے خلاف مزاحمتی شاعری کی۔ فیض احمد فیض ترقی پسند تھے لیکن ترقی پسند کا مطلب نہ دین سے بیزاری ہے اور نہ عشقیہ شاعری کی مخالفت ہے مذہب کے ساتھ ان کا تعلق تو بچپن سے تھا سات سال کی عمر میں وہ اپنے والد کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے جاتے ہیں اور نماز کے بعد وہ معمول کے مطابق درس بھی سُنتے تھے ور ایم اے کے دوران نیلا گنبد کے مدرسہ میں مفتی محمد حسین سے درس کا کورس بھی انہوں نے مکمل کیا اور وہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ، سیّد سلیمان ندویؒ اور سیّد عطاءاللہ شاہ بخاریؒ سے بے حد متاثر تھے اس لئے ان کے رجحانات شریعت اور طریقت کی طرف مائل تھے، انہوں نے انسان دوستی کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر ہمیشہ ظاہر پرستی، تعصب، نفرت اور ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد کی اور مزدور کسان اور عام آدمی کے تصور کو ابھارا۔

ظلم و جبر کے خلاف بولنے کو صرف اشتراکیت والے نہیں کہتے بلکہ بلکہ اسلام بھی ظلم کا ساتھ دینے والے کی سخت مذمت کرتا ہے یہاں تک کہ ظالم کی طرف مائل ہونے اور معمولی جھکاؤ سے بھی آیت قرآنی منع کرتی ہے۔ ولا ترکنو الی الذین ظلموا فتمسکم النار اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے اپنے دونوں فرزندوں حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا کونا للظالم خصماً وللمظلوم عوناً میرے بیٹو! تم دونوں ظالم کے خلاف اور مظلوم کی حمایتی بن کر رہنا' حدیث میں یہ بات بھی آئی ہے کہ سلطان جابر کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر بات کرنا بھی عبادت ہے'پس ظلم واستحصال کے خلاف آواز ہر قوم اٹھاتی ہے'بحیثیت مسلم ہمارا بھی فریضہ بنتا ہے کہ ہر فورم پر ظلم کے خلاف بولتے رہے تاکہ معاشرہ میں امن وسکون قائم ہو'اگر معاشرہ میں ظلم کا چلن رہے گا توبقول حضرت علیؓ وہ معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔

فیض احمد فیض کے دور میں کئی آمر گزرے ان میں سے ضیاء الحق نے ایک خاص مسلک کو لے کر ذاتی مرضی چلائی ملک کا کوئی پرسان حال نہ تھا اس دور میں فیض احمد فیض میدان میں اترے اوریوں انہوں نے علامتی اور براہ راست پیرائے میں ظلم کی قلعی کھولتے رہے۔ آمریت کا سیاہ چہرہ لوگوں پر آشکار کیا۔ آغا ناصر کا کہنا ہے کہ:

"مارشل لاء کے قوانین میں بڑھتی ہوئی شدت اوراہل اقتدار کی بنیاد پرستی کی پالیسی نے ساری قوم کو دشت زدہ کر دیا تھا۔ دائیں بازو کی جماعتوں اور فوجی حکمرانوں کے گٹھ جوڑ نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ نہ کوئی دادرسی کرنے والا تھا نہ آہ وزاری سننے والا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مذہب کے نام پر ہر جور ہر ستم روا سمجھا نے لگا تھا"(۸۲)

اس دور کو دیکھتے ہوئے فیض احمد فیض کو کہنا پڑا:

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوف خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیال روز جزا گیا
جو نفس تھا خار گلو بنا، جو اٹھے تھے ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاط آہ سحر گئی، وہ وقار دست دعا گیا(۸۳)

فیض مذہب کے نام پر اس استحصال کے خلاف ہے۔ خود ان کی شاعری مزاحمتی ادب میں اس مقام پر انقلابی شاعری کا سرنامہ قرار پاتی ہے۔ اسلام امن چاہتا ہے'اورامن کا پرچار کرتا ہے لیکن ضیاء الحق نے جوراہ اختیار کی وہ اسلام کی تعلیمات سے کہیں دور ہے۔

"جنرل ضیاء الحق نے جوراہ اختیار کی وہ ظلم وجبر اورزبردستی کی راہ تھی۔ وہ جو قانون بنانا چاہتے بنالیتے اور بعد میں اپنے مخصوص ہم خیال علماء کے ٹولے سے اس کے اسلامی ہونے کی سند حاصل کر لیتے۔ اس میں نہ ان کو اسلامی اصولوں کا پاس تھا نہ عالمی انسانی حقوق کا۔ اپنی بات منوانے کے لیے اوراپنی طاقت بڑھانے کے لیے انہوں نے ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین میں اپنی پسند ترمیمات کرلی تھیں اور مارشل لا کا سہارا لے کر ملک میں ملٹی سمری عدالتیں قائم کر دی تھیں۔ جہاں

چھوٹے درجے کے فوجی آفیسر اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور طرح طرح کی سزائیں دیتے تھے سیاسی کارکنوں کو اور صحافیوں کو سرعام کوڑے لگائے جاتے تھے "(۸۴)

فیض دین کے مخالف نہیں تھے' اگر انہوں نے مخالفت کی ہے تو دین کے نام پر استحصال اور اجارہ داری کی مخالفت کی ہے' اگر فیض ظلم کے خلاف اور مظلوم کا ساتھ دیتے ہیں تو ان میں ان کا ایک دینی پس منظر بھی ہے' جن کے استاد میر حسن جیسے رہے ہوں وہ دین سے بیزاری کیسے کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فیض' حق کے طلب گار رہے' باطل کے مقابلے میں سینہ سپر رہے' ظلم کو ظلم کہہ دیا اور حق کو حق کہنے کی جرات بھی فیض میں بصورت اتم موجود تھی جیسا کہ فیض کا کہنا ہے:

طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلبگار
باطل کے مقابل میں صداقت کے طلبگار
انصاف کے' نیکی کے' مروت کے طرفدار
ظالم کے مخالف ہیں تو بیکس کے مددگار
جو ظلم پہ لعنت نہ کرے، آپ لعیں ہے'
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکر دیں ہے (۸۵)

ضیاء الحق نے سرعام کوڑوں کی سزا دی' تو اعتراض کیے جانے پر ضیاء الحق نے کہا کہ یہ سزائیں اسلامی شریعت نہیں مارشل لاء کے قوانین ہیں الغرض مذہب کے لبادے مذہب کا نام لے لیتے ہوئے ظلم و جبر روا رکھا گیا۔ بقول ظفر اقبال "وہ (فیض) ایسے ملاؤں سے بھی نالاں تھے جو مذہب کے نام پر لوگوں کی زبان بندی پر معمور تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ لوگوں کی مذہبی عقیدت مندی کو بھی ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا(۸۶) اس صورتحال کو فیض نے ملاحظہ کیا تو فیض سے رہا نہ گیا فیض آمریت کی قلعی اپنی ایک نظم "ستم سکھلائے گا رسم وفا ایسے نہیں ہوتا" میں ان الفاظ میں کھولتے ہیں:

ستم سکھلائے گا رسم وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہ خدا ایسے نہیں ہوتا
گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کی مقتل میں
مرے قاتل حساب خوں بہا ایسے نہیں ہوتا

جہانِ دل میں کام آتی ہیں، تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمانِ تسلیم ورضا ایسے نہیں ہوتا
ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا
رواں ہے نبضِ دوراں، گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا(۸۷)

اردو شاعری میں شیخ'شیخنا'ملا'مفتی اور فقیہہ جیسے الفاظ کا چلن کلاسیکی شاعری سے چلتا آیا ہے۔ان علامات کے ذریعے سے ظاہر داری'مفاد پرستی اور منافقت کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی ہے۔"اردو اور مشرقی زبانوں کا ایک معتوب کردار ملّا یا قدیمی مولوی رہا ہے۔اسی قبیل کے کردار منصف، خطیب، فقیہ شہر، واعظ، محتسب، ناصح، شیخ، زاہد، قاضی، پیر فقیر اور شیخ حرم کے اہم کرداری اجزاء شاعری کی زینت ہیں"فیض احمد فیض کی شاعری میں بھی شیخ اور مفتی جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔فیض نے ملائیت کی بھرپور انداز میں مزاحمت کی ہے کہ یہ کردار آمریت کے دستر خوان کا نوالہ کھا کر بے گناہوں کی زندگی کی شمع گل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔آمریت کو استحکام انہی کرداروں سے ملتا ہے۔فیض عصری اور سماجی شعور رکھتے ہوئے ان کی ظاہر داری سے پردہ چاک ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

گرجے میں بہت شیخ سرگوشتہ منبر
کڑکے ہیں بہت اہل حکم بر سر دربار
فقیہہ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں
شیخ صاحب سے رسم وراہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی(۸۸)

وہ منصف کو بہت سے مقامات پر جلی کٹی سناتے ہیں۔

مٹ جائیگی تو انصاف کروگے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

آج کے دور میں اس طبقہ منجمدہ نے لوگوں کو اپنے تابع بنا کر آخری چٹان، ڈرامے کا کردار بنانے کی ٹھانی، تو ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ اس راہ نما واعظ طبقے کو فارسی روایت زندہ کرتے ہوئے آئنہ دکھایا جائے۔ اس دبستان شاعری میں فیض کار آمد ہے۔ جس نے ملّا کو منصور کے مقابل لا کھڑا کیا۔ اس لحاظ سے فیض کی شاعری آج کی شاعری ہے۔ اور طبقہ واعظ و ناصح نے نئے انداز سے پتھر سہنے ہیں۔ فیض، سرِ وادی سینا" میں خم ٹھوک کر نئے اوامر و نواہی لے آتے ہیں [۸۹] فیض اس انداز میں ملا کو مخاطب ہوئے ہیں:

سنو کہ اس حرف لم یزل کے
ہمیں تمہیں بندگان بے بس
علیم بھی ہے خبیر بھی ہیں
سنو کہ ہم بے زبان و بے کس
بشیر بھی ہے نذیر بھی ہیں

فیض کی شاعری میں ایک لفظ "ناصح کا ملتا ہے جس کے ذریعے بھی فیض نے ریاکاری پر کاٹ لگائی ہے۔" فیض نے اس ریاکار طبقے کے دو عملی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا مگر الفاظ دل کش استعمال کیئے۔ ان کا رقیب بھی دشمن ہیں بلکہ شریک غم دوست ہے۔ اس طرح ناصح ان کا علامتی کردار ہے جو انھیں سرشاری اور سرفروشی سے منع کرتا ہے [۹۰] بقول فیض:

جو تمھاری مان لیں ناصحا تو رہے گا دامن دل میں کیا
نہ کسی عدو کی عداوتیں نہ کسی صنم کی مروتیں

فیض کی شاعری میں عدو سے دشمنی اور صنم کی مروت تادم آخر جاری وساری رہی۔ فیض کی شاعری ایک طرف جبر اور گھٹن کی فضا کے حوالے سے مزاحمت کر رہی ہے تو دوسری جانب ظاہر داری اور وقتی مفاد کے حصول میں اپنی شخصیت داؤ لگانے والوں کی قلعی بھی کھولتے نظر آتے ہیں۔

واعظ ہے نہ زاہد ہے ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہو گی
ہے انتظار ملامت میں ناصحوں کا ہجوم
نظر سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے

لہذا فیض کی شاعری میں ناصح، فقیہ شہر، محتسب اور شیخ جیسے کرداروں سے معاشرے میں موجود ان کے تشخص کو خراب کرنا نہیں ہے 'بلکہ ان کرداروں کو اپنی شخصیت کی اہمیت و مقام کو اجاگر کرنا مقصود ہے۔ ایک معاشرے میں ان کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے 'فسد العالِم فسد العالَم اگر عالم فاسد ہو جائے تو ایک پورا عالَم فاسد ہو جاتا ہے۔ اس لیے اپنے مقام و مرتبے کو سمجھتے ہوئے ارباب اقتدار کی کاسہ لیسی ان کے لیے اچھی نہیں ہوتی۔ مزید بر آں فیض کی شاعری ان الفاظ کی آمد کو سیاسی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے تب جا کر ان الفاظ کی معنویت سامنے آسکتی ہے۔

محتسب کی خیر اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام

شیخ سے رسم و راہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

ہوتی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سر کوئے یار گزری ہے

فقیہ شہر سے مے جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

برہمن کا کرم وہ عطائے شیخ حرم
کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی ہے

فیض منافقانہ رویوں پر بھی کبھی کبھار طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ حضرت ناصح کو اگر عیب نکالنے کا ہنر آتا ہے تو تنقید کو برداشت کرنے کا جگر بھی رکھنا ہو گا۔ فیض اس حوالے سے خوبصورت اشعار کہتے ہیں:

ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے

رقص مے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو
سوئے میخانہ فقیہانِ حرم آتے ہیں

دلداری واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رند خرابات ولی ہے

خالی ہیں گرچہ مسند و منبر نگوں ہے خلق
رعب قباء ہیبت دستار دیکھنا

فیض وہ صوفی ہے جو چلہ گاہ میں چلا کاٹتے نہیں بیٹھا' رہبانیت کی وجہ سے انہیں صوفی کا مقام نہیں ملا' بلکہ فیض مجاہدہ سے صوفی بنا ہے' بقول اشفاق احمد "انہوں نے صوفیا کا تیسر اراستہ اختیار کیا ہے جو مجاہدے پر محیط ہے "(۹۱) اور اس کی ریاضت انسانیت کے گرد گھومتی رہی' اسی سے فیض کو نروان حاصل ہوا اور سنت منصور کو ادا کرنے والوں میں اپنا نام بھی شامل کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ "فیض کو ملامتی صوفی لکھا جاتا ہے۔ انھوں نے بھی اس پاپائیت سے جنگ کا فیصلہ منصور کے حق میں دیا ہے (۹۲) جیسا کہ فیض کا کہنا ہے:

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

یوں فیض احمد فیض کی شاعری میں ظاہرداریت کے خلاف بھی مزاحمتی شاعری دیکھی جاسکتی ہے۔ ظاہرداریت کے مزاحمتی شاعری کے لیے محتسب' فقیہہ' شیخ اور مفتی جیسے مذہبی کردار کا سہارا لیا۔ یہ الفاظ اگرچہ کلاسیکی اردو شاعری کے لفظیات ہیں لیکن فیض احمد فیض نے ان الفاظ کے ذریعے مولویوں کے ہاتھوں عوام کے استحصال پر کاٹ کیا وہاں مذہبی لبادے میں ظلم و جبر کی حکومت قائم کرنے والے بنیاد پرست لیڈروں پر کڑی تنقید کی ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین کا کہنا ہے: "فیض کی شاعری میں ایک روایت قیس کی ہے تو دوسری منصور کی" ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے" فیض نے ان دونوں روایات کو اپنی شاعری میں کچھ اس طرح سمو لیا ہے کہ ان کی شاعری بذات خود ایک روایت بن گئی ہے "(۹۳)

iv۔ سماجی اور طبقاتی استحصال کے خلاف مزاحمت:

فیض احمد فیض فکر و شعور کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبات' احساسات کے ساتھ ساتھ جمالیات اور جلالی انداز بیان سمیت انسانی فکر اور سوچ کو مہمیز دینے والے عناصر بھی موجود ہیں۔ اور یہ چیزیں شاعری میں تب آسکتی ہیں جب شاعر کو اپنے سماج' عہد اور زمانے کا شعور ہو' فیض احمد فیض کا شمار بھی ان نمائندہ شعراء میں ہوتا ہے جنہوں

نے اپنے عہد 'اور سماج کا شعور حاصل کرتے ہوئے اپنے عہد اور سماج کی ترجمانی کی اور ماضی اور حال کا تجزیہ کرتے ہوئے بہتر مستقبل کے لیے بھی رہنمائی دی ہے۔ڈاکٹر محمد امین کا کہنا ہے:

> فیض نے اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کو بر قرار رکھا لیکن علامتوں کو نیا مفہوم دیا اور نئے تناظر میں تراکیب وضع کیں۔ فیض کی شاعری میں نقش فریادی سے لے کر مرے دل مرے مسافر تک کے سفر میں فیض کے سماجی شعور میں ارتقا نظر آتا ہے۔ فیض کا سماجی شعور انفرادی احساس سے طبقاتی شعور تک 'طبقاتی شعور سے وطن کی محبت تک اور وطن کی محبت سے ایک انسان دوست عادل عالمی معاشرے پر منتج ہوتا ہے۔۔۔ سماجی شعور سے مراد حال کے معاشرتی حالات وواقعات کا ماضی کے تناظر میں ایسا منطقی تجزیہ ہے جو مستقبل کی تبدیلی کا محرک بنے جس سے بہتر معاشرہ وجود میں آسکے سماجی شعور کا مرکز مستقبل کی تبدیلی ہے (۹۴)

فیض احمد فیض شاعری کو مجاہدہ قرار دیتے ہیں یہ صرف قول کی حد تک نہیں کہا بلکہ فیض عملی میدان میں بھی اپنے نظریے سے پیچھے نہیں ہٹے اور یوں مظلوم ومقہور اور سماجی اور طبقاتی استحصال کی چکی میں پسنے والے لوگوں سے دلی اور گہری وابستگی رکھی اور ایک منصف کی حیثیت سے شاعری کرتے ہوئے خیر کی آبیاری اور شر کی بیخ کنی کرنے میں مصروف عمل رہے۔

ہم نے ان پر کیا حرف حق سنگ زنی
جس کی ہیبت سے دنیا لرزتی رہی
جن پر آنسو بہانے کو کوئی نہ تھا
اپنی آنکھ ان کے غم میں برستی رہی
دکھ بھری خلق کا دکھ بھرا دل ہیں ہم
طبع شاعر ہے جنگاہ عدل وستم
منصف خیر وشر 'حق وباطل ہیں ہم

فیض احمد ابتداء میں فلسفہ ، رومانیت کا ترجمان شاعر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کی رومانیت استحصالی سماج میں عروضی حالات کے جبر کے خلاف جنم لینے والا فلسفہ ہے جس کے ترجمان کی ایک لڑی سچے عشق کی جستجو میں گمشدگی جنت کو منزل بنا کر ماضی کے بین کرتی ہے۔" کارل مارکس اپنی ابتداء میں اسی لڑی میں پرویا ہوا پھول ہے۔ مارکس کی نثری تحریریں

رومانیت کا نمایاں پہلو رکھتی ہے "مارکس کی نظمیں تو رومانوی بنیاد کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ایسے کمیونسٹ مینی فیسٹو کی تخلیق کے بعد بھی مارکس نے کہا تھا کہ انقلابی کا رومانوی ہونا ضروری ہے "(۹۵)

یہی ترقی پسند رومانیت ہمیں فیض میں ملتی ہے جو بغاوت کو جنم لیتی ہے۔اسی میں فیض کی جلترنگ کی طرح بجتی ہوئی شاعری، ایک طرف عشق، عورت اور مرد کا زمینی عشق تخلیق کرتی ہے تو دوسری طرف طبقاتی سماج اور سامراج کے خلاف جدوجہد اسی عشق کی پہچان قرار دیتی ہے۔

فیض احمد فیض کی شاعری کا آغاز رومانویت سے ہوا البتہ جب فیض کی نظر دکھی لوگوں کی طرف پلٹتی ہے تو فیض غم جاناں سے غم روزگار میں محو ہو جاتے ہیں اور یوں محبوب سے پہلی سی محبت نہ مانگنے کی استدعا کرتے نظر آتے ہیں۔

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ (۹۶)

فیض احمد فیض کی شاعری رجائی شاعری ہے وہ وطن میں انقلاب کے خواہاں تھے'قید سے رہائی سے پہلے بھی وطن میں تبدیلی کا سوچا تھا لیکن وہی خزاں کا موسم ہی دیکھنے کو ملا'جلاوطنی کے بعد وطن واپسی میں بھی کوئی خاص تبدیلی لوگوں میں نہیں دیکھی'لیکن فیض نے اپنی شاعری کی اس انداز میں تشکیل کی ہے کہ معاشرہ میں امن وچین کی فضا قائم ہو'جہاں سے استحصال اور طبقاتی تفاوت کا خاتمہ ہو یہی چیزیں فیض کو بڑا شاعر بنا دیتی ہیں۔"وہ ایک ایسے وطن کو خواہش کرتے ہیں جہاں ایک ایسا معاشی'معاشرتی اور سیاسی نظام کیا جائے جس میں جبر واستحصال نہ ہو'محبت کی توقیر'آزادی اظہار ہو اور اہل وطن خوشحالی'تعلیم اور صحت مندی سے بہرہ ور ہو"(۹۷)

فیض کی شاعری میں انسانی اقدار کا رنگ نمایاں ہے۔دنیا میں جہاں کہیں طبقاتی تقسیم ہو'استحصال ہو'سماج میں معاشی جبر ہو ان تمام مسائل کو فیض نے اپنا موضوع سخن بنایا۔فیض کی شاعری میں انہی لوگوں کے درد اور کرب کی

کسک محسوس کی جاسکتی ہے۔ فردوس احمد میر کا کہنا ہے کہ:"فیض احمد فیضؔ(۱۹۱۱ئ۔۱۹۸۴ئ)عہد حاضر کے معتبر، ممتاز اور منفرد شاعر ہیں جن کے اثباتی نقطہ نظر نے استحصالی قوتوں کے خلاف بھرپور احتجاج کیا"جیسا کہ فیض کا کہنا ہے:

ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی فکر کو پس منظر کے طور پر اخذ کیا یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری کئی مقامات پر قرآن و حدیث کا اردو ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔اقبال نے جو نظریہ معیشت دیا وہ بھی اسلامی نظریہ حیات پر مبنی معیشت کا نظریہ دیا۔جب بات فیض احمد فیض کی جائے تو فیض سر تا پاؤں ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے'یہی وجہ ہے کہ فیض کے نظریہ معیشت اور نظریہ حیات دونوں مارکسیزم کو اساس بناتے ہیں۔

"فیض کے ہاں سوشلزم کی جو جڑیں ملتی ہیں وہ مارکسزم سے پھوٹتی ہیں'وہ خون خرابے کے ذریعے سے مقصد حاصل کرنے کی بجائے چین کے مخصوص فلسفہ انقلاب یعنی ارتقاء کے طریقوں سے یہ مقصد حاصل کرنے کے خواہی ہیں۔ان کا اولین تجربہ محبت والفت ہے اس لیے وہ ہر اس راستے کے خلاف ہیں جس پر انسانیت کا خون بہایا جاتا ہو۔یہی وجہ ہے کہ اپنی شاعری میں مزاحمتی وانقلابی اظہار رومانویت کے پیرائے میں کرتے ہیں"[۹۸]

ان کی ایک اور نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" بھی اس پسے ہوئے انسان کی شرگزشت ہے۔ جو زمانے کے استبداد کے سیل رواں اور تھپیڑوں کی زد میں ہے۔ یہاں انھوں نے اس تھکے ہارے اور مظلوم اانسان کو کانچ کے مانند کر دیا ہے۔ جس پر چاروں طرف سے استحصال اور جبر کے پتھروں کی بارش ہے۔

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

کیا آس لگائے بیٹھے ہو

فیض کی نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" بوژرواور پرولتاریہ طبقوں میں ازلی تصادم اور کشمکش کو بیان کر رہی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ فیض نے اپنی بہت سی نظموں میں سرمایہ دارانہ استحصال 'طبقاتی استحصال 'سماج کی محرومی اور بیگانگی کی کیفیات کو انتہائی مضبوط 'واضح اور شائستہ انداز میں بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ استحصالی قوتوں اور طبقاتی نظام کے خلاف مزاحمتی رویہ اپناتے ہوئے انقلاب کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اس حوالے سے فیض کی نظم "انتساب سے لے کر "کتے "تک کئی نظمیں انقلابیوں کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔

فیض کی شاعری میں صرف محبت ورومانویت نہیں ہے بلکہ وہ اقبال کی طرح پیغام کے شاعر ہیں۔ انہوں نے بامقصد شاعری کی'ان کی شاعری میں سیاسی شعور کے ساتھ سماجی شعور کی بھی کارفرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ فیض سماج میں طبقاتی اوراستحصالی نظام کے خلاف رہے ہیں اوراجتماعی انصاف کے طلبگار رہے ہیں ڈاکٹر محمد آصف اعوان لکھتے ہیں:

> فیض نے معاصر سیاسی صورتحال کی منظر کشی ہی نہیں کی بلکہ سماجی وطبقاتی کشمکش میں مبتلا عوام کے دکھ اور کرب کو بھی موضوع سخن بنایا۔ انہوں نے مزدور طبقہ کے افلاس کی نظری سطح پر بھی ترجمانی کی اور عملی طور پر بھی مزدوروں کے حقوق کی پذیرائی کے لیے سرگرم عمل رہے۔ فیض کی فکری اقلیم میں احساس محرومی کے خلاف احتجاج اور ظلم وجبر کے خلاف بغاوت کو بنیادی خصائص کی حیثیت حاصل ہے۔(۹۹)

سرمایہ داریت نے پوری دنیا کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ اس سے بڑھ کر عالمی منڈی کی تلاش کی خاطر سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ملکوں نے نو آبادیات قائم کئے اور پھر مقامی چند لوگوں کو استعمال کر کے نو آبادیاتی ملکوں کا استحصال کیا جاتا رہا' قابض نو آبادیات کے ملازم پیشہ نو آبادکار بھی استعمار کے ایجنٹ بن کر چند سکوں کے عوض اپنا ضمیر بیچ کر استعمار کی کاسہ لیسی کرتے ہیں' نتیجے میں تیسری دنیا کے لوگ غریب سے غریب تر ہوتے چلے گئے' فیض ان حالات سے بخوبی آگاہ تھے وہ عصری 'سیاسی 'اور سماجی شعور کے مالک انسان تھے۔ لال خان اپنے ایک مضمون "فیض کون تھے" میں لکھتے ہیں:

> "آزادی کی راہ میں جہاں سرمایہ دارانہ سیاسی نظام اور طبقاتی نظام رکاوٹ تھا۔ وہیں نو آبادیوں کا مقامی مقتدر طبقے اور پھر ان نو آبادیوں کے آزاد ممالک کے طور پر وجود میں آنے کے بعد بننے والے حکمران بھی ایک بڑی رکاوٹ کے طور پر سامنے آئے تھے۔ پاکستان بھی آزادی کے بعد بہت دنوں تک اس آمریت پسند قوتوں سے محفوظ نہ رہا۔ اور محض ڈیڑھ سال کے بعد اپنی اپنی

انا کے خولوں میں بن مختلف قسم کے جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ پس منظر رکھنے والے مفاد پرست طبقہ اقتدار کی صف میں شامل ہو گیا"(۱۰۰)

فیض نے جب عالمی استعمار کے اشارے پر چلنے والوں کو قریب سے دیکھا تو فیض نے سماج میں طبقاتی اور معاشی استحصال کے خلاف آواز اٹھائی'ارباب اقتدار کو ان کا یہ رویہ پسند نہیں آیا تو فیض کی آواز کو دبانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال میں لائے'لیکن فیض خون دل میں انگلیاں ڈبو کر'پرورش لوح و قلم میں مصروف عمل رہے۔اور انقلابیوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔یوں فیض نے امید دلائی اگر آج ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں تو ایک دن آئے گا انشاء اللہ خلق خدا راج کرے گی اور آمریت کے ساتھ سرمایہ داریت کا سورج بھی غروب ہو گا۔فیض ان الفاظ کے ساتھ گویا ہوئے:

چند روز اور مری جان!فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پر مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں'تڑپ لیں'رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر'کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے'ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے(۱۰۱)

v۔فیض کا مزاحمت سے بغاوت کی طرف میلان:

مزاحمت اور خاص کر انقلاب میں کوئی مقصد پس منظر میں ہوتا ہے جس کو پانے کی عملی کوشش کی جاتی ہے'بالکل اسی طرح انقلابی شاعری میں بھی شاعر کسی مقصد کے حصول کے لیے اپنی شاعری کا سہارا لیتا ہے'اس کے برخلاف بغاوت ایک الگ اصطلاح ہے'بغاوت کرنے والے کو باغی کہا جاتا ہے'بغاوت علی الاعلان کسی نظام یا نظریہ کو انفرادی سطح پر یکسر رد کر کے "جی ہاں" اور "ہاں جی" "جناب والا سر آنکھوں پر" کی فضا میں "میں نہیں مانتا" "میں نہیں جانتا" کی صدائیں بلند کرنے کا نام ہے۔افتخار بیگ کا کہنا ہے:

آزادی اور انفرادیت کا احساس اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ سر اُٹھا کر چلے۔ اور سیاسی و سماجی جبریت کو کسی صورت میں تسلیم نہ کرے باغی کون؟ ایک آدمی کو کہتا ہے "نہیں" لیکن جس کا انکار دستبرداری پر دلالت نہیں کرتا وہ ایسا آدمی بھی ہے جو جونہی اپنے بارے میں سوچنا شروع کرتا ہے تو کہتا ہے "ہاں" ایک غلام جو ساری عمر حکم بجالاتا ہے' وہ اچانک فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کسی نئے حکم کی تعمیل نہیں کرسکتا سو بغاوت جنم لیتی ہے۔۔ وہ اپنے جیسے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر یعنی اپنی انفرادیت گم کر کے آقاؤں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ یہ فیصلہ فرد کی موضوعیت کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے۔ ایسے میں فیض احمد فیض ہندوستان بھر کے انسانوں کو مخاطب کرتے ہیں۔ (۱۰۲)

فیض احمد فیض کی جہاں شخصیت میں متانت اور سنجیدگی ہے اسی طرح فیض کی شاعری میں بھی ٹھہراؤ اور دھیما پن ہے۔ لیکن فیض تلخی ایام کی وجہ سے تلخی کلام پر بھی مائل نظر آتے ہیں جیسا کہ فیض کا کہنا ہے کہ:

لب پر ہے تلخیءِ مئے ایام، ورنہ فیض
ہم تلخیءِ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے (۱۰۳)

فیض احمد فیض کی تمام تر شاعری بغاوت کی شاعری نہیں ہے البتہ فیض کی چند نظموں میں بغاوت کی عکاسی دیکھی جاسکتی ہے اس حوالے سے ان کی نظم "بول" قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر نصرت چوہدری کا کہنا ہے کہ:

فیض خود تخلیقی عمل سے گزرتے ہوئے لوگوں کو بغاوت کی ترغیب دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ سماجی اور سیاسی سطح پر محسوس کرتے ہیں کہ لوگ صدیوں کی غلامی' پس ماندگی اور بے عملی سے مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ ان کے دلوں میں بغاوت اور انقلاب کے جذبات بھی ہیں۔ لیکن انہیں ڈر ہے کہ زبان پر صرف بغاوت لانے سے پہلے وہ پابہ جولاں کئے جائیں گے۔ فیض لوگوں کی مجبوریوں اور محرومیوں سے آگاہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ اپنے دلی جذبات کا اظہار کریں اس مقصد کے لیے وہ اپنی شاعری میں انہیں ترغیب دیتے ہیں کہ پابہ زنجیر ہونے سے پہلے اپنے گھٹے ہوئے جذبات کا اظہار کریں اس تجربے کو فیض نے ایک مختصر سی زوردار نظم "بول" میں پیش کیا ہے (۱۰۴)

بول نظم میں بغاوت کی زوردار جھلک دیکھ سکتے ہیں اس نظم میں فیض آزادی کے پیاسے غریب اور نادار طبقوں کو ابدی سچائی کے حصول کے لیے زبان کھولنے کی ترغیب دے رہے ہیں تاکہ لوگ اجتماعی سطح پر یک زبان ہو کر آزادی کے

نعرے لگیں گے کچھ طوفان اُٹھائیں گے تو آمریت کے ایوانوں میں لرزہ طاری ہو گی۔ نصرت چوہدری اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

"بول" کا موضوع بھی جذبہ بغاوت ہے۔۔۔ یہ نظم آزادی کے متوالوں کو حق گوئی کی ترغیب دینے والی رجزیہ نظم بھی ہے اور ساتھ ہی اس میں انسان کو پابہ زنجیر ہونے سے پہلے ابدی سچائی کے اظہار کو تحریک بھی دی گئی ہے۔ یہ وہی حق گوئی ہے جو سقراط کو جام زہر پینے اور حضرت امام حسینؓ کو میدان کربلا میں اپنے لہو سے لالہ زار کرنے کا جذبہ عطا کرتی ہے(۱۰۵)

"بول" نظم میں فیض ببانگ دہل لوگوں کو مزاحمت اور احتجاج پر برآنگیختہ کر رہے ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں جب تک لب' زبان' جسم اور سچ زندہ ہے' بولنے سے گریز نہیں کرنے ہوں گے۔ چپ سادھ لیں گے تو ظلم کی جڑیں مزید پھیلتی جائیں گی' لہٰذا اعلان بغاوت کر کے اُٹھ کھڑے ہو جائیں گی تو بھر بات بنے گی اور انقلاب کے لیے راستے ہموار ہوں گے۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زبان کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے(۱۰۷)

اس کے علاوہ فیض احمد فیض کی نظم "عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا" میں بھی دھیمے انداز سے آغاز لے کر بغاوت کے شعلے بھڑکاتے ہوئے فیض نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں افتخار شفیع لکھتے ہیں: نظم "عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا" میں شاعر کی ایک مخفی خواہش بیان کی گئی ہے جو بالآخر بغاوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ دکھ اور کرب جو انسان ہمیشہ سینے میں چھپائے رکھتا ہے آخر کار آتش فشاں بن کر پھٹ جاتا ہے(۱۰۸)

فیض کی شاعری میں سیاست کا بڑا عمل دخل ہے یعنی ان کی شاعری کو ملکی اور بین الاقوامی سیاست سے الگ نہیں کر سکتے' دوسری جانب سماجی پہلو کو بھی یکسر رد نہیں کیا جاسکتا' اب کیا فیض نے سیاسی اور سماجی حوالے سے صرف مزاحمتی اور انقلابی شاعری کی؟ یا پھر ایک قدم آگے بڑھ کر علم بغاوت بلند کیا؟ اس بارے میں ڈاکٹر محمد سفیر اعوان کا کہنا ہے:

"آج تک فیض کے کام کے حوالے سے ہونے والی بحث میں مرکزی مسئلہ یہ رہا ہے کہ آیا فیض محض ایک باغی تھے یا ایک سچے انقلابی؟ ان کی شاعری میں ملتے جلتے شواہد موجود ہیں۔ ایک جانب اگر ان کی شاعری سے تقدیر پرستی میں گندھی ہوئی قنوطیت جھلکتی ہے تو دوسری جانب کچھ خاص نظموں میں ہر قسم کی ناانصافی پر مبنی حکومتوں اور نظاموں کے خلاف اعلان بغاوت کرتے نظر آتے ہیں"(۱۰۹)

احمد فیض کی ایک اور نظم میں بھی بغاوت کے خدوخال ملتے ذرا اس کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔

حذر کرو مرے تن سے یہ سم کا دریا ہے
حذر کرو کہ مرا تن وہ چوب صحرا ہے
جسے جلاؤ تو صحن چمن میں دہکیں گے
بجائے سرو سمن میری ہڈیوں کے ببول
اسے بکھیرا تو دشت و دمن میں بکھرے گی
بجائے مشک و صبا' میری جان زار کی دھول
حذر کرو کہ میرا دل لہو کا پیاسا ہے(۱۱۰)

Vi۔ فیض کی مزاحمتی شاعری کا علامتی پہلو:

فیض احمد فیض نے جہاں براہ راست مزاحمتی رویہ اپنایا ہے وہاں فیض احمد فیض نے علامات واستعارات میں مزاحمتی شاعری بھی کی ہے۔ علامتی انداز میں غزل اور نظم لکھی جانے میں سیاسی جبر کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ لہذا اس جبر کے دور میں ظلم کے خلاف سرعام' کھل کر صدائے احتجاج بلند کرنا جان دکھوں کا کام تھا۔ فیض نے اپنی شاعری میں کلاسیکی اسالیب او علائم کو اس انداز میں بیان کیا' کہ ان میں جدت بھی آگئی اور اس طرح شاعری میں نئی روایت کا قیام عمل میں آیا جہاں شاعری میں جمال اور جلال مدغم ہوئے' رومانوی انداز میں سیاسی بیان اور انقلابی شاعری

بھی فیض کے ہاں علامتوں کے قالب میں درآئی۔اگر فیض بھی علائم کا سہارا لیے بغیر شاعری کرتے تو شاید کامیاب مزاحمتی شاعر کے طور پر مشہور نہ ہوتے۔اس ضمن میں ریاض صدیقی کا کہنا ہے کہ "فیض کو ان کے کلاسیکی اسلوب وعلائم نے سیاسی نہ بننے دیا بلکہ اسے ایک آفاقی شاعر بنا گیا فیض کا شاعرانہ مزاج اور جمالیاتی ذوق 'نظریات وافکار پر حاوی ہے "اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ فیض نے سیاسی شاعری نہ کی ہو' بلکہ ان کی اکثر شاعری سیاسی شاعری ہے 'لیکن فیض نے سیاسی شاعری کے بیان کے لیے کلاسیکی لب ولہجہ اپنایا' جس میں جمالیاتی رنگ وآہنگ کے ساتھ ساتھ علائم کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔فیض احمد فیض علامتی پیرایہ اظہار کے بارے میں فیض نے بڑے پتے کی بات کی ہے:

> " چار برس ہم نے جیل میں گزارے وہاں انکشاف ہوا کہ غزل تو بہت اچھی چیز ہے۔اس کے ذریعے آپ وہ بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں جو آپ چھپا کر کہنا چاہتے ہیں۔اس سے دو فائدے ہیں۔ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کریں گل وبلبل کی باتیں، گلشن کی، درمان کی اور قفس کی باتیں اور لوگ سمجھ جائیں کہ ان کا مطلب کیا ہے' آپ نہایت گھسی پٹی ترکیب اور امیجز لے کر تھوڑی سی جستجو سے بالکل اوریجنل بنا سکتے ہیں۔دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس پر گرفت نہیں ہو سکتی۔آپ نے خالص سیاسی شعر لکھا ہے اس میں قاتل 'مقتل' زنداں و قفس کا ذکر ہے۔اگر کوئی گرفت کرنا چاہے تو آپ کہہ سکتے ہیں ہم نے تو روایتی انداز سے غزل لکھی ہے"(۱۱۱)

فیض احمد فیض کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ابتدائی قاری کو ایسا لگے گا کہ فیض کی شاعری کوئی نئی شاعری نہیں ہے' وہی عاشق ومعشوق' ساقی وشراب، وہی شیخ وفقیہہ' وہی واعظ وناصح' وہی گل وبلبل' وہی شام وسحر' وہی شمع وپروانہ جیسے الفاظ واستعارات کی کارفرمائی ہے۔لیکن جب قاری اپنی فکر کو فیض کے دور کے ساتھ ملا کر فیض کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کرے تو معنویت کی ایک نئی جہاں آباد ہو گی' اب عاشق سے مراد مجاہد وانقلاب ہے' معشوق اس کا وطن ہے جواد احمد کا کہنا ہے کہ "فیض نے وطن دشمن عناصر کو شیخ اور اہل حکم جیسی علامتوں کے پردے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔فیض صاحب نے شیخ کو نئی علامتی قبا پہنا کر اسے وطن دشمن عناصر کا ہمراہی قرار دیا ہے"(۱۱۲)جیسا کہ فیض کا یہ شعر ملاحظہ دیکھیے:

گرجے ہیں بہت شیخ سر گوشہ منبر
کڑکے ہیں بہت اہل حکم بر سر دربار

لہذا فیض کی شاعری کے مطالعہ میں فیض کے ذہنی ارتقاء کا علم رکھنا بھی ضروری ہے'فیض نے شاعری کا آغاز کیسے لیا' پھر فیض مارکسزم کی طرف میلان کیوں کر گئے'فیض کو وطن سے کس نوعیت کی محبت تھی؟ فیض نے سامراج کو کس نظر سے دیکھا اور یہ کہ فیض نے انسانیت اور امن عالم کے لیے کیا کردار ادا کیا الغرض فیض کا رومان سے انسانیت تک کے ذہنی اور فکری سفر کا علم از بس ضروری ہے تب جا کر فیض کے علائم کی فیض کی شخصیت اور ان کے عہد کے پس منظر میں تفہیم ہو سکتی ہے۔اس بارے میں سنبل نگار لکھتی ہیں:

"انہوں نے سیاسی شاعری اور اپنی نظموں کو اپنے اپنے پیغام کا وسیلہ بنایا ہے۔لیکن سہار الیا حسن و عشق کی علامتوں کا'اس لیے اکثر دھوکا ہوتا ہے کہ فیض کسی مجازی محبوب کا ذکر کر رہے ہیں جبکہ دراصل ذکر ہوتا ہے اپنے ملک و قوم کا اپنے اہل وطن کی آزادی و خوشحالی کا"(۱۱۳)

فیض کی شاعری میں رات اور سحر کے استعارے زیادہ استعمال ہوئے ہیں'رات ظلم اور جبر سے عبارت ہے۔بقول میمونہ سبحانی"رات فیض کی شاعری میں جاگیر دارانہ نظام کی علامت بھی ہے اور ساتھ ساتھ اس نظام کی علامت بھی بنتی ہے جس میں ظلم وزیادتیاں ہوتی ہے"(۱۱۳) جبکہ ان کی شاعری میں سحر سے مراد نظام نو اور پیام امن ہے۔فیض احمد فیض اگر اپنی شاعری میں راست انداز میں لفظیات لے کر آتے تو ان کا موضوع محدود اور کم عمر اور وقتی ہو جاتا لیکن فیض احمد فیض نے علائم کو اس انداز میں ملائم کر کے پیش کیے کہ قاری اجنبیت محسوس نہیں کرتا یہ فیض کی انفرادیت ہے کہ وہ انفرادی علائم کے بجائے اجتماعی علائم کا برملا استعمال کرتے ہیں۔یہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فیض ملک و قوم کے لیے شاعری کر رہے تھے۔بقول رشید امجد"فیض کی ایک شاہ کار نظم "کتے"ان کی علامت نگاری کی شاندار مثال ہے"(۱۱۴) جس میں سماج کے ہاتھوں پستے ہوئے انسانوں کو کتوں سے تشبیہ دی ہے۔جنہیں نہ رات کو اور نہ دن کو سکون میسر آتا ہے۔ڈاکٹر طارق ہاشمی کا کہنا ہے:

"فیض احمد فیض نے جس طبقے کے لیے شاعری کی،اس کے لیے اس نے ایک زبردست علامتی کردار تشکیل دیا۔یہ علامت طنز بھی ہے،صدائے احتجاج بھی،اعلان بغاوت بھی،یہ کردار ایک حیوان کا ہے۔نظم "کتے"میں فیض نے نچلے طبقے کی تمثال جس طور سے کھینچی ہے وہ لائق تحسین و استحسان ہے۔نچلے طبقے کے لوگ اپنی مجبوریوں اور لاچاریوں کے باعث کسی قسم کی زندگی گزارتے ہیں۔ان کی نفسیات کیا ہے،ان کے احساسات کیا ہے،اور ایسے لوگوں کے اندر امکانات کیا ہے،"کتے"کا علامتی کردار اس کی مکمل توضیح کرتا ہے"(۱۱۵)

فیض نے اپنی بہت سی نظموں میں سرمایہ دارانہ استحصال' طبقاتی استحصال' سماج کی محرومی اور بیگانگی کی کیفیات کو انتہائی مضبوط' واضح اور شائستہ انداز میں بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ استحصالی قوتوں اور طبقاتی نظام کے خلاف مزاحمتی رویہ اپناتے ہوئے انقلاب کی ضرورت کا احساس دلایا۔اس حوالے سے فیض کی نظم "انتساب سے لے کر" کتے "تک کئی نظمیں انقلابیوں کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوق گدائی۔۔۔
یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے
مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے
تو انسان سب سر کشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے (۱۱۶)

فیض نے انسانیت کی خاطر انسانوں کے حق میں مزاحمتی شاعری کی۔ان کا ایمان بھی تھا کہ انسانیت کی جیت ہو گی' اور انسانیت دشمن طاقتیں اپنے انجام کو پہنچیں گی۔جیسا کہ فیض کا کہنا ہے کہ "مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی "(۱۱۷)

لہذا ادب کے ارتقاء کے لیے ادب کا ہر دوسرا قدم مزاحمتی ادب ہے جو اپنے سے پہلے کے رویوں اور رجحانات اور تحریکوں کے خلاف ایک گونا مخالفت' مخاصمت اور مزاحمت کا پیش خیمہ ہے۔

مزاحمتی ادب میں ہر اس چیز کا بیان کیا جاتا ہے جن کے ذریعے کسی استحصال زدہ معاشرے کو برابری کی سطح پر لائی جاتی ہے جن کے ذریعے طبقاتی نظام کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے' جن کے ذریعے سے ظالمین کو سزا اور مظلومین کو دادرسی میسر آسکتی ہے' جن کے ذریعے غیر جمہوری اقدار جیسے آمریت اور استعماریت کا قلع قمع کا جاسکتا ہے لہذا مزاحمت ادب صرف ایک ہنگامی صورتحال سے دوچار ہونے کا نام نہیں بلکہ مزاحمتی ادب حق اور حق کے لیے آواز بلند کرتے رہنے

سے عبارت ہے جب تک حق اور اہل حق رہیں گے ظلم اور بربریت اور استحصال کے خلاف آواز بلند ہوتی رہے گی یوں مزاحمتی ادب بھی برابر جاری و ساری رہے گا۔

اردو ادب میں مزاحمت کے ابتدائی نقوش مرثیوں میں ملتے ہیں علاوہ ازیں جعفر زٹلی کے ہاں مزاحمت کا واضح بیان ملتا ہے جس کی وجہ سے موت کی سزا ملی۔ انگریز جب آئے تو اکبر الہ آبادی جیسے اہم شعرا کے ہاں مزاحمتی رویے ملتے ہیں۔ آگے جا کر اقبال 'جوش اور ترقی پسند شعرا کے ہاں مزاحمت ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ البتہ اصطلاح کے طور پر پاکستان میں مزاحمتی ادب مارشل لائی نظام کے خلاف ایک توانا آواز اور احتجاج کے طور پر ابھرا۔ پاکستان میں مزاحمتی ادب کے سرخیل فیض احمد فیض کو کہا جائے تو بجا نہ ہو گا۔

فیض احمد فیض نے آمریت، مذہبی اجارہ داری اور ظاہر داریت کے خلاف جہاں مزاحمتی شاعری کی ہے وہاں فیض احمد فیض نے عالمی استعمار اور طبقاتی و سماجی استحصال کو بھی موضوع سخن بنایا ہے اور یہ کہ فلسطین اور اہل فلسطین پر مشتمل مزاحمتی شاعری کرنے کو اپنا اخلاقی فریضہ سمجھا اور اس فریضے کو بھی فیض خوب نبھا گئے۔

مزاحمتی شاعری کے لیے فیض نے جہاں رومانوی فضا کو قائم رکھا وہاں براہ راست مزاحمتی شاعری کی وہاں فیض نے علامات و استعارات کا بھی سہارا لیا لیکن ان کی علامات گھسی پٹی ہیں لیکن جب شاعر نے نئے معانی کے لباس پہنا دیئے تو یہ الفاظ پرانے ہوتے ہوئے بھی نئے لگتے ہیں کیونکہ فیض کے تخیل نے ان الفاظ کو معانی دے کر نئی روح بخشی تھی۔ اور اہم بات یہ ہے کہ فیض کے علامات و استعارات ذاتی 'انفرادی اور مبہم نہیں ہیں ان کے علائم اجتماعی ہیں یہی وجہ ہے ہر کوئی سمجھ بھی سکتا ہے اور معانی بھی اخذ کر سکتا ہے۔

ج۔ محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کا فکری پس منظر:

تاریخ میں فلسطین کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ آسمانی کتابوں کے پیروکار عیسائی 'یہودی اور خاص طور پر مسلمان اسے قبلہ اول گردانتے ہوئے نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جس قدر فلسطین کی اہمیت ہے اسی اعتبار سے سرزمین فلسطین تاریخ میں ہمیشہ مظلوم واقع ہوئی ہے۔ جس کسی بھی بادشاہ 'آمر' حاکم اور نظام کو موقع ملا فلسطین پر چڑھ دوڑنے سے دریغ نہیں کیا۔ اس بارے میں سبط حسن معلومات افزا بیان اپنی کتاب " سخن در سخن " ان الفاظ میں دے رہے ہیں:

> فلسطین ہزاروں برس سے بیرونی طاقتوں کے تیر ہوس کا نشانہ بنا ہوا ہے جب کبھی فراعنہ مصر نے روندا' کبھی اشوریوں نے اس کو تاراج کیا مگر اصل تباہی تو اس وقت آئی جب عبرانی قبیلوں

نے مصر میں خروج کے بعد فلسطین پر حملہ کیا۔ان کے کھیتوں'انگور'انجیر'زیتون اور کھجور کے باغوں پر قابض ہوگئے۔پہلی صدی میں یہ خطہ دومۃ الکبریٰ کے زیرنگیں آیااور پھربازنطینی شہنشاہوں کو ورثے میں ملا۔۔عربوں کا آفتاب اقبال غروب ہورہا تھا کہ جنگ صلیبہ کاشوراُٹھا۔اورارض فلسطین دوسوسال تک میدان کارزار بنی رہی۔تب عثمانیوں پرزوال آیاتومغربی طاقتیں مذہبی حقوق کے آڑ لے کرفلسطین میں مداخلت کرنے لگیں۔انہوں نے اپنااثرورسوخ بڑھانے کی غرض سے صیہونی تحریک کو بھی ہوا دی۔پہلی جنگ عظیم میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیاتوبرطانیہ اور فرانس کوعثمانی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کاموقع ہاتھ آگیا،فلسطین پرانگریزوں نےقبضہ کرلیا۔جنگ میں یہودیوں بالخصوص یورپ اورامریکہ کے دولت مندیہودیوں کی حمایت حاصل کرنے اور مشرق وسطیٰ میں اپنے سامراجی مفادات کے استحکام کے پیش نظر برطانوی وزیر خارجی بالفرنے۱۹۱۷ء میں سرکاری طورپر اعلان کردیا کہ یہودی قوم فلسطین کے اندراپناوطن بنانے کی مستحق ہے تب انگریزی فوج کی حفاظت میں یہودی فلسطین میں آکر آباد ہونے لگے (۱۱۸)

صیہونیوں کے قبضے کے بعد فلسطینیوں کو فلسطین سے بے دخل کرنے عمل شروع ہوااور فلسطینی اپنے وطن میں بے وطن ہوتے گئے اوراپنے ہی وطن سے اجنبیت کااحساس ہونے لگااوریوں ایک پناہ گزینی اوربے خانماں زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔البتہ بے سروسامانی کے عالم میں بھی محب وطن اور حریت فکر رکھنے والے فلسطینی مجاہدین نے بھی آزادی کے لیے جدوجہد جاری رکھی شہادتیں ہوئیں اور ہورہی ہیں لیکن غیور فلسطینی 'اپنے وطن اورملک سے دستبردار نہیں ہوئے۔

۱۹۱۲ءمیں فلسطین میں عربوں کی تعداد ساٹھ لاکھ کی تھی'جبکہ یہودیوں کی کل آبادی صرف تراسی (۸۳) ہزار تھی۔دوسری جنگ عظیم تک یہودیوں نے اپنی پوزیشن دولت اوردہشت گردی کے بل بوتے پر مستحکم کرلی۔انہیں امریکہ کی مالی اورفوجی معاونت حاصل رہی۔جس سے فلسطین کابٹوارہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔یوں اسرائیل کی ریاست عربوں کے قلب میں قائم ہوئی۔عرب ریاستیں مل کر اسرائیل کوشکست دینے سے قاصر رہیں۔یہودیوں نے اپنی ریاست کی توسیع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا'اب بھی یہ سلسلہ رکانہیں۔اسرائیل کی پشت پناہی استعماری طاقتیں کررہی ہیں اس بارے میں ثاقب رزمی کا کہنا ہے:

"دوسری عالمی جنگ میں شکست کے بعد عیار مغربی سامراج نے اپنے دوشعبدے دکھائے ایک تواس نے اپنے دوسامراجی مہرے اسرائیل اور جنوبی افریقہ میں گوری اقلیت کے تسلط کی شکل میں قائم رکھے اور دوسرے بہروپ دھار لیا اور جدید نو آبادیاتی نظام کی غیر مرئی شکل میں تیسری دنیا کو اپنے قبضہ قدرت میں رکھا"(۱۱۹)

دوسری عالمی جنگوں کے بعد دنیا کی سیاسی نظریں اسلامی ممالک پر رہیں۔ مسلمانوں میں تقسیم در تقسیم اور لڑاؤ کی پالیسی اپنائی۔ یوں "امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے وسیع تر مسلم دنیا کو متعدد ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کے درمیان ایک کبھی نہ حل ہونے والے تنازعہ کا بیج بویا"(۱۱۹) یوں مسلمانوں کی طاقت کو کمزور کرنے اور اپنے مفاد کی خاطر یورپ سے یہودیوں کو نکال کر مشرق وسطیٰ میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ جہاں اسرائیلی ریاست معرض وجود میں آگئی۔ لہٰذا سامراجی طاقتوں کے زیر اثر فلسطینی گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن ہوئے' اور ہزاروں کی تعداد میں اردون؛ شام اور بیروت جیسے ممالک میں پناہ گزینی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے' یہ بات نہایت یہ قابل تحسین ہے کہ فلسطینی' اپنے حق کو لینے سے کبھی دستبردار نہیں ہوئے۔ اپنی جدوجہد اور مزاحمت جاری رکھی۔ "وہ اپنے وطن کو بھولے نہیں۔ بلکہ سوتے جاگتے' اسی کا خواب دیکھتے ہیں۔ اور اس خواب کو حقیقت بنانے کی خاطر جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کی سرفروشیاں اور قربانیاں حریت بشر کی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ تمام آلائم و مصائب کے باوجود ان کے عزم اور حوصلے جوان ہیں اور وہ سر سے کفن باندھ کر دشمن کے مقابل صف آرا ہیں"(۱۲۰)

عرب شعرا کی یہ روایت رہی ہے کہ انہوں نے اپنی تہذیب اور ثقافت میں شاعری کی ہے۔ گویا عرب شعرا اپنی تہذیب و ثقافت کے ترجمان ہیں۔ موجوددہ دور میں بھی عرب شعرا نے اس روایت سے یکسر انحراف نہیں کیا۔ اس کا واضح ثبوت محمود درویش کی شاعری ہے۔ جو عرب تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ ابوالکلام قاسمی اپنے ایک مضمون "فلسطین کا جدید شعری منظر نامہ" میں لکھتے ہیں:

> "عربوں کی ثقافتی روایت میں شاعری کو امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ قدیم زمانے ہی سے شاعروں نے اپنے قبیلے کے سماجی و سیاسی کوائف کی سچی ترجمانی کی ہے۔ اس دور کے شعراء نہ صرف یہ کہ اپنی قوم کے جمالیاتی اقدار کے محافظ تھے بلکہ ان کے سیاسی و قبائلی شعور کے بھی ترجمان تھے۔ فلسطین بھی عرب ثقافت کا ایک حصہ ہے اس لیے یہاں کے شاعروں نے بھی اپنے جذبات، احساسات اور تجربے شاعری ہی میں پیش کیے"(۱۲۱)

عربی شاعری بھی سیاست سے الگ وادی میں گھومتی نہیں رہی'بلکہ عرب شاعری خاص کر فلسطینی شاعری کامطالعہ کیاجائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دنیائے عرب کی سیاسی رویوں'رجحانات اور تحریک میں شاعری کابڑاکرداردکھائی دیتاہے۔ڈاکٹراسماءرشید کاکہناہے:

"دنیائے عرب میں کوئی سیاسی یااجتماعی انقلابی تحریک نہیں ابھری جس کی گونج ہمیں ان کے اشعار میں نہ سنائی دیتی ہو، جس امید و بیم اور غم و حسرت، لیکن عزم و اعتماد سے انہوں نے عرب دنیاکے مد و جزر کا مقابلہ کیاہے۔ وہ نہایت ہی دلپذیر اور دلگداز ہے۔ انقلاب مصر اور مصر کے خلاف ۱۹۰۶ کی جارحیت، فلسطینی شاعری کی ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔اسی طرح الجزائر کے انقلاب نے اسے گہرا تاثر بخشا۔اسی طرح انقلاب یمن، اسوان ہند کی تعمیر، غرض عرب دنیاکی ہر انقلابی تحریک ہمیں مقبوضہ فلسطین کے ادب میں منعکس نظر آتی ہے"(۱۲۲)

فلسطین کی آزادی کے لیے حماس اور الفتح جیسی تنظیمیں وجود میں آئی تو ساتھ ہی ادیبوں نے بھی اپنے فن پاروں اور شاعری کے ذریعے آزادی کے پیغام کوگھر گھر پہنچانے کے لیے بھی ادبی تحریکوں کی بنیادرکھی۔نتیجے میں "ادب المقاومۃ"یعنی مزاحمتی ادب کو دنیاکے سامنے لاکھڑاکیاجس کوبعد میں قبولیت عام حاصل ہوئی۔اسرائیلی فوجی حکومت کی تلوار کے سائے میں اور دہشت و عذاب کی اس گھٹی فضاء میں مقاومت کی سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ ادبی تحریک نے جنم لیااسماءرشید کاکہناہے:

"فلسطینی مقاومت کاادب مضمون، معنی اور مشکل کے اعتبار سے جدید عرب ثقافتی تحریک میں ایک منفرد اور اپنی حیثیت رکھتاہے۔اس میں ہمیں سطحی جذبات یاہسٹریا اور ماتم و نوحہ خوانی یاذمہ داری سے فرار نہیں دکھائی دیتا، نہ ہی یہ ادب ہمیں طنز و مزاح یاسستے نعروں کی آڑ لیتا نظر آتاہے۔ فلسطینی ادب کوئی ذہین عیاشی نہیں بلکہ یہ ایک ذمہ دار اور بامقصد ادب ہے جسے اپنے مقدس فریضے کاسختی سے احساس ہے"(۱۲۳)

مقبوضہ فلسطین کے ادیبوں نے اپنی ذمہ داریوں کااظہار کرتے ہوئے مزاحمت کاراستہ اپنایا'انہوں نے شعر کو ہتھیار کے طور پر اخذ کیا۔"فلسطینی شعراء قومی کشمکش کے خون ریز معرکہ میں الفاظ کی اہمیت اور درد کو پہنچانے کو مقدس گردانتے ہیں"(ص ۲۹) فلسطینی شعرانے نہ صرف شاعری کی بلکہ فلسطین کواسرائیل کے چنگل سے نجات

دلانے کے لیے عملی میدان میں بھی اتر آئے۔اور پتھر اور غلیل کا سہارا لے کر اسرائیلیوں سے (ایمان کی طاقت کے ساتھ) نبرد آزما رہے۔

فلسطینی شعرا نے جہاں شعر کو اسلحہ کے طور پر استعمال کیا وہاں فلسطینی شاعروں اور ادیبوں نے عملی میدان میں فلسطین کی آزادی کی تحریکوں کا ساتھ دیا۔ان شعرا کی ایک بڑی تعداد ہے جنہوں نے فلسطین کو موضوع بنا کر مزاحمتی ادب کی داغ بیل رکھی'بعدازاں یہ رجحان کی حیثیت اختیار کر گئی اور پوری دنیا میں "مزاحمتی ادب "کو ایک الگ حیثیت اور مقام حاصل ہوا۔فلسطینی شاعروں سے اسرائیل کو خوف لاحق ہوا تو جیل بھراؤ کا سلسلہ شروع ہوا نتیجے میں توفیق فیاض، حسن ابو حسن، سمیع القاسم،نوخین زیادا اور محمود درویش جیسے دوسرے شعرا اور ادیب برسوں اسرائیلی جیل کی سلاخوں میں بند رہے۔یہ تلخ تجربہ ضرور تھا لیکن اس تجربے نے شعرا کے کلام کو نئی روح اور نئی جلا بخشی۔اور یوں ان کی شاعری میں پختگی بھی آ گئی۔" محمود درویش اور سمیع قاسم کے اشعار نہ صرف زندان میں نمایاں پختگی اور وسعت نظری حاصل کی بلکہ ادائیگی کے لحاظ سے بھی ایک اچھوتے فنی اور فکری انداز کی تخلیق کی"[۱۲۴]

عرب شعرا خاص کر فلسطین کے شعرا صرف روایتی شاعری تک محدود نہیں رہے بلکہ انہوں نے جدید مغربی ادیبوں اور دانشوروں کا بخوبی مطالعہ کیا اور نتیجے میں ایک جدت کی شاعری منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے'انقلابی اور مزاحمتی شاعری کا بیشتر مواد فلسطینی شعرا نے کارل مارکس کی فکر سے لیا۔اس حوالے ابو الکلام قاسمی لکھتے ہیں:

> "جدید عرب شاعری پر البیر کامیو، سارترا اور کارل مارکس کے بہت گہرے اثرات ہیں۔سارتر کے فلسفہ موجودیت اور کارل مارکس کے فلسفہ جدلیاتی مادیت سے عرب شاعروں نے تاثر قبول کیا ہے۔انقلابی شاعروں نے مارکسی نظریئے کو قبول کرتے ہوئے عربی شاعری کو نئی آگہی و نیا تصور دیا"۔[۱۲۵]

فلسطینی شعرا نے فلسطین کو اغیار کے ہاتھوں یرغمال دیکھا'تو ان سے رہا نہ گیا'ظلم کو کسی طور روکنا بھی تو ہوتا ہے'اس خاطر انہوں نے لفظی جنگ کا اعلان کر دیا اور ہر فورم پر مزاحمت کا سلسلہ جاری رکھا۔بعدازاں مزاحمتی شاعری ایک ادبی تحریک کی صورت اختیار کر گئی اور ہر شاعر نے اپنی بساط کے مطابق اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالا۔ان شعرا میں ایک اہم نام محمود درویش کا آتا ہے جن کی مزاحمتی شاعری کو ساری دنیا مانتی ہے جسے انہوں نے عالمگیریت اور آفاقیت بخشی'ان کی یہ کاوش ادبی افق پر درخشاں ستارے کی مانند چمکتی رہے گی۔ محمود درویش کے بارے میں عبد اللہ الازہری لکھتے ہیں:

"جدید عربی شاعری دنیا کے انتشار کے پس منظر سے نمودار ہوئی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد کے سالوں نے پانچ عرب اسرائیل جنگیں دیکھی ہیں۔ لبنان اور یمن میں بڑی خانہ جنگیاں ملاحظہ کی ہیں۔ فلسطینی عوام کو مسلسل نشانہ بنتے پایا ہے۔ اور آدھی درجن سے زائد ممالک میں لاتعداد فوجی بغاوتوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس کے سب کے ذریعے سے خصوصی طور پر بے شمار رنگوں کے سیاسی رہنماؤں کے وسیلے سے حاصل ہونے والی تلخ مایوسی کے حوالے سے عرب عوام نے شاعروں کو اپنی تمناؤں کے اظہار کے لیے منتخب کیا۔ یہ تمنائیں درویش اور ابوالقاسم جیسے فلسطینیوں کی مزاحمتی شاعری میں بطریق احسن اجاگر ہوتی ہیں۔ ان کے شاعرانہ استکمال نے ایک مقامی المیے کو آفاقی میں ڈالا ہے"(۱۲۶)

عرب شاعری بھی دیگر ممالک کی شاعری کی طرح عصری رجحانات اور میلانات سے فاصلے پر نہیں رہی' عرب شاعری میں بھی جدت آتی گئی' پرانے شعری سانچوں سے انحراف کیا' جدید ترین آوازیں آنے لگیں۔ خاص کر فلسطینی 'فلسطین میں مارکسی انقلاب لانے کے درپے ہوئے' اس میں شعرا کا کافی کردار رہا۔ ان شعرا کی شاعری کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مذہب اور مسلک سے بالاتر ہو کر انسانیت کے لیے شاعری کی ہے۔

فلسطینی شعرا کو جب جلاوطن کیا گیا یا جلاوطن ہو کر دیگر ملکوں میں سکونت اختیار کی تو دنیا کے بلند پایہ ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئی۔ دنیا کو نئے رخ سے دیکھنے کا بہترین موقع میسر آیا تو فلسطینی شعرا نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا' یوں فلسطینی شعرا کی شاعری میں نئے موضوعات آئے' نئے شعری اسالیب میسر آئے' نتیجے میں جدیدیت کی کئی آوازیں فلسطینی شاعری میں سنائی جانے لگی۔ کہیں پر پابلو نرودا کی بازگشت سنائی دیتی ہے تو کہیں اشتراکیت والے مارکس کے نظریات کا چرچا تو کہیں سارتر کے دبنگ انداز میں وجودیت کے کا پرچار کرتے ہوئے فلسطینی شعرا نظر آتے ہیں۔ ان شعرا میں عبدالوہاب البیاتی، بلند الحیدری، ادونیس، جبرا ابراہیم جبرا، توفیق صائغ، محمود درویش، سمیع القاسم، سالم جبران، نازک الملائکہ اور الشاکر السباب جیسے شعرا قابل ذکر ہیں جنہوں نے عرب شاعری کو نئے رنگوں' اسالیب اور ذائقوں سے روشناس کرایا اور یوں عرب شاعری کو نیا اعتبار اور وقار بخشا۔

فلسطین کے شعرا کا ایک اہم شعری اظہار مزاحمتی شاعری ہے۔ مزاحمتی شاعری کو اگر دیکھا جائے تو ہر نو آبادیات میں رہنے والے ادیبوں کو زیب دیتی ہے اور مزاحمتی شاعری وقت' مکان اور مکین کی ضرورت بھی ہے' اگر ادباء استعماری رویوں اور کرتوتوں کا اپنی تیز نگاہوں سے دیکھتے رہے اور ان کے حوالے سے کوئی روگ' رکاوٹ نہ

ڈالیں تو ایسے ادیب کو جینے کا حق نہیں ملنا چاہئے۔ خیر محمود درویش نے بھی ایک نو آبادیات میں آنکھ کھولی اور اپنے اوپر سخت پہرے دیکھے لیکن محمود درویش اپنے اصولوں سے گہری وابستگی رکھنے والے شاعر تھے'وہ دا مے درمے اور سخنے حق کے لیے لڑتے رہے'ظلم کی مخالفت کرتے رہے بقول افضل توصیف "محمود درویش کی شاعری خود ایک بڑا محاذ جنگ ہے"(۱۲۷) اور مزاحمتی شاعری سے انقلاب کی راہ ہموار کرتے رہے۔

ان کی سب سے مشہور اور عمدہ مزاحمتی نظم "شناختی کارڈ" ہے جس میں اپنے زخم خوردہ وطن کے لیے تقدیس و احترام کے تمام تر جذبے کے ساتھ مزاحمتی لہجے میں ایک پولیس کو خطاب کرتے ہوئے ایک پوری نظم لکھی'جس میں مزاحمت کا بھرپور لہجہ ملتا ہے۔اس نظم میں نفرت'شدت اور غصہ ہے تو دوسری طرف عرب شناخت کو باور کراتے ہوئے محمود درویش نے اپنی طاقت کا برملا اظہار کیا ہے۔ محمود درویش کو خاک وطن کے ذرے ذرے سے پیار ہے، اس سے چمٹے رہنے کی آرزو ہے کہ اس زمین سے ازلی وابدی رشتہ ہے۔ نسترن احسن فتیحی کا کہنا ہے:

> "سماجی حالات کے پیش نظر مزاحمتی صورتحال بھی تبدیل ہوتی رہی ہے۔ تشدد کے ادوار میں مزاحمت کی جو صورت ہوتی ہے وہ آئینی اور سیاسی ادوار میں اسی انداز اور طریقے سے منطبق نہیں ہو سکتی۔ عرب میں بڑھنے والی ثقافتی'ادبی اور فکری سرگرمیوں کو بھی موجودہ حالات کے تناظر میں فلسطینیوں کی جانب سے پُرامن مزاحمت کی ایک مضبوط صورت ملتی ہے"(۱۲۸)

بالفوراعلامیہ سے صیہونیت کو تائید مل گئی اور یوں جب ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو لاکھوں فلسطینی بے گھر ہوئے۔پناہ گزینی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے صرف یہی نہیں بہت سے لوگ جلاوطن ہوئے۔ان حالات کے پیش نظر فلسطین میں مزاحمتی ادب ایک وقت کی ضرورت بن کر ابھرا۔ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

> "اپنے وطن فلسطین سے گہری جذباتی وابستگی کی وجہ سے فلسطینی مزاحمتی شاعری وجود میں آئی۔توفیق زیاد، سالم جبران، محمود درویش اور سمیح القاسم جیسے ممتاز شاعروں نے اسے فروغ دیا اور انتہائی مشکل حالات میں بھی قوی ایقان اور علانیہ نافرمانی وبغاوت کے جذبات کے ذریعے جمالیاتی احساس کی تشکیل کی"(۱۲۹)

عرب شاعری کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ عرب شاعری میں سوائے جذبات اور جانبدارانہ نعرہ بازی کے کچھ نہیں اور نہ یہ انسانی عدل وانصاف کے ارفع جذبے کو اپیل کرتی ہے۔اگر یہ تاثر حقیقت پر مبنی ہی کیوں نہ

ہو'جب ہم فلسطین کے جدید شعرا کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ تاثر ہوا میں اڑ جاتا ہے'انہوں نے ایسی شاعری کی ہے جو بغض، کینے، مزاج کی درشتی، برہمی اور قبائلیت کی سوچ وفکر سے ارفع ہے۔یہ شاعری جہاں اپنی بات کہنے کے لیے اعلیٰ فنی معیار اختیار کر گئی ہے وہاں اس شاعری میں عقل سلیم اور خالص احساس کی کامرانی اور انسانیت کی فتح دکھائی دیتی ہے۔

محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو ان کی مزاحمتی شاعری کا بنیادی محور فلسطین ہے۔وہ فلسطین کے حق میں'صیہونیت کے خلاف انسانیت پر مبنی مزاحمتی شاعری کرتے ہیں'ان کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں ہر انسانیت دشمن نظام کے خلاف'استعماریت کے خلاف'طبقاتی استحصال کے خلاف اور سماجی وسیاسی استحصال ومنافقت کے خلاف انکار'نفرت کا فلسفہ اور مزاحمتی رویے ملتے ہیں۔ان کی شاعری صرف جذبات پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری میں فکر بھی ملتی ہے اور ساتھ شعور بھی۔ محمود درویش کی شاعری بالآخر ہر مظلوم کی صدا بن جاتی ہے اور ایک آفاقی اہمیت کی حامل مزاحمتی شاعری بن کر ابھرتی ہے۔

اس روز مرہ کی خونی کشمکش میں ذاتی یا اجتماعی سطح پر فلسطینی عوام کو جو عذاب سہنے پڑے ہیں انھیں فلسطینی شعراء نے خون اور آنسوؤں سے رقم کیا ہے، لیکن ہم ان اشعار میں ان خون اور آنسوؤں کو ایک نئے ثبات وعزم اور امید میں تحویل ہوتا دیکھتے ہیں۔مثلاً محمود درویش نے قید خانے سے یہ پیغام حنا ابو حنا کو بھیجا۔

المغنی علی صلیب الالم
جرحہ ساطع کنجم
قال للناس حولہ
کل شیءِ سوی الندم
ھکذا مت واقفاً
واقفاً مت کا الشجر (۱۳۰)

ترجمہ: صلیب درد پر چڑھے شاعر کا زخم / تارے کی طرح روشن ہے / اس نے اپنے گرد جمع لوگوں سے کہا / ہر ایک چیز سوائے ندامت کے / اور اس طرح اس نے کھڑے ہوئے جان دے دی / وہ کھڑے ہوئے مر گیا درخت کی طرح۔

محمود درویش کی شاعری کو صیہونیوں نے اپنے وجود کے لیے خطرہ سمجھا تو محمود درویش کو خاموش کرانے کی خاطر قید وبند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا لیکن محمود درویش رکنے والے اور جھکنے والے کہاں تھے'قید خانے سے محمود درویش کو مزید سوچنے کا موقع ملا اور پہلے سے بھی بہتر شاعری کی۔اور کہا کہ زنجیروں میں جکڑنے سے مجھ میں عقاب کی سختی آئی

ہے اور امید کی شمع بھی روشن ہو گئی ہے' اب دیکھنا کہ طوفان زور و شور سے اٹھے گا' مجھے اگر کوٹھری میں بند کیا ہے تو غم کس بات کا' میرے دل نے کئی مشعلیں روشن کی ہیں۔ گویا عزم و ثبات اور امید و بیم محمود درویش کے ان خوبصورت اشعار میں فروزاں نظر آتا ہے۔

اے میرے وطن / میری زنجیروں نے مجھے / عقاب کی سختی / اور رجائی کی نرمی سکھادی / میں نہیں جانتا تھا کہ ہماری کھالوں کے نیچے / طوفان جنم لیں گے / اور دریاؤں کا وصل ہو گا(۱۳۱)

محمود درویش لفظ کی سنگینی اور تقدس کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک نئے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ محمود درویش تمنا کر رہے ہیں کہ کاش یہ الفاظ ہتھوڑا' بم' درانتی بن جائے تو شاید محنت کش' مجاہد اور کاشت کار کے کام آجائیں۔ لفظ کی بڑی حرمت ہے' ایک لفظ ہی ہے جس کی بناپر کائنات کی تخلیق ہوئی لہٰذا الفاظ کی اپنی جگہ تاثیر ہے۔ محمود درویش بھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کاش یہ اشعار / محنت کش کے ہاتھ میں ہتھوڑا بن جائے / اور مجاہد کی مٹھی میں بم / کاش یہ کلمات / کاشتکار کے ہاتھ میں درانتی بن جائیں یا قمیصیں، یا دروازہ یا کلیہ (۱۳۲)

محمود درویش فلسطینی شعرا میں ایک معتبر نام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں رومانویت' انسان دوستی' مزاحمت وانقلاب' جلاوطنی اور بیگانگیت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ فیصل دراج اپنے ایک مضمون محمود درويش : شاعر المقاومة في جميع الأزمنة میں لکھتے ہیں:

بدأ محمود درويش شاعراً مقاوماً، ورحل وظل مخلصاً لما بدأه، وإن كانت التجربة الفلسطينية، التي عرفت الشوك ولم تعرف من العسل إلا اسمه، قد علمته أن المقاومة بصيغة المفرد لا وجود لها، وأن من يعيش التجربة يدرك أن لكل سياق شكلاً من المقاومة خاصاً به: المقاومة بالسلاح، مقاومة الكتابة الرديئة، مقاومة الخيبة ورثاء الحالمين الذين سقطوا في الطريق، مقاومة اليأس، مقاومة الحصار، مقاومة الحقد الأعمى الذي هو العدو الحقيقي للإبداع الشعري .(۱۳۳)

محمود درویش درویش مزاحمت کی ایک دنیا آباد کرتے ہیں ان کی شاعری الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جیسے یہ الفاظ مسلح ہو کر دشمن کی صفوں میں مبارزت کر رہے ہوں' انہوں نے اسرائیلی مظالم کے آگے بند باندھنے اور ڈھال کو طور پر مزاحمتی شاعری کا سہارا لیا' اسی مزاحمتی شاعری میں رثائی انداز بھی اختیار کیا تاکہ دنیا تک مظلومیت فلسطین پہنچ جائے شاید بڑے سطح پر کوئی شنید ہو سکے۔ Marwan A. Hamd کا کہنا ہے:

The concept of resistance in creative and cultural production becomes one of the absolute human values, especially in the

> Arab region whose contemporary history tries to accomplish its attachment to and interaction with values of identity, modernity, and freedom. Literature of resistance is a cultural resistance that precedes, accompanies, and follows the resisting act. The concept of resistance poetry accompanies the concept of fighting with available weapons in wars, battles and other forms of foreign occupation. In this light, poetic language of Darwish is employed for resisting the wildest and longest Israeli oppressive occupation of land and people.[۱۳۴]

صیہونیت نے محمود درویش کے وجود کو اپنے لیے خطرہ محسوس کیا تو محمود درویش کو ملک بدر کیا' محمود درویش دوران جلاوطنی عمان' بیروت' شام' تیونس' ماسکو اور پیرس جیسے مختلف شہروں میں مقیم رہے۔ منصور احمد کا کہنا ہے کہ:

> ورأت السلطات الصهيونية الفاشستية أن وجود محمود درويش يشكل خطراً عليها فنفته خارج فلسطين المحتلة واستقبل بترحاب في مدن: دمشق، بيروت، عمان، القاهرة، تونس، حلب والعواصم الأجنبية : موسكو، باريس... وأجرى في هذه العواصم أمسيات شعرية تدعو إلى مقاومة الاحتلال الصهيوني لفلسطين العربية.بعد جولاته في تلك المدن، استقر في بيروت رئيساً لتحرير مجلة شؤون فلسطينية ورئيس رابطة الكتاب والصحفيين الفلسطينيين، كما أسس مجلة الكرمل الثقافية وشغل رئيس تحريرها.. ولكن طبيعة الكيان الصهيوني العدوانية ما لبثت أن قامت عام ١٩٨٢ باجتياح الأراضي اللبنانية بحجة القضاء على المقاومة الفلسطينية المتواجدة قيادتها في بيروت فرحل محمود درويش إلى تونس.[١٣٥]

محمود درویش بیروت میں جلاوطنی کے دوران مجلہ " شؤون فلسطینیہ "میں خدمات سرانجام دیتے رہے اور ہر فورم پر فلسطین کا دفاع کرتے رہے۔ فلسطین کا وہ دفاع کیوں نہ کریں جو ان کے آباؤاجداد کا وطن ہے' زمینیں انہیں اپنے آباء سے ورثے میں ملیں' بادل نخواستہ صیہونیت آکر فلسطین کے نقشہ کو' جغرافیہ کو اور تاریخ کو مسخ کر کے رکھا تو محمود درویش کا قلم تو چلنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ محمود درویش کی ساری شاعری فلسطین بن گئی ہے۔ فلسطین کی ابتری کو تحریری صورت میں ملاحظہ کرنا ہو تو کہیں اور جانے کی چنداں ضرورت نہیں محمود درویش کے دیوان کو اُٹھا کر مطالعہ کر لیں۔ پروفیسر ڈاکٹر اسمار شید اپنے ایک مضمون "مقبوضہ فلسطین کا ادب مقاومت میں" لکھتی ہیں:

> "فلسطینی عوام کو ان کی سرزمین سے جہاں وہ ہزار سال سے رہتے چلے آئے تھے' بے دخل کر دیا تاکہ وہاں ایک غیر ملکی خالصتاً یورپی استعماری ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جس کی

بنیاد نسلی برتری کے اصول پر ہے' اسرائیلی فوج اور دہشت پسندوں نے فلسطین کی بیشتر عرب آبادی کو انتہائی کسمپرسی کے عالم میں اپنی زمینوں اور گھروں کو چھوڑنے پر مجبور کیا' جبکہ باقی ماندہ عرب آبادی نے آناً فاناً اپنے کو ایک معزز صاحب اکثریت سے ایک محروم مظلوم اقلیت میں تبدیل ہوتے اور اپنے ہی وطن میں غریب الوطن ہوتے پایا"(۱۳۶)

اپنے وطن کی زمین میں اس طرح پیوست ہے کہ زخم سہنا ہے۔ اذیت برداشت کرنی ہے۔ مگر اسے تنہاء اور بے آسراء چھوڑنا گوارا نہیں، اسی لیے اپنی سچی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے فلسطین کے درختوں اور چٹانوں پر اپنا نام لکھ رہا ہے، جسے وقت کی آندھی بھی نہیں مٹا سکتی، اپنے دل کی ہر دھڑکن اس کے نام کر دی ہے، بس لب پہ اسی کا نام اور آنکھوں میں اسی کی تصویر ہے۔

بلادی کتبت اسمی باسنانی
علی اشجارہا وصبخورھا

محمود درویش کی شاعری میں مرثیہ کے عناصر کے ساتھ ساتھ رزمیہ آہنگ بھی در آیا ہے۔ محمود درویش نے شاعری کا محاذ سنبھالتے ہوئے فلسطینیوں کا حوصلہ بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اپنے ایک مضمون "ارض فلسطین کا جیالا شاعر محمود درویش" میں لکھتے ہیں:

"اپنے چھینے ہوئے وطن کی بازیابی کے لیے فلسطینی پچھلی دہائیوں سے ایک بے حد سرگرم جدوجہد میں مصروف ہیں اس جدوجہد کو اپنی شاعری کے حوالے سے محمود درویش نے ایک رزمیہ حوصلہ دیا درویش کی آواز کے ارتعاش سے فلسطینیوں نے اپنے نغموں کو آزادی کی آنچ دی "انتفاضہ" کے حوالے سے محمود درویش جیسے شاعروں نے جبر و ظلم اور زور زبردستی کے خلاف سینہ سپر ہوئے رجز گانے کا حوصلہ دیا"(۱۳۷)

محمود درویش عربی ادب خاص کر فلسطینی مزاحمتی ادب میں ایک معتبر نام ہے۔ فلسطینی عوام کی ترجمانی بہترین انداز میں کی ہے اور یوں فلسطینی مزاحمتی تحریک کو اپنی مزاحمتی شاعری سے مزید تقویت دی' حوادث زمانہ کی نذر ہونے سے محفوظ رکھا صرف یہی نہیں بلکہ اپنی شاعری کے ذریعے فلسطینی مزاحمتی تحریک میں نئی روح پھونکی ہے۔ ارشد حسین اپنے ایک مضمون محمود درویش فلسطین کی مزاحمتی تحریک کی بے باک آواز" میں لکھتے ہیں:

"محمود درویش کی ابتدائی شاعری کلاسیکل عربی اسلوب میں ہے اور بعد میں انہوں نے شعر حر (آزاد نظم) Free Verse کا اسلوب اختیار کیا ان کی نظمیں جیسے عاشق من

فلسطین، قصیدہ بیروت، مدالظل العالی، بطاقۃ ھویہ وغیرہ فلسطین کی تحریک مزاحمت پر گلہائے عقیدت ہیں۔۔۔ان کا شعری مجموعہ " اوراق الزیتون"Olive Treesمزاحمتی شاعری کاایک نادر نمونہ ہے۔اس کی شاعری ظلم سے آزادی'جبر وتسلط کے خلاف بغاوت 'آزادی کاخیال اور مشاہداتی تجزیہ نگاری کافتوٰی ہے "(۱۳۸)

محمود درویش کی شاعری فلسطین کاروزنامچہ ہے۔انہوں نے ہر چھوٹے بڑے واقعے کو مد نظر رکھتے ہوئے فلسطین پر مشتمل مزاحمتی شاعری کی ہے۔جیسا کہ فلسطین کے روزانہ کے نقصانات کو ان الفاظ میں شعری صورت دے رہے ہیں:

ہمارے نقصان کا روز کا تخمینہ / دو سے آٹھ ہلاکت کا شکار ہوتے ہیں / دس
دوسرے زخمی / بیس مکان مسمار / زیتون کے پچاس پیڑ جڑ سے اکھاڑ دیے جاتے ہیں (۱۳۹)

اگر سوال کیاجائے کہ فلسطین کے بارے میں محمود درویش شعر کیوں لکھتے ہیں؟توجواب یہی دیاجائے گا کہ محمود درویش عاشق ہے اور ارضِ فلسطین اس کی محبوب ہے۔ہر عاشق اپنے معشوق کے ذکر میں ہی ہوتا ہے۔اسی لیے محمود درویش نے فلسطین کو معشوق کی طرح چاہااور ایک مجموعے کا تو نام ہی عاشق من فلسطین رکھا اس بارے میں منو بھائی کہنا ہے کہ "عاشق من فلسطین "۱۹۶۶ء میں شائع ہوئے۔اس مجموعے کا نام بھی غور طلب ہے'یہ محض فلسطین کا عاشق نہیں ہے بلکہ عاشق ہے جو فلسطین" سے " آیا ہے۔یوں اس دور کی نظموں میں مزاحمت اور سیاسی غصے کا رنگ واضح ہے (۱۴۰)

د۔ محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کی جہات:

محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کو مزید گہرائی سے دیکھیں تو ان کی مزاحمتی شاعری کو کئی جہات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

i۔ فلسطین پر مشتمل مزاحمتی شاعری

ii۔استعماری قوتوں کے خلاف مزاحمتی شاعری

iii۔ معاشرتی رویوں اور طبقاتی نظام کے خلاف مزاحمتی شاعری

IV۔ محمود درویش کی علامتی مزاحمتی شاعری

i۔ فلسطین پر مشتمل مزاحمتی شاعری

محمود درویش کی شاعری کا بنیادی محور فلسطین ہے' محمود درویش کی شاعری میں فلسطین کا غم پنہاں ہے' فلسطین گویا محمود درویش کی شاعری میں زندہ ہے اور محمود درویش کی شاعری فلسطین کی وجہ سے زندہ و تابندہ ہے' فلسطین اور محمود درویش کی شاعری لازم و ملزوم ہے' فلسطین کے عاشق محمود درویش ہیں' فلسطین کو کبھی ماں' کبھی بہن' کبھی زوجہ' تو کبھی محبوبہ کے القابات سے نوازتے ہیں' فلسطین ان کے گوشت پوست میں رچ بس چکا ہے' یہی وجہ ہے کہ محمود درویش فلسطین میں زندگی گزارتے ہیں اور فلسطین محمود درویش کی رگوں میں دوڑتا ہے۔

محمود درویش کی شاعری صرف رومانویت پر مشتمل نہیں ہے' ان کی شاعری میں جہاں رومانوی فضا ملتی ہے وہاں رومانوی انداز میں مزاحمت بھی کارفرما نظر آتی ہے' محمود درویش نے جہاں شاعری کے ذریعے مزاحمت کی وہاں عملی میدان میں بھی فلسطین کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر صیہونیت کا مقابلہ کیا۔ منو بھائی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> "اسرائیل کے صیہونی دانشور اگر محمود درویش کو تنظیم آزادی فلسطین سے بھی زیادہ خطرناک دشمن سمجھتے ہیں تو کچھ غلط نہیں سمجھتے کیونکہ عرب دنیا کے اس مقبول ترین شاعر کا کلام فلسطینی مہاجروں اور مجاہدوں کے لیے اُن کے کیمپوں، خندقوں اور مورچوں میں جنگی پرچم اور جنگی ترانوں کی حیثیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ بیروت کے محاصرے کے دوران جب فلسطین کا انقلابی ریڈیو محمود درویش کی نظمیں نشر کر رہا ہوتا تھا تو وہ خود کسی گلی کے موڑ پر فلسطینی مجاہدوں کے ہمراہ اسرائیلی فوج سے باقاعدہ جنگ میں مصروف ہوتے تھے گویا محمود درویش اپنے عوام کی تحریک کو محض لفظوں اور شعروں کے ذریعے ہی نہیں اپنے خون اور زندگی کے نذرانہ کے ذریعے بھی خراج تحسین کر سکتے ہیں"(۱۴۱)

محمود درویش کی شاعری مزاحمت کی شاعری ہونے کے ساتھ ساتھ احساس کی شاعری بھی ہے۔ محمود درویش کی شاعری میں جہاں فلسطین کے حصول کے لیے مزاحمتی پیرایہ اظہار کا چلن ملتا ہے وہاں محمود درویش نے اپنے اور اپنے جیسے دوسرے جلاوطن ساتھیوں' پناہ گزینوں کے دکھ درد کا احساس کرتے ہوئے شاعری کی یہاں تک کہ دنیا بھر کے مظلومین اور مقہورین کے اوپر روا رکھے جانے والے مظالم کو بھی انہوں نے اپنی شاعری میں جگہ دی یوں محمود درویش بقول حنان اشراوی "اس نے مزاحمت کے شاعر کی حیثیت سے آغاز کیا اور پھر ضمیر کا شاعر بن گیا"(۱۴۲)

جب محمود درویش کا نام شاعری کی دنیا میں مشہور ہونے لگا تو اہل قلم کے ایک گروہ نے یہ آواز اٹھائی کہ محمود درویش کی شاعری میں مزاحمتی رنگ ناپید ہے لہذا کم از کم محمود درویش کی شاعری کو مزاحمتی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ اس کا دفاع محمود درویش نے خود کیا' محمود درویش نے مزاحمتی شاعری کے مفہوم کو اپنے جواب کے لیے بطور مقدمہ پیش کیا پھر محمود درویش نے بھرپور دفاع کیا کہ میری (محمود درویش کی) شاعری مزاحمتی شاعری ہے۔ مزاحمت کی تعریف محمود درویش ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "مزاحمت کی شاعری جیسا کی میں سمجھتا ہوں" وطن کی مدافعت کے مقصد کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہے' ایسی قوتوں کے خلاف مدافعت جو وطن کو اپنے جبر و تسلط میں لانا چاہتی ہیں۔ چنانچہ میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس سے ایک ایسا انسان' ابھر کے سامنے آئے گا جو مختلف صورتوں اور مختلف لبادوں میں وطن کا دفاع ہی کر رہا ہوتا ہے اور میں ہر اس طاقت کا مدمقابل ٹھہر تا ہوں جو مجھ سے میرا حق چھیننا چاہتی ہے" (۱۴۳)

محمود درویش نے اپنی شاعری میں فلسطینی قوم کی مظلومیت کو دنیا کے سامنے آشکار کیا ہے وہاں محمود درویش نے شاعری کے ذریعے آزادی اور بیداری کی روح فلسطینیوں میں پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے یہی وجہ ہے کہ محمود درویش فلسطین کے قومی شاعر بن گئے' اور فلسطین کے قومی ترانہ کے خالق ہونے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہے' اس کی شاعری فلسطین کا نوحہ اور مرثیہ ہے' جس میں مزاحمتی رویہ بھی وسیع کینوس میں ملتا ہے۔ Marwan A Hameed کا کہنا ہے:

> "Darwishe's poetic language of resistance is spontaneous and alive and reflects national belonging to the landscape of the place and the hardships of the people. Further, Darwishe's poetics exposes the catastrophic effects of colonialism and calls people to keep resisting it. He constructs condenses cultural and national resistance within his revolutionary lines by invigorating the feelings of resistance of the masses. He also authenticates the Palestinian people's miseries and deprecates and resists the occupiers' injustices against them. Darwishe's

involvement in the poetics of resistance is one of the key qualities of his overall poetry. Certainly, his poetics challenges the occupiers' atrocities and massacres against the Palestinians embodying the spirit of resistance he poeticizes and publicizes. Thus, his poetics signifies the power of resistance against oppression and reminds the masses of their right to resist and to never forget their homeland"[۱۴۴]

محمود درویش کے کان بچپنے میں ہی وطن، پناہ گزیں، خبر نامے، جنگ اور فوج جیسے الفاظ سے واقفیت حاصل کر چکے تھے یہی وجہ ہے کہ دیر الاسد کے سکول میں ان کے بچپنے کی شاعری میں مزاحمتی رویہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے سکول میں اسرائیلی ریاست کی سالگرہ کے موقع پر ہیڈ ماسٹر کی فرمائش پر محمود درویش نے پہلی بار مائیک کے سامنے کھڑا ہو کر ایک نظم پڑھی بقول محمود درویش "وہ نظم عرب بچے کی یہودی بچے کے سامنے فریاد تھی"[۱۴۵]

محمود درویش کا کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی وہ بحیثیت انسان ہر ایک سے محبت رکھتے تھے یہاں تک کہ یہودیوں سے بھی راہ ورسم تھی' اگر مخالف تھے تو وہ ظلم وجبر کے مخالف تھے' یہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ ان کا معشوق "ریتا" یہودن تھی' اوراسرائیلی کمیونسٹ پارٹی سے بھی وابستہ رہے' یعنی انسانیت دوست تھے' آمریت' بربریت' استحصالیت اوراستعماریت دشمن بھی تھے۔ بقول محمود درویش" میں یہودیت اور صیہونیت کا سب سے مضبوط حریف ہوں' میری یہودیوں سے کوئی دشمنی نہیں' انسان چاہے وہ کسی رنگ کا ہو اور کسی نسل سے اس کا تعلق ہو میرے لیے ایک خزانہ ہے"[۱۴۶] بچپنے میں پناہ گزین ٹھہرے' بیروت میں ریڈ کراس کے صدقے پر زندگی کے ایام گزارنے پر مجبور ہوئے' واپس وطن لوٹے تو نقشہ بدل چکا تھا' یوں ابتدا سے ہی بیگانگی کی فضا قائم ہوئی یہی بیگانگیت زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رہی اوراسی بیگانگیت میں فلسطین کو خیر باد کہہ کر فلسطین کی سرزمین میں جا آباد ہوئے۔ شاید قبر میں بھی محمود درویش کو چین نہ ملا ہو گا وطن جواب بھی پناہ گزینی کی کیفیت میں ہے۔

بچپن میں اندھیری رات دیکھی تھی، جوان ہوئے تو ہر طرف اندھیروں کا راج نظر آیا، بستیاں ویران نظر آئیں، یا خاکی خوبصورت بستی اجڑی سی نظر آگئی۔۔۔ ظلم وجبر کے خوفناک اندھیرے کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا اور جس وطن میں

وہ اجنبی قرار دیئے گئے تھے اس کے لیے جدوجہد اور مزاحمت کی آوازیں بلند کرنی شروع کر دیں۔ ان کی شاعری فلسطینی المیے کی دردناک کہانیاں بیان کرنے لگی۔

ابتداء میں جب فلسطین کا المیہ ابھی تازہ تھا اور صدمہ نے نوجوانوں کی قوت فکر اور قوت ارادی کو مفلوج کر دیا تھا، تو ان کے غم و غصے نے ایک جزئی راہ اختیار کی اور اس کا اظہار فرسودہ معاشرتی و خاندانی قیود و رسومات کے خلاف بغاوت کی صورت میں ہوا۔ لیکن بتدریج تجربہ اور آزمائش کے ذریعے ان پر اپنی کشمکش کے تمام پہلو منکشف ہوتے چلے گئے اور اجتماعی بے انصافی کے خلاف احتجاج اس قومی کشمکش کا ایک جز بن گیا۔ جس کا محور اسرائیلی قبضے کے خلاف جہاد تھا مثلاً شروع میں محمود درویش نے اجتماعی بے انصافی کو مجرد حیثیت سے پیش کیا لیکن بعد ازاں ہم ان کے اشعار میں اجتماعی پہلے کو قومی زاویہ نظر سے اجاگر ہوتے دیکھتے ہیں۔ اور یہ اجتماعی اور قومی کشمکش کا ایک جزو لاینفک بن جاتا ہے محمود درویش اس حوالے سے ان الفاظ میں گویا ہوئے ہیں:

کیا یہ صحیح ہے کہ موت زندگی میں پھیلتی
کیا میں بھی یاد آور ہوں گے
بھوکے کے ہاتھ میں روٹی بن کر۔۔ منہ میں شکر
جلد ان کی یہ ندا وسیع شکل اختیار کر لیتی ہے
اپنی گیسوؤں کے بالوں کو طوفان سے بچاؤ
اور اپنے قدم زمین میں پیوست کر لو
اور اپنے سینوں سے ان کے گرد حصار باندھ دو(۱۴۷)
اپنے سینوں سے اسے کس طرح توڑا جا سکتا ہے؟
سنبل کے بالوں کو گردن سے پکڑ لو
جس طرح خنجر پکڑا جاتا ہے:
زمین، کسان اور اصرار
مجھے بتا ان پر کون غالب آسکتا ہے؟
مجھے بتا ان تینوں کو کون ہرا سکتا ہے؟(۱۴۸)

فاروق حسن کا کہنا ہے:

"اس نے (محمود درویش) نے اپنے ہم وطن فلسطینیوں کو پیش آنے والی تمام تکالیف اوراذیتوں کے خلاف اپنی شعری آواز بلند کی ہے۔اس نے جھلسا دینے والی نظمیں تحریر کی ہیں اور عربی میں پابلونیرودا جیسی بے پردہ حقیقت پسندی میں لپٹی ہوئی اجتماعی اور مزاحمتی شاعری کے دور کا آغاز کیا ہے۔ محمود درویش نے تقریباً پینتالیس برس شاعری کی اور صحافت کی ہے اور وہ فلسطین کا ملک الشعراء کہلائے جانے کا حقدار ہے" (۱۴۹)

محمود درویش نے فلسطین کی پر مزاحمتی شاعری کرنے کے مختلف رنگوں کا بھی سہارا لیا ہے' ان رنگوں میں سے ایک سبز رنگ ہے جو آزادی کی امید اور سر فرازی کا استعارہ ہے "در دیوان درویش رنگ سبز نماد جاودانگی، حیات و سر فرازی کشور فلسطین و مردم آن است۔ رمزی و کنایي آن در حول محور آزادی، مقاومت، همت واراده، وطن پرستی و عزت و کرامت ملت فلسطین دور می زند(۱۵۰) یعنی محمود درویش کی کے دیوان میں سبز رنگ فلسطین کی حیات جاودانی کو بتارہا ہے۔اس لفظ کو آزادی، مقاومت، ہمت وارادہ، وطن پرستی اور فلسطین کی عزت وو قار کے لیے بطور رمز و کنایہ استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ محمود درویش نے اس طرح کے اشعار کہے ہیں: سنظل فی الزیتون خضرته ،غابة الزیتون کانت دائماًخضراء، یسترجع الزیتون خضرته ان مصرعوں میں شاعر فلسطین کا زندہ جاوید رہنے کی طرف اشارہ دے رہے ہیں اور ساتھ حوصلہ دے رہے ہیں کہ عنقریب اسرائیل کے قبضے سے ارض فلسطین آزاد ہو گی۔ صیہونیت کے مظالم کی وجہ سے فلسطین میں خزاں کا موسم ہے اس پت جھڑ میں محمود درویش پر امید ہے کہ زندگی کی رونقیں پھر بہار لے کر آئے گی۔ محمود درویش کی شاعری ابتدامیں عربی روایت کے مطابق آگے بڑھ رہی تھی' جب ان کا مطالعہ وسیع ہوا اور جلاوطنی کے نتیجے میں نئے ادبی افق سے روشناس ہوئے تو آزاد نظمیں کہنے کی طرح ڈالی۔ان کے مضامین دیکھنے میں تو بڑے سطحی معلوم ہوتے ہیں لیکن جب سوچ کو مہمیز دے تو معنویت کی کئی پرتیں سامنے آجاتی ہے۔

اس (محمود درویش) نے کلاسیکی اصناف وروایات سے دانستہ روگردانی کی اور نظموں میں ایسی علامات استعمال کیں کہ فلسطین کے عوام الناس بھی ان سے قربت و یگانگت محسوس کر سکیں۔اس نے زیتون کے باغ' پتھر' چٹانوں' فلسطین کے مخصوص پودوں اور باغوں کا ذکر کیا۔ پیٹر کلارک کے ایک مضمون کے مطابق ان کی ابتدائی نظموں کا دائرہ دستی بم جیسا ہے 'ظاہری طور پر سادہ مگر اپنے اندر معنی کی کئی سطحیں لیے ہوئے۔ان نظموں میں جو غصہ اور ناراضگی کے خلاف احتجاج ہے ان کی نمائندگی "شناختی کارڈ" جیسی نظم سے ہو سکتی ہے (۱۵۱)

محمود درویش کے اصلی مخاطب اسرائیل ہے'لیکن اس نظم شناختی کارڈ(بطاقة هوية)میں محمود درویش ایک اسرائیلی سے مخاطب ہیں۔جو اسرائیلی سپاہی کو بغیر کسی خوف اور ڈر کے اپنی شناخت کروارہے ہیں کہ لکھو!میں عرب سے اپنا رشتہ رکھتا ہوں'

سجل
انا عربی
سلبت کروم اجدادی
وارضاکنت افلحها
انا جمیع اولادی
ولم تترک لنا ولکل احفادی
سوی هذی الصخور(۱۵۱)

ترجمہ:ہاں رجسٹر میں لکھو/میں ہوں عرب/تم نے ہی چھینے ہیں مجھ سے/باغ تھے جتنے میرے اجداد کے/اور چھینا ہے زمین کا وہ قطعہ/جس کو میں اور میرے بچے کاشت کرتے تھے کبھی/تم نے میرے واسطے اور میری نسلوں کے لیے/کچھ نہیں چھوڑا بجز پتھر یہاں(۱۵۲)

محمود درویش فلسطین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔اورانہوں نے اپنے وجود کو اسی میں سمو دیا ہے،ان کی شاعری میں یہ لگتا ہے کہ ان کے خاندان کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے گویا کہ فلسطین کے بغیر ان کے خاندان کا تصور ہی ناممکن ہے۔انہوں نے خود کو فلسطین میں اسطرح ضم کر دیا ہے جیسے پانی میں برف۔ محمود درویش کی شاعری فلسطین کی ڈائری ہے ان کے مطابق فلسطین روزانہ کی بنیادوں پر اس تعداد میں قربانی دیتا ہے:

خسائرنا:من شهيدين حتى ثمانية
كل يوم
وعشرة جرحى
عشرون بيتاً
وخمسون زيتونة(۱۵۴)

ترجمہ:"ہم آئے روز دو سے آٹھ لاشیں اُٹھاتے ہیں'دس زخمیوں کو مرہم کرتے ہیں'ہمارے بیس کے قریب مکانات ملیامیٹ کیے جاتے ہیں صرف یہی نہیں ہر روز پچاس لگ بھگ زیتون کے درخت بھی اکھیڑ دیے جاتے ہیں" محمود نے ان مظالم کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا'فلسطین سے گہری وابستگی اس کی شاعری کی پہچان ہے۔بلکہ

فلسطین محمود درویش سے اور محمود درویش فلسطین سے منسوب رہے۔ فلسطین سے اپنے تعلق کو واضح کرتے ہوئے محمود درویش ان الفاظ کے ساتھ گویا ہوئے ہیں:

"ہم نے اس وطن کو نہ صرف تواسطوری خوابوں سے اور نہ ہی کسی پرانی کتاب کے مصور صفحات سے کھوج کر نکالا ہے اور نہ ہی کسی کمپنی یا ادارہ کی طرح اسے خود سے قائم کیا ہے' یہ تو ہمارے ماں اور باپ کی مانند ہے ہم نے اسے کسی ایجنسی یا دکان سے نہیں خریدا ہے اور نہ کسی دباؤ کے تحت اس سے محبت کرتے ہیں۔ ہم اس کے دل کی دھڑکن اور پرندے کی پرواز کی طرح ہیں' یہ وطن ہمارا ہے اور ہم اس سے منسوب ہیں"(۱۵۵)

فلسطین محمود درویش سے کہیں دور اسرائیلی جھولی میں قید ہے' یہی وجہ ہے کہ محمود درویش فلسطین کو اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ محمود درویش کا ہم و غم فلسطین ہے' وہ اپنی ہر چیز کو فلسطین سے منسوب کرتے ہیں' گویا فلسطین کے بغیر محمود درویش کچھ بھی نہیں جس کا ہر جزو اور عضو فلسطینی ہے اور اس نسبت سے انہیں ناز بھی ہے' لہذا ان کی شاعری میں ان کی ذات اور فلسطین لازم و ملزوم نظر آتی ہے اور گویا یہ ایک دوسرے مدغم ہو گئے ہیں۔

خذيني اين ماكنت
خذيني ؛كيفما كنت
فلسطينة العينين والوشم
فلسطينة الاسم
فلسطينة المنديل والقدمين والجسم
فلسطينة الكمات والصمت
فلسطينة الصوت
فلسطينة الميلاد والموت(۱۵۶)

ترجمہ: لوٹ آؤ / تم اب جہاں بھی ہو / جو کچھ بھی بن گئی ہو / تمہاری آنکھیں فلسطینی ہیں / تمہارا نام فلسطینی / تمہارے خواب و خیال، تمہارا بدن، تمہارے پیر / تمہاری چپ تمہارے بول / تم حیات میں بھی فلسطینی ہو / موت میں بھی فلسطینی رہو گی(۱۵۷)

ان کی شاعری میں غنائیت (Lyricism) بھی ہے مگر یہ غنائیت زخمی پرندے کی سی ہے۔ ایک ناراض جوش اور جذبے والی غنائیت ہے، یہ خفگی اور برہمی کے ساتھ دھڑکتی ہے، معاصر شاعرہ سمی الخضراء الجیوسی کا ان کی شاعری کے بارے میں یہ خیال ہے کہ "محمود درویش کا نغمائی تخیل ان کی نظموں کو نئی کشش عطاء کرتا ہے۔ ان کی شاعری نظریات اور تجزیہ کی نہیں بلکہ تصور اور جذبے کی ہے۔ جس سے داخل جذبہ اور اعلی احساس کا اظہار ہوتا ہے"(۱۵۸)

میں شکست سہنے کا سزاوار ہوں

میرا دشمن جیت کا سزاوار ہے

میں اپنی شکست میں استوار ہوں

میرا دشمن اپنی جیت میں استوار ہے (۱۵۹)

محمود درویش کی مزاحمت تھک کر گھٹنے ٹیک دینے والی نہیں بلکہ ان کی مزاحمت بدستور جاری رہتی ہے اگرچہ دشمن کو فتح حاصل ہو' مزاحمت سے ہاتھ نہیں اُٹھاتے بلکہ جہاں اسرائیل سے مزاحمت روا رکھتے ہیں وہاں فلسطین سے انتہا درجے کا عشق بھی رکھتے ہیں بلکہ یہی عشق ہے جو معشوق کو ظلم کی آماجگاہ بنائے جانے پر محمود درویش کو تحریک دلاتی ہے کہ ظالم کے خلاف بولا جائے تاکہ ظلم کا خاتمہ ہو سکے۔ جہاں عشق ہے وہاں محبوب کے بچھڑ جانے کا غم بھی ہے لیکن محمود درویش نے محبوب (فلسطین) پر صرف گریہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے رزمیہ عناصر کو اپنی شاعری میں شامل کر کے مجاہدین کو نیا حوصلہ دیا ہے۔ اس بارے میں آصف فرخی کا کہنا ہے کہ:

"ارض فلسطین کا جیالہ شاعر محمود درویش اپنے چھنے ہوئے وطن کی بازیابی کے لیے فلسطینی پچھلی دہائیوں سے ایک بے حد سرگرم جدوجہد میں مصروف ہیں اس جدوجہد کو اپنی شاعری کے حوالے سے محمود درویش نے ایک رزمیہ حوصلہ دیا درویش کی آواز کے ارتعاش سے فلسطینیوں نے اپنے نغموں کی آزادی کی آنچ دی "انتفاضہ" کے حوالے سے محمود درویش جیسے شاعروں نے جبر و ظلم اور زور و زبردستی کے خلاف سینہ سپر ہو کے رجز گانے کا حوصلہ دیا" (۱۶۰)

محمود درویش کی شاعری اچانک سے ابھرنے والی مزاحمت نہیں ہے بلکہ یہ شاعری عربی روایت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے' جس کو محمود درویش سمیت دیگر فلسطینی شعرا نے مزید تقویت دی اور فلسطین کے دکھ' درد اور غم کو سموتے ہوئے مزاحمت جیسے اہم فریضے کو بخوبی سرانجام دیئے ہیں۔ منو بھائی کا کہنا ہے کہ:

"محمود درویش اور دوسرے فلسطینی شاعروں کو "فدائین" کا کردار عربی اخبارات نے خود ہی دے دیا تھا۔ چنانچہ انھی "مزاحمتی شعراء" یا مقبوضہ فلسطین کے شعراء لکھا جاتا تھا۔ اور صیہونیت کے خلاف یا عملی جنگ کے "مؤثر ہتھیار" کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اور یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ وہ سرزمین فلسطین پر خود بخود اُگ آنے والی مزاحمت کی پیداوار ہیں۔ جو اچانک اُبھر کر سامنے آگئی ہے" (۱۶۱)

محمود درویش صیہونی عزائم سے نالاں ہیں' ہر چیز پر صیہونی قابض ہیں' شہر پر تاریکی کی فضا مسلط ہے' اس ماحول میں محمود درویش اپنے دل میں جا آباد ہونے کو ترجیح دیتے ہیں بقول ان کے دل کو کوئی محاصرہ میں نہیں لے سکتا۔

شہر پر چھائی ہوئی تاریکی
برس پڑو، کھل کر برسو
اس لیے کہ آج میرا یہ مکمل عزم ہے
کہ میں سرحدوں سے پٹے اپنے چہرے
سے کنارہ کر کے
اپنے دل کی جانب مڑ جاؤں گا
صرف میرا دل ہی ایسا شہر ہے
جو محصور نہیں ہو سکتا[۱۶۲]

محمود درویش نے الفاظ کی جنگ لڑی ہے' شاعری ان کا بڑا اسلحہ ہے' اس میں بم بارود کے ساتھ مجاہدین کے لیے جام وجم بھی ہے۔ ولولہ اور جوش بھی ہے۔ دشمنوں کے لیے یہ ایٹم بم کی مانند ہے؛ مجاہدین کے لیے یہ باعث سرور اور تسکین کے لیے نغمہ اور جذبہ دلانے کے لیے ترانہ بھی ہے۔ محمود درویش اپنی ایک نظم "مردوں کے لیے ترانہ" میں لکھتے ہیں:

ہم اپنے حلقوم سے گولہ باری کی طرح
شاعری برسایا کریں گے
اور نالہ وشیون سے ماورا ہو کر
اسے انگوری شراب میں بدل دیں گے
جسے میلوں ٹھیلوں میں پینے کو پیش
کیا جائے گا، جسے گلیوں
اور فیکٹریوں، کانوں، میدانوں
اور کلبوں میں گایا جائے گا[۱۶۳]

محمود درویش کی شاعری اپنی جگہ ایک محاذ جنگ ہے۔ جس میں مقاومت کے ساتھ مبارزت اور رجزخوانی بھی ہے۔ وہ اپنے آپ کے عربی ہونے پر فخر کرتے ہیں 'گویا وہ اپنی تہذیب اور ثقافت کے دلدادہ ہیں' عرب ہونے' اور شتکار ہونے کو عار محسوس نہیں کرتے بلکہ ان کو اپنی پہچان قرار دیتے ہیں اور بغیر تیر و تلوار کے لڑنا بھی فلسطینی جانتے ہیں۔ گو کہ مزاحمت فلسطینیوں کے پورے وجود میں گوندی ہوئی ہے۔ ان کو مزاحمت کے راستے سے کوئی نہیں ہٹا سکتے۔ محمود درویش اپنی ایک نظم "مردوں کے لیے ترانہ" میں لکھتے ہیں:

نعم!عرب
ولانخجل
ونعرف كيف نمسك قبضة المنجل
وكيف يقاوم الاعزل(۱۶۴)

ترجمہ: ہاں، ہم عرب ہیں اور غیر نادم ہیں
ہمیں درانتی چلانی آتی ہے
ہمیں معلوم ہے ایک بے دست و پا
مزاحمت کیسے کیا کرتا ہے(۱۶۵)

محمود درویش کا دل فلسطین کے دکھ سے مغموم ہے' ساری زندگی اس کا دل فلسطین کے لیے دھڑکتا رہا' دل میں خیالوں میں جذبوں اور خوابوں میں فلسطین کو آباد دیکھے رکھا اور فلسطین کی آبیاری اپنی شاعری سے کرتے رہے" محمود درویش اپنی ایک نظم "انقلابی اور شاعر" بھی ظلم اور جبر کے خلاف استقامت اور پامردی کی کیفیت کی غمازی کرتی ہے(۱۶۶) آزادئ فلسطین کے لیے مزاحمتی شاعری کا سہارا لے کر طاغوت کو للکارتے رہے اور یہاں تک کہہ دیا کہ بیڑیاں جتنی سخت کر سکو کر گزرو' کتابوں اور تمباکو سے محروم رکھو' خون دل میں انگلیاں ڈبو کر' زنجیروں میں جکڑ کر' جیل میں' اصطبل میں' حمام میں مجمع عام میں جلوت اور خلوت میں بھی آزادی کے نغمے گاتا رہوں گا۔ محمود درویش اپنی ایک نظم "تحد" میں اس طرح گویا ہوئے ہیں:

شدو وثاقي
وامنعو عني الدفاتر
والسجائر
وضعوالتراب على فمي
فاالشعر دم القلب
ملح الخبز
ماءالعين

یکتب بالاظافر
والمحاجر
والخناجر (۱۶۷)

ترجمہ: بے شک میرے ہاتھ پیچھے باندھ دو' مجھ سے کتابیں اور سگرٹ چھین لو' میرے منہ میں مٹی بھی بھر سکتے ہو' مگر شعر میرے دل میں دھڑکتا ہوا خون ہے' میری روٹی کا نمک ہے' میری آنکھ کا پانی ہے یہ ناخنوں' پلکوں اور خنجروں سے لکھا جائے گا' غسل خانے میں بھی' اور اصطبل میں بھی گنگناتا رہوں گا' کوڑوں کے نیچے بھی شعر ہوتے رہیں گے' ہتھکڑی کے درمیان بھی' زنجیروں کی جھنکار گاتی رہے گی' میرے اندر لاکھوں بلبلیں ہیں' جو تجھے ترانے سناتی رہتی ہے (۱۶۸)

عرب شاعری میں ایک بڑا نام امر القیس کا آتا ہے' ادب جاہلی میں اسے "اشعر الشعرا" کا لقب ملا۔ اس کی شاعری سے اجڑے دیار پر رونے کی روایت آگے بڑھی' جو کہ عرصہ دراز تک چلتی رہی۔ محمود درویش میں اجڑے دیار پر آہ بکاء ضرور ہیں لیکن وہاں محبوب کے دیار کے اجڑنے کی بات تھی یہاں محبوب بدل کر ملک محبوب بنا تو اسی ملک (فلسطین) کے اجڑنے کو موضوع سخن بنا کر عربی ادب کی اجڑے دیار پر رونے کی روایت میں جدت لائی۔

محمود درویش کی شاعری میں بھی فلسطین کے غم واندوہ میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ فلسطین کی تباہی وبربادی پر نوحہ کناں ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس کی آنکھوں میں امید کی چمک اور ولولے کی دمک بھی ہے۔ وہ ہواؤں کی طرح گھر آنے کا عزم بھی رکھتا ہے۔ وطن اس کے لیے محض داستانوں کا مجموعہ یا یادوں کا گلدستہ نہیں ہے۔ وطن اس کے لیے ہڈیوں میں جلد اور دھڑکتا ہوا دل ہے۔ وہ بے سروسامان ہے لیکن غاصبوں کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہے۔

ہاں تو پہلے ہی صفحے پر سب سے اوپر یہ لکھو
مجھ کو انسانوں سے کوئی بغض یا نفرت نہیں
لیکن اتنا ہے کہ اگر میرا رزق اگر چھن جائے گا
غاصبوں کا گوشت بھی کچا چباؤں گا میں
بس ڈرو تم بھوک سے میری ڈرو
اور میرے غیض وغضب سے ڈرو (۱۶۹)

ایک نظم میں بھی انھوں نے فلسطین سے اپنی حقیقی وابستگی کا اظہار یوں کیا ہے کہ ان کا یہ وطن نہ تو یہودیوں کی طرح خدائی وعدے کی تکمیل ہے اور نہ ہی خوابوں میں اسے دریافت کیا ہے بلکہ یہ ان کا اپنا وطن ہے جہاں وہ صدیوں سے رہتے اور اس کا درد سہتے آئے ہیں۔ اس حوالے سے محمود درویش کا کہنا ہے کہ:

وطنی لیس حزمۃ من حکایا
لیس ذکری ولیس حقل اھلۃ
وطنی لیس قصۃ اونشیداً
ھذاالارض جلد عظمی
وقلبی (۱۷۰)

محمود درویش کی شاعری میں عرب شعرا کی روایت میں تفاخر اورانانیت کے عناصر بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں 'محمود درویش عرب شناخت کو قابل فخر سمجھتے ہیں۔ ان کی مزاحمتی شاعری میں جنگجویانہ قوم پرستی کی تبلیغ نہیں ملتی' البتہ عظمت رفتہ کی بازیابی کی کوشش میں محمود درویش اپنی تہذیب وثقافت کی جڑیں تلاش کرتے ہوئے الفاظ سے اپنے لیے وطن کی تشکیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

فلسطین کو محمود درویش بہت مقدس جانتے ہیں اس کو زمینوں کی سردار قرار دیتے ہیں' شہروں کی ابتدا اور انتہا فلسطین کو گردانتے ہیں' اسے سرزمین فلسطین تو ہی زمینوں کی سردار ہے' تجھ میں زندگی کرنے کا مجھے ہی حق حاصل ہے۔ اس حوالے سے اپنی ایک نظم "اس زمین پر" میں محمود درویش لکھتے ہیں:

ہمارے لیے اس زمین پر وہ سب کچھ موجود ہے جو ہمیں زندگی کرنے کے قابل بناتا ہے
زمین کی محترم خاتون جو تمام ابتدا اور انتہا کی ماں ہے۔
وہ فلسطین کہلاتی تھی۔ بعد ازاں اس کا نام فلسطین پڑ گیا
میری محترم خاتون' چونکہ تم میری محترم خاتون ہو' میں
زندہ رہنے کا مستحق ہوں (۱۷۱)

تحریک آزادی فلسطین کی داستان درویش کی شاعری میں رنگین تر ہو گئی ہے۔ اس کی انگلیاں فگار اور خامہ خونچکاں ہے لیکن وہ وقت کے ہر جبر اور ظلم کے ہر ہتھکنڈے کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑا ہے۔ زمانے کا کوئی فرعون اسے عزیمت کے راستے اے نہیں روک سکا۔ اس کا جو عزم اور بلند حوصلہ تحریک آزادی کے لیے عظیم سرمایہ ہے۔ اس کی نظم "آدمی کے لیے" ظلم کے خلاف ایک للکار ہے۔

سنو۔ او! خونی آنکھوں اور لہو میں ڈوبے ہاتھوں والو!
رات زیادہ دیر نہیں رہتی
بندی خانے ہمیشہ قائم نہیں رہتے
نہ زنجیروں کی کڑیاں ہمیشہ جڑی رہتی ہیں
نیرو مر جاتا ہے روم نہیں مرتا
اپنی ان آنکھوں کے وہ ساتھ لڑتا ہے
اور انہی ان آنکھوں کی بوائی
وادی کو گندم سے بھر دے گی (۱۷۲)

محمود درویش کی شاعری میں صرف تشدد اور اداسی نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری میں تشدد اور اداسی سے آگے جھانک کر دیکھنے کی عینک بھی ہے۔ جو غموں اور دکھوں کے بیان کے ساتھ اس کے پس پردہ عوامل اور وجوہات سے بھی پردہ اُٹھا دیتی ہے۔ لہذا ان کی شاعری میں جہاں جذبات کا وفور ہے وہاں فکر کی جولانی بھی 'فکر اور جذبے کا حسین امتزاج کی شاعری میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ منو بھائی کا کہنا ہے کہ "اور ان کی شاعری سیاسی شعور سے پیدا ہونے والی جذباتی شدت پر شاعری کے تقاضوں کو قربان نہیں کرتی بلکہ جذبات کے ساتھ فکر کو بھی شامل کر کے ان شعری تقاضوں کو اور وسعت اور رفعت دیتی ہے" (۱۷۳)

درویش کی شاعری آزادی کے حصول کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا عزم عطا کرتی ہے۔ سختیاں اور تکالیف اس کی استقامت کو مزید جلا بخشتی ہیں۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں مجاہدوں کے زیور کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ محمود درویش فیض کے قبیلے کا شاعر ہے لہذا روزن زندان کا بجھنا اس کے دل کو منور کر دیتا ہے اور سلاسل کی چھنک اسے آزادی کے نغمے سناتی ہے۔

انہوں نے مجھے اس اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دیا
اور میرا دل دھوپ کی کرنوں سے جگمگا اٹھا
انہوں نے میرا نمبر دیوار پر لکھا
اور دیواروں سبزہ زاروں میں تبدیل ہو گئیں
میں نے اندھیروں کو شکست دی

اور اپنے ہاتھ روشنی کی لہروں میں ڈبو دیے
انہوں نے کچھ بھی فتح نہیں کیا
کچھ بھی فتح نہیں کیا
انہوں نے محض آتش فشانوں کے لاوے کو دہکایا ہے (۱۷۴)

ڈاکٹر آصف چٹھہ کے بقول "محمود درویش وفاداری بشرط استواری کا نام ہے۔ فلسطین کی کہانی درویش کے لہو میں شامل ہے اور اس نے آخری دم تک اس لہو رنگ داستان کو خون جگر سے رقم کیا ہے۔ اس نے وقت کی ہر مصلحت جبر کے ہر حربے اور لالچ کے ہر زاویے کو نظر انداز کرتے ہوئے لفظ کی حرمت کی پاسداری کی ہے اپنے ضمیر کو ہمیشہ زندہ رکھا ہے "(۱۷۵)

محمود درویش کو لفظ کی اہمیت کا اندازہ ہے 'لفظ جلا بھی بخشتا ہے اور جلاتا بھی ہے 'لفظ خواب غفلت کی نیند سونے والوں کو جگانے میں اہم رول ادا کرتا ہے 'لفظ کے سایے میں انسان زندہ رہتا ہے اسی لفظ کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں محمود درویش کے یہ اشعار قابل دید ہیں:

لفظ کی حرمت پر میرا ایمان ہے
چاہے اس کی خاطر میں مر کر خاک ہو جاؤں یا زندہ رہوں
اور دشمن کی گھات میں بیٹھوں
لفظ کی ناریت پر میرا ایمان ہے
چاہے اس آگ میں خود بھی جل کر خاک ہو جاؤں
یا میرا دشمن اس میں بھسم ہو
اگر میں علم ہاتھ میں تھامے کھیت بھی رہوں گا
تو لوگ میرے کتبے پر تحریر کریں گے "وہ شخص جو مرا نہیں تھا"(۱۷۶)

یوں تو لفظ کوئی عظیم الجثہ حیوان کی طرح نہیں لیکن یہ بات ضرور ہے کہ لفظ کی ایک طاقت ہے' اللہ نے "کن "یعنی ہو جا تو کائنات وجود میں آگئی۔ لفظ سے لوگ خوف کھاتے ہیں 'لفظ تلوار ہے جو کاٹنے کا کام بھی جانتا ہے 'لفظ جلانے کا کام بھی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے محمود درویش نے بھی فلسطین کے حق میں اور اسرائیل کی مزاحمت کے

لیے بھی لفظ کا سہارا۔ یہی محمود درویش کے الفاظ ہی ہیں جن کے خوف سے دشمن کے خوابگاہوں میں نیندیں حرام ہو گئی تو محمود درویش کو کہنا پڑا:

میرا شکار مجھے مسلسل دق کیا کرتا ہے

ہر روز سوال کرتا ہے

تم کہاں تھے؟

لغت میں واپس بھیج دو

ان تمام لفظوں کو جو تم نے کبھی ہمیں دیئے تھے

ان کی گونج ان لوگوں کی نیند میں خلل ڈالتی ہے

جو یہاں سو رہے ہیں (۱۷۷)

محمود درویش سماج میں آزادی کے خواہاں اس کے لیے وہ پر امید بھی ہیں' اگر آج ترقی کی راہیں فلسطینیوں کے لیے مسدود ہیں' اگر آج الزام لگایا جائے کہ فلسطینی پناہ گزین ہو' اگر آج آنکھیں خون آلود ہیں' اگر آج فلسطینی' صیہونی سماج میں زیر حراست ہیں تو گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں' ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں انشاء اللہ یہ ظلم اپنے انجام کو پہنچے گا۔ اور حق کی فتح ہو گی' اور ظالم و جابر کا غرور خاک میں مل جائے ان باتوں کا اظہار محمود درویش نے اپنی ایک نظم (عن انسان) " آدمی کے بارے میں " میں کیا ہے' چند ایک اشعار ملاحظہ ہوں:

وضعو علی فمہ السلاسل

ربطوابدیہ بصخرۃ الموتیٰ

وقالو:انت قاتل

اخذو طعامہ والملابس والبیارق

ورموہ فی زنزالۃ الموتیٰ

وقالوا:انت سارق

طردوہ فی کل المراء فی ء

اخذواحبیبۃ لصغیرہ

ثم قالو!انت لاجیء (۱۷۸)

ترجمہ: جس پر بندرگاہوں کے راستے بند کر دیئے گئے' جس کی نوجوان محبوبہ کو اغوا کر لیا گیا' انہوں نے اس پر الزام لگایا: تم پناہ گزین ہو' تم، جس کی آنکھیں اور ہتھیلیاں خون آلود ہیں' رات گزر جایا کرتی ہیں۔

محمود درویش خود بھی محصور رہے اور ساتھ ہی ان کے جاننے والے عزیز و اقارب بھی محمود درویش حالات کی دگر گونی پر گریہ کناں نہیں رہے بلکہ انہوں نے مزاحمتی رویہ اپناتے اپنے قارئین کو زبان بخشی ہے۔ اس بارے فاروق احسن کا کہنا ہے کہ:

"ایک ایسا شاعر کس کا مقدر وہی ہے جو اس کے قارئین کا ہے۔ انہی کی طرح وہ بھی محصور شہروں کا باسی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ انہیں وہ لسان بھی فراہم کرتا ہے جس میں اُن کی روز مرہ کی ذہنی، جذباتی اور جسمانی اذیتیں اور اُن کے آدرش، امنگیں اور خواب بھی بیان کیے جاسکیں"(۱۷۹)

محمود درویش رجائیت کا بھی پیامبر ہے یہ سچ ہے کہ وہ فلسطین کے زخموں کو گنتے گنتے بے حد اداس اور پریشان ہو جاتا ہے۔ گلیلی میں مرتے ہوئے پرندے ان کو بے چین اور مضطرب کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے محبوب وطن کے لیے ہر طرح کی اذیت اور مشقت برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ درویش کے نزدیک وطن وہ رسی ہے جس پر ہر روز خونی کپڑے لٹکائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے خیال میں یہ رسی اس کے دشمنوں کے گلے کا پھندا ضرور بنے گی۔ اس کی زمین بنجر نہیں ہے۔ اور شہیدوں کے خون کی سیرابی ضرور رنگ لائے گی۔ درویش کے مسلک میں لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے' اسی تاریکی سے اجالے جنم لیں گے انہی طوفانوں میں آزادی کے گوہر تابدار پرورش پاکر نمودار ہوں گے۔ دکھوں اور مصیبتوں کے خارزاروں میں پھول ضرور بہار دکھلائیں گے(۱۸۰)

يادامى العينين والكفين
ان الليل زائل
لاغرفة التوقيف باقية
ولازردالسلاسل!
نيرون مات،ولم تمت روما۔۔
بعينها تقاتل
وحبوب سنبلة تموت
ستملا الوادى سنابل(۱۸۱)

ترجمہ: حراست کی کوٹھڑیاں تادیر نہیں رہا کرتیں' نہ ہی زنجیروں کی ریشمی جھالریں' نیرو مر گیا تھا لیکن روم باقی رہا' اس نے اپنی نگاہوں کے بل بوتے پر مقابلہ کیا ہوگا' سوکھی گھاس کے مٹھی بھر بیج' ساری وادی کو نئے خوشوں سے بھر سکتے ہیں(۱۸۲)

محمود درویش لکھنے سے باز نہیں آئے'فلسطین اور فلسطینیوں کو آزادی دلانے کی خاطر محمود درویش گیتوں اور نغموں سے مجاہدین کو جوش دلاتے رہے'اوراب بھی محمود درویش کے نغمے فلسطینیوں میں زبان زدعام ہیں۔ محمود درویش فلسطین کے حق میں بولنے کو عار نہیں سمجھااس کو اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے آخر عمر تک مزاحمتی لب ولہجہ اور لحن کے ساتھ شاعری کرتے رہے'ان کی شاعری کو ترانہ اور پرچم کی حیثیت حاصل ہے'محمود درویش کی شاعری سے ذاق شہادت رکھنے والوں میں نیا جوش اور ولولہ آنے لگتا ہے'ان میں امید کی شمع روشن ہو جاتی ہے اور یوں جذبہ شہادت کے تحت آزادی کے لیے میدان عمل میں اترتے ہیں اور جام شہادت نوش کرنے کو اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ محمود درویش کی شاعری سے یہ عرفان حاصل کر جاتے ہیں کہ ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرتے ہوئے شہید ہونا بڑا مقام رکھتا ہے'پس محمود درویش کی شاعری فلسطین پر صرف مرثیہ یا نوحہ نہیں ہے بلکہ آزادی فلسطین کے حوالے سے ایک اہم ترین ہتھیار ہے۔ اوراس ہتھیار کو اس وقت کر بروئے کار رکھنے کا برملا اظہار کرتے ہیں جب تک مزاحمت اجتماعی روپ میں آکر فلسطین کو آزاد نہ کرادے۔ اپنی ایک نظم "طوفان کا وعدہ" میں محمود درویش لکھتے ہیں:

خوشی کے گیت اس وقت تک گاتا رہوں گا
جب تک
یہ طوفان میری دھرتی کو نہ گھیر لے
ہاں طوفانوں نے مجھ سے نئی شرابوں کی قوس قزح
کا وعدہ کیا ہے(۱۸۳)

وطن کی محبت محمود درویش کی شاعری کی پہچان ہے'وطن کو خوبصورت دیکھنے کا عدسہ محمود درویش کی اپنی شاعری ہے وہ شاعری کے ذریعے وطن کے خدوخال کھینچتے ہیں'وطن کا خاکہ نہایت چابک دستی کے ساتھ کھینچتے ہیں'وہ بھی اس وطن کا نقشہ جسے بھیڑیوں نے مسخ کیا'اس وطن کا نقشہ جسے بموں سے اڑایا گیا'اس وطن کا نقشہ جس کے چاہنے والوں کو موت کی راہ دکھادی'اس وطن کا نقشہ جس کے چاہنے والوں کو دربدر کی خاک چھاننے پر مجبور کیے گئے'اس وطن کا نقشہ جس سے عشق کرنے والوں کو بے دخل کر کے جعلی دستاویز رکھنے کا الزام عائد کیا'اس وطن کا نقشہ جسے خنجر اور تیز ہواؤں میں محصور رکھا۔ محمود درویش کی شاعری اسی وطن کی تلاش میں مزاحمتی پیرایہ اظہار کے ساتھ نمو پاتی

ہے۔جب تک فلسطین کا مسئلہ رہے گا'لوگوں'بازاروں'گلی کوچوں'مورچوں'اداروں اور ایوانوں میں محمود درویش کی شاعری کے نغمے گونجتے رہیں گے اور مجاہدین کو نیا انقلابی اور مزاحمتی حوصلہ ملتا رہے گا۔

ii۔ سماجی رویوں اور ظلم وجبر کے خلاف مزاحمتی شاعری:

فلسطینی شاعر محمود درویش سلیم ایک سماجی اور عصری شعور رکھنے والے شاعر ہیں۔محمود درویش نے ناظم حکمت'گارشیا'پابلو نرودا سے اثرات لیے ہیں وہاں کارل مارکس کے نظریہ سے بھی کافی حد تک استفادہ کیا ہے۔محمود درویش اپنے سماج میں جب بنیادی حقوق کی پامالی دیکھتے ہیں تو چپ سادھ لینے کی بجائے اعتراض'احتجاج اور مزاحمت کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں'ان اغراض ومقاصد کے لیے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا جس کی وساطت سے قابض اور صیہونی حکومت کے خلاف قلم کو جنبش دیتے رہے۔ابوالکلام قاسمی کا کہنا ہے کہ

> محمود درویش ایک متعہد(Committed)شاعر ہیں۔اور براہ راست انقلابی اوراشتراکی ادب سے ثانوی تعلیم کے زمانے ہی میں آشنا ہوئے۔انہوں نے گورکی اور لینن کا مطالعہ کیا'جس سے زندگی میں روشنی کا ایک نقطہ نمودار ہوا۔اس کے علاوہ اس ادبی تحریک نے ان کے ذہن پر اثر ڈالا جو وابستگی کے نام سے مشہور ہے۔اس تحریک کو عرب دنیا میں پانچویں دہائی میں کافی تقویت ملی'اور پوری عرب دنیا اس سے براہ راست متاثر ہوئی[۱۸۴]

ان کا بغض وعناد انسانیت سے نہیں غاصب قوتوں سے ہے جو سماج میں آزادی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔اور جو معاشرے میں استحصال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتیں الغرض ان تمام عناصر سے محمود درویش کو کوفت ہوتی ہے'گھن آتی ہے اور ان سے نفرت کے ساتھ ان کو وحشت بھی آتی ہے'ان کیفیات کا اظہار انہوں نے اپنی شاعری میں نہایت شائستہ انداز میں کیا ہے یہ انداز اظہار دلوں کو موہ لینے والا اظہار ہے جس میں سوز و گداز اور گھن گرج کے ساتھ کمال کی نغمگی بھی ہے۔محمود درویش کا کہنا ہے کہ:

> "زمین میرے لیے صرف زمین نہیں ہے'درخت میرے لیے محض درخت نہیں ہیں'شام کوئی سی شام نہیں ہے۔اس لیے کہ میں فطرت(Nature)کا شاعر نہیں ہوں۔میں ایک سرزمین کا شاعر ہوں'وطن کا شاعر ہوں اور میرا اعتراض واحتجاج جزء کی طرف سے کل کے خلاف نہیں ہے بلکہ ایک قابض ومعاند کے خلاف ہے۔میں اپنے جیلر سے بات کرتا ہوں تو صرف اس لیے کہ میں بولنا چاہتا ہوں اور مسلسل تنہائی سے وحشت ہوتی ہے اور اگر میں اپنے

جیلر کی بیوی سے نفرت نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان لوگوں کے ساتھ گھل مل گیا ہوں"(۱۸۵)

محمود درویش کی جنت فلسطین ہے' اسی جنت گم گشتہ کی تلاش میں اس کی شاعری رواں دواں ہے' اس کے لیے انہوں نے ہر طرح کی قربانی دی' سماج سے کٹ جانے کو برداشت کیا' جیل جانے کو بخوشی قبول کیا' زنجیروں میں جکڑنے کو ترجیح دی' بے خانماں زندگی گزارنے پر مائل ہوئے' صرف اور صرف فلسطین کی خاطر۔ صرف مصیبت نہیں جھیلیں بلکہ طبقاتی اور سماجی استحصال کے خلاف اس قدر توانا مزاحمتی شاعری کی کہ صیہونیوں کی نیندیں حرام ہو گئیں' بدلے میں صیہونیوں نے ان پر لاکھ مصائب کے پہاڑ توڑے لیکن محمود درویش نے لفظی اور سیاسی سطح پر اپنی مقاومت اور مزاحمت جاری رکھی۔

ان کی شاعری میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے جو ان کے خیال میں نہ تو جنت گم شدہ ہے، نہ اندلس کی طرح صرف یاد کہ یہ ایک حقیقت ہے۔ فلسطین صرف ماضی نہیں بلکہ مستقبل بھی ہے اور اسی مستقبل کے لیے محمود درویش کی جدوجہد جاری ہے۔ یہ ان کے وجود کی جنگ ہے، اس زمین کے لیے جو ان کی سوچ سے جڑی ہوئی ہے اس کی خاطر ہر طرح کی مشقت اور اذیت برداشت کرنے کو تیار ہیں(۱۸۶)

محمود درویش کی شاعری میں اشتراکی فکر غالب ہے' اسی فکر نے اسے انقلابی اور مزاحمتی شاعر بنایا۔ انہوں نے صرف مسلمان ہونے کے ناتے صیہونیت کی مخالفت نہیں کی بلکہ مذہب سے بالاتر ہو کر انسانیت کی خاطر انہوں نے سماج میں انسانیت دشمن صیہونیت پالیسی کی مخالفت کی اور یوں انہوں نے مزاحمتی شاعری کا بیڑا اٹھایا۔

اشتراکیت سے وابستگی نے محمود کو ایک رجائی شاعر بنایا۔ ان کے اندر انسان دوستی کی صفات پیدا کیں۔ انہوں نے مذہبی حدبندیوں کے ماوٗرا انسانیت کو اپنا مذہب قرار دیا۔ محمود کہتے ہیں:" میں یہودیت اور صیہونیت کا سب سے مضبوط حریف ہوں' مجھے یقین ہے کہ یہ چیز خود یہودیوں کے لیے بہت خطرناک ہو گی' لیکن ایک انسان ہونے کے ناطے یہودیوں کے تیئں نفرت کا جذبہ نہیں رکھتا یہی جذبات میری شاعری میں موجود ہیں(۱۸۷) محمود درویش کو کئی بار جلاوطن کیا گیا' کئی بار خود سے جلاوطنی اختیار کی تو کبھی پناہ گزینی کا عذاب سہنا پڑا۔ جلاوطنی نے محمود درویش کے ذہن وفکر کو مزید جلا بخشی۔ نئے زاویے سے چیزوں کو دیکھنے کا موقع ملا' محمود درویش یہ سمجھ چکے تھے کہ صیہونی کارستانیاں صرف فلسطینی سماج کے استحصال تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کے عزائم اور منصوبے پورے عالم اسلام خاص کر مشرق وسطیٰ تک کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ اس بارے میں منو بھائی کا کہنا ہے کہ

جلاوطنی انھیں وطن کے ہی قریب نہیں لائی وطن کو درپیش مسائل اور ان مسائل کے پیچھے کار فرما عوامل اور ان عوامل کے پیچھے موجود سازشوں کے ادراک کے بھی قریب لے آتی ہے۔ انھیں عالمی سیاست کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور یہ پتہ چلا کہ فلسطین کی جنگ کے محاذ صرف اسرائیل کے قبضہ میں دی گئی حدود تک ہی نہیں ہے۔ صیہونیت کے ناپاک ارادوں اور خوفناک خفیہ منصوبوں کی زد میں آنے والے تمام عرب ملکوں بلکہ تمام عالم اسلام میں پھیلے ہوئے ہیں۔ صیہونیت صرف فلسطین پر ہی قابض نہیں ہے۔بڑی طاقتوں کی معیشت پر بھی قابض ہے، عالمی ذرائع ابلاغ پر بھی قابض ہے اور ان طاقتوں کی خارجہ پالیسیوں اور جنگی حکمت عملیوں کی تکمیل بھی صیہونیت کے ہاتھ میں ہے"(۱۸۸)

افریقی ادب کی تحریک Negrilude کی طرح فلسطین کے شاعروں نے بھی اسرائیلی جارحیت کے خلاف احتجاج کیا۔ لیوپلڈ سنگھور، نگوئی واتھیاگو، جبرنیل ادکارا کی طرح فلسطین میں سمیع القاسم، محمود درویش، سالم جبران، اور توفیق زیاد اُبھرے۔ اور اسرائیل کے ظالمانہ نظام کے خلاف عَلم بغاوت بلند کیا۔ انھوں نے مادرِ وطن کی آزادی کے ساتھ شعور کی آزادی کے لیے بھی جنگ شروع کی۔بے بنیاد مذہبی اعتقادات، منفی سماجی افکارات اور مجہول تصورات کے خلاف بھی آوازیں بلند کیں۔ اشتراکی افکار واقدار نے ان کے شعور کو روشنی بخشی اور عزم کو استحکام عطاء کیا(۱۸۹)

محمود درویش فلسطین میں آزادانہ زندگی کے خواہاں ہیں'آزاد زندگی تب میسر آسکتی ہے'جب سماج میں مساوات قائم ہو'باہمی ہم آہنگی ہو اور طبقاتی نظام رائج نہ ہو'بات جب فلسطین کی آتی ہے تو فلسطین میں آزادی ہے نہ باہمی اتفاق وہم آہنگی'ایک اضطرابی کیفیت چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔سماج میں اسرائیلی استحصال کی وجہ سے فلسطینی اپنے معاشرے سے بھی بیگانہ نظر آتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ فلسطین اور فلسطینی معاشرہ سے الگ نہیں ہوئے۔اس حوالے سے کہنا ہے ابوالکلام قاسمی کا کہنا ہے:

"اپنے وطن کی زمین میں اس طرح پیوست ہیں کہ زخم سہنا ہے، اذیت برداشت کرنی ہے، مگر اسے تنہاء وبے آسراء چھوڑنا گوارا نہیں، اسی لیے اپنی سچی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے فلسطین کے درختوں اور چٹانوں پر اپنا نام لکھ دیا ہے وقت کی آندھی بھی نہیں مٹا سکتی۔ اپنے دل کی ہر دھڑکن اس کے نام کر دی ہے۔ لب لب پہ اسی کا نام اور آنکھوں میں اسی کی تصویر ہے جس کے لیے زندگی کی طویل اور خوفناک راتیں کاٹی ہیں"(۱۹۰)

فلسطین کے گاؤں البروہ میں پیدا ہونے والے محمود درویش صرف سماجی استحصال پر ہی گریہ نہیں کرتے بلکہ وہ تو اس سماج کی بات کرتے ہیں جسے ہی صیہونیوں نے محبوس رکھا ہوا ہے۔ الغرض محمود درویش کو سکول پڑھنے کے دوران ہی سماجی اور طبقاتی تفاوت کا احساس ہو چکا تھا۔ جب وہ پہلی بار ڈائس پر گئے تو انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ شاعری کی کہ

تم اپنی مرضی کے مطابق دھوپ میں کھیل سکتے ہو
اور اپنے کھلونے لے سکتے ہو
مگر میں ایسا نہیں کر سکتا
تمھارے پاس رہنے کو گھر ہے
میرے پاس نہیں ہے
تمھارے ہاں خوشیاں ہیں
مگر میرے پاس کچھ نہیں
ایسا کیوں نہیں کہ ہم ایک ساتھ کھیل سکیں (۱۹۱)

ایک لحاظ سے اس نظم کی اس لیے بھی اہمیت بنتی ہے یہ نظم محمود درویش نے سکول میں طالبعلمی کے دوران 'اسرائیل کی سالگرہ کے موقع پر اسرائیلی عوام واہلکار کے سامنے پہلی بار مائیک پر سنائی۔ یہ سماج میں استحصال اور طبقاتی تفاوت پر مشتمل مزاحمتی نظم ہے۔ اس نظم میں ایک معصوم بچے کا احتجاج ہے جو اپنے بچپنے میں ہی استحصال زدہ ہونے کا نوحہ پڑھ رہا ہے۔ جس کا ہر لمحہ درد و کرب اور رنج والم میں گزر رہا ہے۔ جو ڈرا ہوا سہا ہوا ہے' جس نے تلخیاں دیکھی ہیں' جسے اپنے وجود کا محفوظ احساس تک نہیں' جسے خواب کا لطف اُٹھانے کا موقع ہی نہیں ملا' دیکھا جائے تو یہ ایک بچے کی آواز نہیں ہے' بلکہ یہ ہر فلسطینی بچے کی آواز ہے جنہیں استحصالی اور طبقاتی جبر کی وجہ سے کھیل کی خوشیاں بھی میسر نہیں۔ لہذا اس نظم کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ محمود درویش کی آواز صرف اس کی اپنی آواز نہیں بلکہ ہر فلسطینی کی ترجمان' محمود درویش کی آواز اور ان کی شاعری ہے یہی وجہ ہے محمود درویش کو "فلسطین کی سانس" کا لقب ملا۔

استحصال زدہ سماج میں محمود درویش ناامید نہیں ہوئے' وطن سے شدت تعلق اور گہری وابستگی کے جذبے ہی نے محمود کے اندر رجائیت پیدا کر دی ہے کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی مایوسی کی چادر نہیں اوڑھے بلکہ امید کے در وا رکھتے ہیں کہ ان کے خیال میں ظلم و تشدد سے امیدوں اور حوصلوں میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ اور مقبوضہ وطن کو

ظالموں کے پنجوں سے چھڑانے کا جذبہ تقویت پاتا ہے۔اس کے تمام تر ہزیمتوں کے باوجود ان کے خواب کا پرچم بلند ہے۔ کہ انھیں یہ یقین ہے کہ ایک دن یہ وطن ضرور واپس ملے گا۔ ایک نہ ایک دن یقیناً سماج بھی واپس ملے گا' سماجی اور طبقاتی استحصال کا خاتمہ ہو گا یہی وجہ تھی کہ محمود درویش کسی بھی محاذ پر شکست قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ یہ طوفان و مصائب ان کے حوصلوں کو اور بڑھاتے ہیں اس لیے اگر آنکھیں خوف سے بھری ہوئی ہیں۔ پھر بھی خوشی کے گیت لکھتے ہیں۔ کہ انھی طوفانوں اور مشقتوں کی کوکھ سے آزادی کی صبح طلوع ہو گی۔

محمود درویش جب سماج میں اظہار کی پابندی دیکھتا ہے' حقوق کی پامالی دیکھتا ہے' اپنی مٹی پر غیروں کے قدم دیکھتے ہیں اور اپنی زمین میں اغیار ہل چلاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو محمود درویش کچھ نہیں کرتا شاعری کرتا ہے' اس کی شاعری میں مزاحمت ہے' اس کی شاعری میں بغاوت ہے اور اس کی شاعری میں روشن مستقبل کی نوید ہے۔ اپنی ایک نظم "یسوع مسیح کے ساتھ" میں کہتے ہیں:

مع المسیح
آلو
ارید یسوع
نعم من انت
انا احکی من "اسرائیل"
وفی قدمی مسامیر وکلیل---
اقول لکم اماما ایھاالبشر (۱۹۲)

ہیلو، کیا مسیح یہاں موجود ہے؟ / ہاں، تم کون ہو؟ / میں اسرائیل سے بات کر رہا ہوں / میرے پاؤں صلیب میں گڑے ہیں / اور کانٹوں والی پھولوں کی چادر / میرے ہاتھوں میں ہے / میں کس طرح جاؤں؟ / اطاعت قبول کرلوں اور مستثنٰی ہو جاؤں / یا مزاحمت کروں اور آزار بھگتوں؟ میں تمہیں کہتا ہوں آگے بڑھو اے لوگو (۱۹۳)

صیہونی اپنے آپ کو اللہ کا چہیتا فرض کرتے ہیں اور دیگر تمام اقوام کو اپنا غلام سمجھتے ہیں' درحالانکہ انصاف سے دیکھا جائے تو تمام انسان 'انسانیت کے اعتبار سے برابر ہیں اور ہر ایک کا حق ایک دوسرے پر یقیناً عائد ہوتا ہے۔ صیہونیوں نے فلسطین کو اپنی جاگیر سمجھتے ہوئے ہولوکاسٹ کا ڈرامہ رچا کر ناجائز قبضہ جمایا۔ اور مسلمانوں کی اکثریتی آبادی سے مسلمانوں کو نکال کر اقلیت میں تبدیل کر دی۔ فلسطینیوں کا صرف سماجی استحصال نہیں ہوا بلکہ محمود درویش کے گاؤں "البروہ" سمیت کئی شہر ہی تباہ ہوا' پورا سماج بلڈوز ہوا۔ یہ سماج کا استحال ایک انوکھا استحصال ہے' ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ صرف ایک معاشرہ یا سماج کا استحصال نہیں ہوا بلکہ پیروں تلے پورے ملک

اور وطن کو کھینچ لیا گیا اس سے بڑا استحصال اور کیا ہو سکتا ہے۔ محمود درویش نے اپنی شاعری میں اپنے گاؤں 'گھر' سماج اور وطن کو زندہ رکھا' اور کوسوں دور گئے ہوئے وطن کی تلاش میں سرگرداں پھرتے رہے' اتنی شدت کی چاہت ہوئی کہ فلسطین ان کی شاعری میں نظر آتی ہے اور خود فلسطین میں نظر آتے ہیں۔ گویا یک جان دو قالب ہو گئے ہوں' لہٰذا فلسطین اور محمود درویش کی شاعری میں تفریق پیدا نہیں کر سکتے یہ دونوں جزولاینفک ہیں۔ لہٰذا محمود درویش کی شاعری استحصال چاہے سماجی ہو یا طبقاتی اور یا کہ سیاسی ہر طرح کے استحصال کی شدید مخالفت کرتی ہے اور اجتماعی عادلانہ نظام کے محمود درویش متمنی ہیں۔ فاروق حسن کا کہنا ہے:

> ادبی حلقوں میں محمود درویش کو عصر حاضر کا سب سے بڑا عرب شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ غاصبوں 'ظالموں اور درندوں کے خلاف اس کی نظمیں ہتھیار کا کام کرتی ہیں۔ اور لفظوں کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے۔ جب تک سرزمین فلسطین ایک گھناؤنے ناسور کی طرح رستی رہے گی۔ محمود درویش اور فلسطین میں تفریق ممکن نہیں رہی۔ دونوں ایک دوسرے میں سما کر یک جان اور یک قالب ہو چکے ہیں اور محمود درویش ہی فلسطین ہے اور فلسطین ہی محمود درویش (۱۹۴)

محمود درویش سماج میں آزادی کے خواہاں اس کے لیے وہ پر امید بھی ہیں' اگر آج ترقی کی راہیں فلسطینیوں کے لیے مسدود ہیں' اگر آج الزام لگایا جائے کہ فلسطینی پناہ گزین ہو' اگر آج آنکھیں خون آلود ہیں' اگر آج فلسطینی 'صیہونی سماج میں زیر حراست ہیں تو گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں' ظلم کے میعاد تھوڑے ہیں انشاء اللہ یہ اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ اور حق کی فتح ہو گی' اور ظالم وجابر کا غرور خاک میں مل جائے ان باتوں کا اظہار محمود درویش نے اپنی ایک نظم " آدمی کے بارے میں " میں کیا ہے' چند ایک اشعار ملاحظہ ہوں:

جس پر بندرگاہوں کے راستے بند کر دیئے گئے
جس کی نوجوان محبوبہ کو اغوا کر لیا گیا
انہوں نے اسپر الزام لگایا: تم پناہ گزین ہو
تم، جس کی آنکھیں اور ہتھیلیاں خون آلود ہیں
رات گزر جایا کرتی ہیں (۱۹۵)

iii۔ استعماری قوتوں کے خلاف مزاحمت:

فلسطین پر بظاہر تو اسرائیلیوں نے قبضہ کیا لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو اس کے پیچھے عالمی استعماری طاقتوں کی پشت پناہی کارفرما ہے' یہی وجہ ہے کہ پورا عرب مل کر بھی اسرائیل کو رام نہ کر سکے بلکہ اہل عرب کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ لہذا فلسطین کے حق میں آواز بلند کرنا گویا استعماری فکر سے انکار اور ان کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے مترادف ہے۔ الغرض فلسطینی شعرا بشمول محمود درویش فلسطین کو استعماری چنگل سے آزادی دلانے لیے میدان عمل میں اترے اور کئی زندہ نظمیں ایسی دیں کہ فلسطینی عوام کی زبان زد عام ہو گئیں اور انقلاب و مزاحمت کے لیے ٹھہرے پانی میں پتھر کے کام کر گئیں اور یوں مزاحمت و انقلاب کی شمع فلسطینی لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوئی اور میدان عمل میں جوش اور ولولے کے ساتھ شوق شہادت لے کر ایسے اترے کہ جنھوں نے اپنی موت کی پرواہ کیے بغیر آزادی کی خاطر ٹینکوں کے نیچے جام شہادت نوش کرنے فخر پر محسوس کیا۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی استعمار اور استکبار سمیت اسرائیل نے محمود درویش کی شاعری کو اپنے وجود کے لیے خطرہ سمجھا اور اس کی شاعری کو شامل نصاب کرنے سے بھی یکسر انکار کر دیا۔ منو بھائی کا کہنا ہے کہ

> "۱۹۴۸ میں جب ریاست اسرائیل کا قیام عمل میں آیا اور پر تشدد طریقے سے عرب باشندوں کو وطن سے ہجرت پر مجبور کیا گیا اور اسرائیل نے پر تشدد جارحیت کا آغاز کر دیا تو اندرون فلسطین مزاحمتی شاعری کی بنیاد پڑی اور فلسطینی شعراء بھی تیسری دنیا کے اس انقلابی ادبی قافلے میں شامل ہو گئے۔ جن کا بنیادی مقصد نو آبادیاتی شکنجوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے منظم طور پر جدوجہد کرنا تھا"(۱۹۶)

ایک شاعر کو جہاں دیدہ ہونا چاہیئے اگر اس کی نظریں اپنے آس پاس تک محدود رہیں تو وہ بڑے وژن کے حامل شاعر نہیں بن سکتے' عالمی سیاست، عصر حاضر سے آشنائی اور تاریخ کی صحیح تفہیم اور تعبیر سے ہی فکری بالیدگی آتی ہے' نتیجے میں ایک اچھا اور جہاں دیدہ اور سماجی شعور کے حامل شاعر بن سکتا ہے' محمود درویش بھی ان نمائندہ شعرا میں سے ہیں جن کی نظریں صرف اپنے وطن پر نہیں رہیں بلکہ دنیا کے کونے کونے میں بسنے والے استعمار کے ہاتھوں یرغمال تیسری دنیا کی نسلوں تک جا پہنچیں۔ ابو الکلام قاسمی کا کہنا ہے کہ:

> ایسا نہیں ہے کہ محمود درویش کی شاعری صرف فلسطینی المیے تک محدود ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ اسے ترجیحی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن وہ دنیا کے تمام مقہور و مظلوم۔ تاریک، بہیمانہ طلسم

میں جکڑے ہوئے، کرب و اذیت میں ڈوبے ہوئے، خاناں برباد، استعماری قوتوں کے شکار، خون سے آزادی کی تاریخ لکھنے والے افراد کے لیے انسانی وحدت و کلیت پر مکمل یقین کے ساتھ نغمہ انقلاب گاتے ہیں۔اور ان کی آواز کیوبا، ویت نام، افریقہ اور الجزائر میں خونی جد وجہد کرنے والے عوام میں بھی گونجتی ہے کہ ان کا درد مشترک ہے، دنیا کی تمام حریت پسند اور انقلابی تحریکوں سے وابستگی کا جذبہ ہی ان کی شاعری کو عالمی بُعد عطاء کرتا ہے۔اور وہ تاریکی سے روشنی کی طرف بڑھتے ہوئے قافلے کی حدی خوانی کرتے ہیں اور ان کے عزائم کو حوصلہ عطاء کرتے ہیں (۱۹۷)

جدید عرب شاعری میں اگر فلسطین کے محمود درویش اور سمیع القاسم اور شام کے اوویس اعلی احمد سعید نے سب سے زیادہ مقبولیت پائی ہے تو اس کی وجہ محض عرب دنیا اور فلسطین کے مخصوص حالات ہی نہیں ان شاعروں کا وہ فکری شعور بھی ہے جو عہد حاضر کے المیہ ہیں۔ مثلاً پوری انسانیت کی حالت زار سے باخبر ہے اور یوں محمود درویش محض فلسطین کے شاعر ہی نہیں رہتے بلکہ تمام دنیا میں پھیلی ہوئی دکھی انسانیت کے شاعر بن جاتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں صرف دوسری جنگ عظیم کے بعد کے سالوں میں عرب اسرائیل کی پانچ جنگوں کی بازگشت ہی نہیں لبنان اور یمن کی خانہ جنگیوں کی چیخیں بھی سنائی دیتی ہے۔ نصف درجن سے زائد عرب ملکوں میں حکومتوں پر فوج کے قبضے کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اور ہر وہ شخص جو اپنے وطن میں "بے وطن" ہے محمود درویش کو اپنا شاعر سمجھ سکتا ہے۔ منو بھائی اپنی کتاب "فلسطین فلسطین" کی تمہید میں لکھتے ہیں:

"محمود درویش مارکسی نظریات رکھتے ہیں۔اور عملی طور پر اپنے وطن کی تحریک آزادی سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ جہاں وہ اپنے ہم خیالوں اور ہم مشربوں میں قدر اور عزت اور محبت کی نگاہ سے دیکھے جاسکتے ہیں' وہاں ادب عالیہ کے تقدس کے محافظوں کی تنگ نظری اور مارکسی نظریات کے مخالفوں کی تنقید کا نشانہ بھی بنتے ہیں۔۔۔ دشمنوں کی ان شکایات اور دوستوں کے اس شکوے کے باوجود فلسطین کے قومی شاعر بن چکے ہیں اور بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ آج بھی وہ ہزاروں کے اجتماع میں اپنی نظمیں سناتے ہیں اور الجزائر سے شمالی یمن تک چودہ کروڑ عربوں اور دنیا بھر میں عربی زبان سمجھنے اور فلسطینی عوام کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے مقبول ترین شاعر ہیں" (۱۹۸)

محمود درویش کی شاعری کا بنیادی اور مرکزی محور فلسطین ہے۔ لیکن محمود جب نو آبادیات میں شکنجے میں جکڑے ہوئے لوگوں کے احساسات اور جذبات کو ادب پاروں میں دیکھ لیتے ہیں تو ان کے دل میں ان کے لیے بھی ہمدردی آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمود درویش پر کئی اہم عالمی ادیبوں کے اثرات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اس کا اظہار خود محمود درویش بھی کر گئے ہیں " وہ روس کے مایاکوفسکی'ترکی کے ناظم حکمت'چلی کے پابلو نرودا'سپین کے گارشیالورکا'اور پاکستان کے فیض احمد فیض کے ذہنی'فکری اور شعری گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں(۱۹۹) محمود درویش اپنی ایک نظم "فلسطین کے لیے سولھویں مناجات" میں لکھتے ہیں:

عکا شہر کی موت پر جب میں نے

چالیسواں منایا

تو میں غرناطہ کے لیے زار و قطار رویا(۲۰۰)

اس شعر کے الفاظ پر دیکھا جائے تو دو لفظ "عکا" اور "غرناطہ" توجہ طلب ہے۔ "عکا" وہ گاؤں ہے جہاں محمود درویش کی پیدائش ہوئی۔ ابھی چھ سال کے ہی تھے "عکا" پر اسرائیلیوں نے راتوں رات حملہ کر کے "عکا" کا نقشہ ہی بدل دیا۔ اس شعر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محمود درویش صرف "عکا" پر ہونے والے مظالم پر نہیں روئے بلکہ "غرناطہ" کے اوپر بھی گریہ کے لیے آنسو بچائے ہیں۔ محمود درویش کی انسان دوستی کے بارے عبد الحق حقانی القاسمی لکھتے ہیں کہ:

> فلسطینی مزاحمتی شاعری انقلابی اور انسان دوستی کی شاعری ہے۔ استحصالی طاقتوں کے خلاف جدوجہد ہی اس شاعری کا بنیادی منشور ہے۔ فلسطین کے شاعروں کی نگاہ صرف اپنی سرزمین تک محدود نہیں ہے بلکہ پوری دنیا پر ان کی نظر ہے۔ چنانچہ فلسطین کے بیشتر شاعروں نے افریقہ، لاطینی امریکہ، کیوبا اور ویت نام میں ہونے والے استعماری جبر و تشدد کے خلاف آوازیں اٹھائیں اور دنیا بھر کے مظلوموں کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا اور معرکہ حیات میں شریک جانبازوں کے لیے نغمہ محبت چھیڑا' سمیح القاسم اور محمود درویش کے ہاں بکثرت اس کی مثالیں ملتی ہیں(۲۰۱)

محمود درویش فلسطین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اور انھوں نے اپنے وجود کو اسی میں سمو دیا ہے۔ ان کی شاعری سے یہ لگتا کہ ان کے خاندان کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے۔ گویا کہ فلسطین کے بغیر ان کے خاندان کا تصور ہی ناممکن ہے

انہوں نے خود کو فلسطین میں اس طرح ضم کر دیا ہے جیسے پانی میں برف۔ باوجودیکہ ان کے اشعار صرف فلسطینی المیے تک محدود نہیں ہیں بلکہ پوری دنیا میں حریت' آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کے لیے انہوں نے شعر کہے ہیں۔ محمود درویش کا کہنا ہے:

"میرے شعر اپنی سرزمین کے المیے تک محدود نہیں ہیں۔ میں ہمیشہ دنیا کے اتحاد کی طرف نظریں لگائے منتظر ہوں لیکن میرا اعتقاد ہے کہ یہ دنیا میری اپنی دہلیز گھر سے شروع ہوتی ہے' میں دنیا کے رہنے والے اور بسنے والے تمام مصیبت زدہ انسانوں کے لیے لکھتا ہوں۔ لیکن میں سیاسی' فنی اور جذباتی طور پر عرب کی سرزمین سے بہت ہی مضبوطی کے سارتھ وابستہ ہوں"(۲۰۲)

محمود درویش کی شاعری تخیلی دنیا نہیں ہے' ان کی شاعری میں عصری انسان کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے خاص کر اہل فلسطین کی صحیح ترجمانی محمود درویش کی شاعری کرتی نظر آتی ہے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ فلسطین کے سارے غم جمع ہو کر محمود درویش کی شاعری مرتب ہوئی ہے۔

محمود درویش کی شاعری میں عصری شعور بھی ملتا ہے۔ وہ بیک وقت ماضی کی بات کرتے ہیں تو حال بے خبر نہیں رہتے۔ تاریخ اور تاریخیت کا شعور رکھتے ہوئے زمان و مکان کی بحثوں کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ زمانے سب بلند تر ہو کر بچہ کی شکل میں فلسطین میں آکر آزادی کی زندگی گزارنے کی کئی بار خواہش کا اظہار شعروں میں کیا ہے۔ محمود درویش کی شاعری میں فلسطینیوں کی مظلومیت کا جہاں بیان ہے وہاں عصری شعور کے بل بوتے پر ہر مظلوم طبقہ کو بہتر مستقبل کی رہنمائی بھی فراہم کرتے ہیں۔ "ان کی شاعری میں عصریت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے زمانے کے عوام کے ترجمان ہیں۔ بہت ہی استحکام کے ساتھ حال اور مستقبل کے بارے میں اپنے عوام سے گفتگو کرتے ہیں اور ماضی کے مضمر تناظر کو پیش کرتے ہیں"(۲۰۳) عامر مفتی اپنے ایک مضمون "آخری آسمان کے بعد پرندے کہاں پرواز کرتے ہیں" میں لکھتے ہیں:

یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ محمود درویش فلسطینوں کا قومی شاعر تھا' درویش نے فلسطین کے لوگوں کے اجتماعی تجربے کو بڑا طاقت ور پیرایہ اظہار بخشا جو بے دخلی اور اپنی جگہ سے محرومی کی شاید سب سے زیادہ مؤثر ادبی شکل ہے' درویش کی تحریریں فلسطینیوں کے منفرد تاریخی تجربے کو ایک آفاقی نقطہ نظر بنا دیتا ہے۔ ایسا مقام جو اس جدید دنیا کے وسیع تر انتقاد کو ممکن بنا دیتا

ہے'کہ جو اپنے بیچ میں سے محروم الارض انسانوں کی نئی آبادیاں مستقل طور پر پیدا کیے چلی جاتی ہے(۲۰۴)

مستشرقین نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک کو مغرب نام دیا اور ایک کو مشرق 'مغرب کو اصل حیثیت دی اور مشرق کے لیے کہا کہ یہ مغرب کا پروردہ ہے 'مغرب بلند تر ہے مشرق ہیچ ہے 'مغرب علم دیتا ہے مشرق لیتا ہے 'مغرب فکر کرتا ہے مشرق تقلید کرتا ہے گو کہ مغرب ہر اعتبار سے مشرق سے بہتر ہے اور حق حکمرانی بھی مغرب کو حاصل ہے خلاصہ کیا جائے تو مغرب حاکم ہے اور مشرق محکوم وغلام۔اسی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے مغرب نے منڈیوں کی تلاش شروع کی اور تجارت کی غرض سے کئی ممالک کو نو آبادیات بننے پر مجبور کیا۔ان ممالک کے وسائل اور ذخائر کو ہتھیا گئے اور نتیجے میں ان نو آبادیات سے تیسری نسل کے لوگ وجود میں آئے۔جن کی سرشت میں ہی غلامی گوندی ہوئی تھی۔نو آبادیات کے سرغنوں کو استعمار نام دے سکتے ہیں۔اور پہلے امریکہ بھی نو آبادیات میں شامل تھا اب حالات نے پلٹا کھا کر نو آبادیات میں توسیع کی شکل میں امریکہ خود استعمار واستکبار اور شیطان بزرگ بن کر جہاں دل کریں اپنی فوج لگا کر اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے جسے روکنے والا کوئی نہیں۔نتیجے میں نو آبادیات کے بسنے والوں میں شعر انکلتے ہیں اور وہ اپنا اسلحہ شاعری کو قرار دیتے ہوئے مزاحمتی شاعری کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو صحیح حقیقت سے آشنائی ہو اور اجتماعی جدوجہد کرکے نو آبادیات سے نکل کر آزادانہ زندگی گزار سکے۔

تیسری دنیا میں سب سے گھمبیر مسئلہ یہ ہے کہ جو ممالک سامراج اور استعماریت کا شکار ہیں۔انھیں آزادی نصیب ہو جن قوموں کے پیروں تلے سے ان کی سرزمین کھینچ لی گئی ہے اس سرزمین پر وہ پھر آبسیں اسلحہ سے پاک پُرامن معاشرہ قائم ہو۔۔لیکن صورتحال یہی کہ استحصال اپنی شکلیں بدل بدل کر سامنے آتا ہے۔اور سرمایہ دار مختلف طریقوں سے ان کے مقاصد کے حصول میں روڑے اٹکاتے ہیں۔جس کے نتیجے میں تیسری دنیا وجود میں آتی ہے۔اور جس کے مسائل بے شمار ہیں۔اور وسائل محدود ہیں۔یہ استحصال اگر ادب وتہذیب کے راستے سے ہو تو انسانی فکر کو بھٹکانے کے تمام ممکنہ ذرائع اختیار کئے گئے۔اور معیشت کے راستے سے ہو تو بنی نوع انسان کو جنگ وجدال میں الجھا دیا گیا۔سرمایہ دار ملکوں کی یہی پالیسی رہی کہ ان کو لڑنے مرنے دو تم اپنا اسلحہ بیچتے رہو، تجوریاں بھرتے رہو"(۲۰۵)

محمود درویش ایک عالمی وژن رکھنے والے شاعر ہیں ان کے دل میں اگر فلسطین کی محبت ہیں تو ساتھ ہی محمود درویش کے دل میں انسانیت کے لیے درد بھی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جذباتی اور سیاسی طور پر درویش کی سب سے مضبوط اور مستحکم وابستگی ارضِ فلسطین کے ساتھ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے باقی مظلوم اور مقہور عوام کے لیے سر دمہری کا رویہ رکھتا ہے۔ وہ دنیا کے تمام حریت پسندوں اور حق وصداقت کے علمبر داروں کا ہم نوا ہے۔۔۔ درویش کے نغمے استعماری اور استحصالی قوتوں کی زیادتیوں کے خلاف نبرد آزما تمام مظلوم و بے نس اقوام کے لیے ہیں یہی چیز محمود درویش کو عالمی انسانی برادری کا ایک ہمدرد فرد بناتی ہے۔ اور اس کی شاعری کو آفاقی اقدار سے منور کرتی ہے(۲۰۶)

انہوں نے عالمی استکبار اور استعمار کی چکی میں پسنے والے مظلوم و مقہور لوگوں کے حق میں شاعری کی ہیں اور کھل کر استعمار کی مخالفت میں مزاحمانہ رویہ اپناتے ہوئے لاچار اور نادار لوگوں کے دکھ میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ الجزائر 'یمن 'اسوان 'والگا 'کانگو اور جارڈن اور فرات کے کنارے میں ہونے والے مظالم میں مظلوموں کے ساتھ آزادی کی امید دلاتے ہوئے اظہار یکجہتی ان الفاظ کے ساتھ کر رہے ہیں۔

لاتقل لی/لیتنی بائع خبز فی الجزائر/لاغنی مع ثائر/لاتقل لی/لیتنی راعی مواش فی الیمن/لاغنی لانتفاضات الرمن لاتقل لی/لیتنی عامل مقهی فی هفانا/لاغنی لانتصارات الحزائی/لاتقل لی/لیتنی اعمل فی اشوان حمالاصغیر/لاغنی للصخور/یاصدیقی/لن یصیب النیل فی الفولغا/ولاالکونغو ولااردن فی نهرالفرات/کل نهر وله نبغ ---ومجری---وحیاة یاصدیقی---ارضألیست بعاقر/کل ارض ولهامیلادهاکل فجر وله موعدثائر(۲۰۷)

ترجمہ: مت کہو مجھ سے / کہ میں ہوتا الجزائر میں اگر میں اور ہوتی نان کی میری دُکان / پھر میں گاتا باغیوں کے ساتھ گیت / مت کہو مجھ سے / کہ ہوتا گر یمن میں گلہ بان / پھر میں گاتا وقت کی لرزہ بر اندازی کے گیت / مت کہو مجھ سے / کہ ہوتا میں ہوانا کے کسی کیفے میں اک ویٹر اگر / پھر میں گاتا غم کی ماری عورتوں کے واسطے نصرت کے گیت / مت کہو مجھ سے / کہ ہوتا اگر جواں مزدور۔۔۔ میں / پھر چٹانوں کے لیے گاتا میں گیت / میرے ہمدم / والگا میں نیل کا پانی تو بہہ سکتا نہیں / کانگو دریا ہو یا ہو جارڈن / ہو سکتے نہیں وہ دریائے فرات / ہے ہر اک دریا کا اک منبع الگ / راستہ اس الگ ہے، زندگی اس کی الگ / میرے ہمدم / سرزمین اپنی بھی بنجر تو نہیں / وقت ہوتا ہے معین / ہر زمین کی افرینش کے لیے / ہے سویرے سے ملن اک دن ضرور / ہر مجاہد کے لیے(۲۰۸)

کسی شاعر کا بڑا ہونا یا چھوٹا قرار پانے کے کئی پیمانے ہیں 'بعض شعرا فن کے اعتبار سے بڑے شاعر قرار پاتے ہیں تو بعض شعرا فکر کے لحاظ سے بڑے شاعر قرار پاتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی شاعر کے بارے میں فیصلہ کرنا ہو کہ یہ آفاقی شاعر ہے یا نہیں تو دیکھنا ہو گا کہ وہ شاعر کسی تجربہ کو کس انداز میں لیتا ہے 'اس کو اپنے تخیل کی بھٹی میں کیسے پکاتا ہے پھر اسے کیسے متاثر کن انداز میں پیش کرتا ہے 'پھر دیکھنا ہو گا کہ وہ اپنے زمانے کا شعور کس حد تک رکھتا ہے

اور پھر تاریخ کو عصر حاضر کے ساتھ کس طرح ضم کرتا ہے اور پھر مستقبل کے لیے کیا وژن دیتا ہے یہی چیزیں ایک شاعر کو بڑا شاعر بنا دیتی ہیں جیسا کہ ممتاز شاعر عبد الوہاب البیاتی کے بقول:

"محمود کی شاعری اپنے اندر ایک عالمی وژن رکھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ملک فلسطین کے المیے تک محدود نہیں رہے بلکہ ہر انسانی انقلابی جدوجہد کو اپنے ذہن و ضمیر اور زبان کا ایک حصہ بنا لیا۔وہ انسان کی وحدت وکلیت پر یقین رکھتے ہیں اس لیے دنیا کے خطوں میں جہاں بھی تاریک اور بہیمانہ طلسم میں جکڑے ہوئے لوگ نظر آتے ہیں ان سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں اورانہیں حوصلہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں اوران کی جدوجہد کو سراہتے ہیں۔یہیں سے ان کی شاعری میں بین الاقوامی بُعد تصوراجاگر ہوتا ہے۔اوراس وجہ سے کہ وہ مزاحمتی اورانقلابی شاعروں میں سے ناظم حکمت، پابلونرودا،مایوکوفسکی لورکا اوروالٹ رہٹ مین سے حد درجہ متاثر ہیں۔جن لوگوں کی شاعری نے انہیں عالمی خیالات اور مسائل سے روشناس کیا ہے۔ان لوگوں کی طرح عصری اور تخلیقی آگہی ان کی بیشتر نظموں میں نظر آتی ہے"(۲۰۹)

محمود درویش ابہام پر مشتمل شاعری کو احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھتے'وہ بامقصد شاعری کے دلدادہ ہیں'ان کے نزدیک وہ شاعری ہوا میں اڑا دینے کے ہی قابل ہے جو شاعری عوام کے دلوں میں گھر نہ کر جائے'عوام میں شعور کے چراغ نہ جلائے وہ شاعری بے رنگ اور بے مزا ہے۔اس حوالے سے محمود درویش اپنی ایک نظم "شاعری پر" میں لکھتے ہیں:

ہماری نظموں کا کوئی رنگ نہیں
کوئی مزا نہیں'
ان کی کوئی آواز نہیں
اگر لوگ ایک گھر سے دوسرے تک چراغ
نہیں لے جائیں گے (۲۱۰)
اگر سادہ دل ان کا مفہوم نہیں سمجھیں گے
تو پھر ان کو ہوا میں اڑا دینا مناسب ہو گا
اور خود ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کرنی بہتر رہے گی (۲۱۱)

محمود درویش کو الفاظ کی ناریت پر پختہ یقین ہے یہی وجہ ہے کہ محمود درویش نے اپنے لیے الفاظ تراشی کے فن کا انتخاب کیا اور یوں الفاظ کو تراش خراش کر شاعری کی عمارت کھڑی کر دی۔ محمود درویش خود یہ تمنا کرتے ہیں ہیں اے کاش' میری نظمیں تیشہ' دستی بم' کولہو' قمیص یا قفل کی کنجی ہوتی!!! اور آگے کہتے ہیں کہ جب تک دوست خوش اور دشمن ناراض ہوتے رہیں گے' لکھنے کا سلسلہ جاری رکھوں گا۔ اپنی ایک نظم "شاعری پر" میں محمود درویش لکھتے ہیں:

کاش یہ نظمیں کسی کاریگر کے ہاتھ میں تیشہ ہوتیں
یا کسی لڑاکے شخص کے ہاتھ میں دستی بم' کاش یہ نظمیں
کاش یہ نظمیں کبھی کسان کے ہاتھ میں کولہو ہوتیں
یا قمیص یا دروازہ یا قفل کی کنجی
کاش یہ نظمیں۔۔۔
کسی شاعر نے کہا ہے
جب تک میری نظمیں
میرے قریبی دوستوں کو خوش آتی رہیں گی
اور دشمنوں کو طیش دلاتی رہیں گی
تو میں شاعر ہوں
اور لکھتا رہوں گا[۲۱۲]

محمود درویش کی شاعری کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ معمولی بات کر جاتے ہیں لیکن ان کی معمولی بات میں کئی پیغامات چھپے ہوتے ہیں' گو کہ ان کی شاعری میں ایجاز و جامعیت کی حامل ہے' بات مختصر مگر یہ بات سوچنے پر انسان کو مجبور ضرور کرتی ہے۔ محمود درویش بیداری چاہتے ہیں' تاکہ لوگوں میں شعور آجائے اور آزادی کے لیے مل جل کر لائحہ عمل طے کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ اپنی ایک نظم "وہ کفن میں لپٹا ہوا لوٹا" میں لکھتے ہیں:

متغائر مرنے والوں کے ساتھیو!
مت دریافت کرو کہ وہ کب لوٹے گا؟
ایک ہی سوال کو مت پیٹتے جاؤ
بلکہ یہ پوچھو

ہمارے لوگ نیند سے کب جاگیں گے (۲۱۳)

محمود درویش جھکنے والا' تھکنے والا اور ہارنے والا انسان نہیں ہے'ان کی شاعری صیہونیت کے وجود کے لیے ایک خطرہ کی گھنٹی تھی اور رہے گی' محمود درویش ببانگ دہل اپنی ایک نظم "اعلان" میں اعلان دے رہے ہیں کہ جب تک فلسطین کی زمین باقی ہے'جب تک مسئلہ فلسطین ہے'جب تک زیتون'لیموں کے درخت ہیں'عرب وایران کی داستانیں ہیں'جب تک میری آنکھیں'دل اور زبان باقی ہیں'جب تک کسان'مزدور اور کاشت کار ہیں میرے اشعار آزادی کی امید اور مشعل بن زندہ رہیں گے اور اوران سے آزادی کے نعرے بلند ہوتے رہیں گے۔اپنی ایک نظم "اعلان" میں محمود درویش لکھتے ہیں:

جب تک میری بالشت بھر زمین موجود ہے
جب تک میرا ایک زیتون کا درخت باقی ہے
میری زمین پر نقل نویس موجود ہوں گے
اور عنتر العبس کی داستانیں
ایران اور فارس کے ساتھ جنگوں کی رزمیہ نظمیں
جب تک میری آنکھیں موجود ہیں
جب تک میری ذات موجود ہے
میرے الفاظ اور روٹی اور بازو
آزادی کے متوالوں کے
ہاتھوں میں دستیاب رہیں گے (۲۱۴)

محمود درویش کا دل فلسطین کے دکھ سے مغموم ہے'ساری زندگی اس کا دل فلسطین کے لیے دھڑکتا رہا'دل میں' خیالوں میں جذبوں اور خوابوں میں فلسطین کو آباد کیے رکھا اور فلسطین کی آبیاری اپنی شاعری سے کرتے رہے'آزادی فلسطین کے لیے مزاحمتی شاعری کا سہارا لے کر صیہونیت کے ساتھ صیہونیت کو سپورٹ کرنے والے استعمار وطاغوت کو للکارتے رہے اور یہاں تک کہہ دیا کہ بیڑیاں جتنی سخت کر سکو کر گزرو'کتابوں اور تمباکو سے محروم رکھو'خون دل میں انگلیاں ڈبو کر'زنجیروں میں جکڑ کر'جیل میں'اصطبل میں'حمام میں مجمع عام میں جلوت اور خلوت میں بھی آزادی کے نغمے گاتا رہوں گا۔اس حوالے سے ان کی ایک نظم "سرتابی" قابل دید ہے۔اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

ترجمہ: میں حراست کی کوٹھڑی میں کہوں گا/اور حمام میں اور/اصطبل میں /کوڑوں کی زد میں/ہتھکڑیاں پہنے ہوئے اور/زنجیروں کا ظلم سہتے ہوئے بھی/دس لاکھ بلبلیں/میرے دل کی شاخوں پر موجود ہیں جو/آزادی کا گیت گاتی ہیں(۲۱۵)

iv۔ محمود درویش کی علامتی مزاحمتی شاعری:

محمود درویش نے براہ راست فلسطینیوں کے حق میں مزاحمتی شاعری کی ہے'اور کئی مقامات پر علامت کا سہارا لے کر علامتی پیرایہ اظہار میں مزاحمتی شاعری بھی کر ڈالی ہے۔ان کی علامتی شاعری کی صحیح تفہیم ان کی شخصی زندگی کے جملہ احوال سے آشنائی کے بعد ممکن ہے۔فواز طوقان کا خیال یہ ہے کہ:

> " محمود درویش کی نظموں میں اصلی خیال(Leitmotive)عوامی ہونے کے باوجود ان کی ماورائے ہیئت میں ذاتی حوالے پائے جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شعری علامتیں شخصی حوالوں کے بغیر سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ممتاز شاعرہ فدوی طوقان کا خیال ہے کہ ہم محمود کی علامتوں کو اس کے ذاتی مسائل سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے یا یہ مسائل جو اس کی حقیقی زندگی میں درپیش ہیں۔محمود کی زندگی اور واقعات کو بھی اس کی شاعری سے گہرا تعلق ہے اور اس کی نظم میں جو انسانیت کا گہرا شعور ملتا ہے وہ اس کی زندگی کے تجربوں سے ہی پھوٹا ہے "(۲۱۶)

علامتی شاعری کو یوں تو مزاحمت سے فرار قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ فرار نہیں بلکہ وقت کی ضرورت بھی ہے'محمود درویش نے بھی علامتی شاعری کا سہارا لے کر مزاحمت ومقاومت سے پیچھے نہیں ہٹے بلکہ علامت کا سہارا لے کر انھوں نے اپنا پیغام بھی پہنچایا اور طاغوت سے بھی اپنی جان بخشی کی۔محمد کاظم لکھتے ہیں:

> " محمود درویش نے اسرائیل میں رہ کر بہت مشقت'اذیت اور پابندی کی زندگی گزاری ہے اور روز وشب کے ان تجربوں سے بھی اپنا شعری اسلوب پیدا کیا ہے۔ایسی صورتحال میں جب کہ شاعر کو کھل کر اظہار کرنے کی آزادی نہ ہو'اور سر پر وقت کا احتساب اور سنسر کی تلوار لٹک رہی ہو'شاعر کے لیے علامتی اور مبہم انداز بیان اختیار کرنا صرف اس کے فنی مزاج کا تقاضا ہی نہیں بلکہ وقت کی ضرورت بھی بن جاتا ہے "(۲۱۷)

محمود درویش یوں انقلابی اور مزاحمتی شاعر ہیں لیکن انہوں نے جدیدیت میں اپنی شاعری کو سموتے ہوئے شاعری میں مزید جان ڈالنے کی غرض سے علامتوں سہارا لیا۔ ان کی علامات میں اساطیر کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ محمود درویش اپنے علامتی رنگ کے بارے میں ان الفاظ کے ساتھ وضاحت دیتے ہیں:

> "علامت میری واقعیت کے بھرپور اظہار کے کام آتی ہے اور اسے زیادہ پرمایہ بنا دیتی ہے اور جس طرح ایک انقلابی شاعر اپنے انقلابی شعور اور روانی گیت نگاری کے درمیان ایک رشتہ استوار کرلیتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے اس شعور کے لیے علامت سے بھی کام لے سکتا ہے اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کا انقلابی جوہر اس کی وجہ سے دب کر نہ رہ جائے۔ شاعری میں علامت' جیسا کہ ہم جانتے ہیں کچھ اور پہلوؤں کا اضافہ کردیتی ہے اور اس کے پر و بال میں بڑی قوت پیدا کرتی ہے اور شاید علامت جدید عربی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے جو اسے اعلیٰ فنکارانہ قیمت عطا کرتی ہے پھر یہ بات بھی سامنے رکھیے کہ زیادہ اساطیر ہی نئی نظم میں علامت کا کام کردیتے ہیں"(۲۱۸)

استعارات و علائم کے استعمال سے شاعری میں جہاں حسن بھی آتا ہے وہاں اس کے معنی آفرینی بھی ساتھ ساتھ ہو رہی ہوتی ہے۔ علامات اگر ذاتی ہوں تو پھر قاری کو ان علامات کے سمجھنے میں کافی پیچیدگیاں آجاتی ہیں۔ محمود درویش کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے ہاں علامتوں کے کئی سلسلے ملتے ہیں۔ ہر چند کہ ان کے شعری مجموعے کے نام سے ہی علامت کی کارفرمائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جیسے تتلی کا بوجھ، گلیلی میں پرندے مرتے ہیں۔ زیتون کی پتیاں، پروں کے بغیر پرندے وغیرہ ان کی شاعری میں صلیب، بادل، نغمہ، چٹان، خواب، ققنس، عقاب، بارش، جنگل، خزاں، سمندر وغیرہ متعدد علامتیں جابجا محمود درویش کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔

محمود درویش کی شاعری میں یونانی اساطیری کردار بھی بطور علامت استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری میں اوڈیسیس' پینے لوپیا اور فلیمیچس جیسے کرداروں کو خوبصورت پیرائے میں برتتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اوڈیسیس سمجھتا ہے۔ فلسطین کو پینے لوپیا' گردانتے ہیں۔ جس طرح ہومر کی اوڈیسی میں اوڈیسیس اپنے وطن کی تلاش میں سرگرداں ہے "یہ جہاں گرد کی واپسی" کی کہانی ہے۔ بالکل اسی طرح محمود درویش اپنی پینے لوپیا (ارض فلسطین) کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ صلیب بھی محمود درویش کی پسندیدہ علامت ہے۔ اس حوالے سے ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

"انہوں نے مسیحی علامات "کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ جس میں "صلیب "کو خصوصی اہمیت دی ہے اور وہ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کا تعلق اس سرزمین سے ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے اور صلیب کا قدیم فلسطین سے جیسا تعلق ہے اسی طرح جدید فلسطین سے بھی گہرا رشتہ ہے۔اسی لیے یہودی ہر چیز کو مصلوب کرنا چاہتے ہیں اور جرمن نازیوں کی طرح سلوک روا رکھتے ہیں۔ محمود نے دیگر شعرا بدر شاکر السیاب' اودنیس' صلاح عبد الصبور' اور خلیل حاوی کی طرح صلیب کا صحیح استعمال "صدی من الغابہ "میں کیا ہے "(۲۱۹)

اس حوالے سے یہ اشعار ملاحظہ ہو:

من غابة الزيتون
جاء الصدیٰ
وكنت مصلوباً على النار اقول للغربان لاتنهشي
فربماارجع للدار--
انزل يوما عن صليبي
ترى
كيف اعود حافيا عاری ؟(۲۲۰)

اس نظم میں محمود درویش خود کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح مصلوب سمجھتے ہیں' یہاں پر صلیب کا لفظ 'مشقت 'جدوجہد کے ساتھ فتح کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔یعنی جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب (عیسائیوں کے مطابق)تک جا پہنچے بالکل اسی طرح محمود درویش بھی بغیر ملک و وطن کے مصلوب رہا۔ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نزول کریں گے' بالکل اسی طرح محمود درویش کا وطن بھی اغیار کے صلیب سے آزادی حاصل کرے گا۔

محمود درویش کی شاعری کی علامتوں میں سے ایک علامت "ماں "ہے۔ماں کی ممتا سے کون واقف نہیں' ہر محب وطن کے لیے اس کا وطن ماں کا درجہ رکھتا ہے۔ محمود درویش نے وطن کی تعریف بھی یہی کی تھی کہ وطن وہ ہے جہاں ماں کے ہاتھ کی بنی روٹی اور قہوہ پینا نصیب ہو اور جب مر جائے تو پاؤں پھیلا کے مرنا نصیب ہو۔لفظ "ماں "میں بہت تاثیر ہوتی ہے'جب ماں کہہ کر محمود درویش اپنے وطن سے مخاطب ہوتی ہے تو ان کی شاعری میں مزید تاثیر پیدا ہوتی ہے۔Bahram Amani کا کہنا ہے:

The word mother in poems of most poets of the resistance movement especially Darwish and Samih al-Qasim is used as a

symbol for the land of Palestine and a land whose sons must protect it[۲۲۱]

محمود درویش ہمیشہ فلسطین کو ایک محبوب کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔وہ کبھی اسے اپنی ماں' کبھی باپ' بہن اور بیوی کہہ کر پکارتے ہیں۔ محبوب کا یہی اتحاد ان کے بیشتر اشعار میں نظر آتا ہے۔انہوں نے وطن سے اپنی محبت اور عشق کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے۔

وطنی لیس حقیبة
وانا لست مسافر
انی العاشق والارض حبیبة[۲۲۲]

ترجمہ: میرا وطن سفری بیگ نہیں ہے
اور نہ ہی میں مسافر ہوں
میں عاشق ہوں اور زمین میری محبوب ہے

ان کی شاعری میں کرب اور شہادت جیسے الفاظ بھی معنویت کے ساتھ آئے ہیں وہ اجتماعی مفاد کے لیے انفرادی قربانی سے بھی دریغ نہ کرتے ہوئے شہادت پانے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔لہذا کرب اور شہادت کے تلازمے بھی ان کی شاعری میں موجود ہیں۔اس حوالے سے ابوالکلام قاسمی کا کہنا ہے کہ:

> محمود کی نظموں میں کچھ مخصوص اور مکرر تصورات یا تمثال میں سے شہادت اور کرب بھی ہیں۔انہوں نے کرب بالجرح" کو ایک مثبت قدر قرار دیا ہے۔وہ گو کہ ایک دور کے اختتام کے لیے ہوتا ہے۔ مگر یہ کرب یا زخم پھولوں کو غذائیت اور نمو بخشتا ہے' کرب 'نشاۃ الثانیہ کی ایک علامت ہے۔انہوں نے کرب کو روشنی اور رہ نمائی سے بھی مربوط کیا ہے اور اس طرح کے تلازمے کا استعمال انہوں نے بیشتر نظموں میں کیا ہے[۲۲۳]

محمود درویش پر ایک الزام یہ عائد کیا جاتا ہے انہوں نے روایتی انداز میں براہ راست مزاحمت سے بے اعتنائی برتتے ہوئے علامتوں کے جال بننے کی طرح ڈالی ہے۔اور ایک طرح سے ابہام پیدا کرنے کی دانستہ کوشش کی ہے' یہ الزام محمود درویش جیسے شاعر پر نہیں لگ سکتا' پہلی بات تو یہ کہ علامت کا استعمال کوئی ناجائز کام تو نہیں یہ شاعری کا حصہ ہے' دوسری بات علامتوں میں بات کو مؤثر انداز میں پہنچا سکتے ہیں' علامت کے سمجھنے کے لیے شعری ذوق ہونا چاہیئے بے

ذوق اور شعری جال نہ بُن سکنے والا ذہن علامت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اورآخری بات یہ کہ علامتی شاعری میں بھی محمود درویش اپنے روایتی موضوع سے نہیں ہٹے اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمود درویش ایک متعھد شاعر ہیں' یہ الزامات بے بنیاد ہیں' بات علامت میں کریں یا براہ راست شاعر اپنا فریضہ تو بطریق احسن نبھا رہا ہے۔

محمود درویش کی شاعری کے پہلے سولہ سترہ مجموعوں کے مطالعے سے اس کے قارئین کو یقیناً یہی احساس ہوتا ہوگا کہ اس نے سیدھے سادھے اورواضح مخاطبانہ انداز کو ترک کر کے مثلاً جیسا انداز اس کی آغاز کی نظموں "جلاوطن کا نامہ" اور "شناختی کارڈ" وغیرہ میں استعمال ہوا ہے) ایک سوچا سمجھا ٹیڑھا یا ترچھا پن اپنا لیا ہے۔ اوراپنے شعری استعارات اور علامتوں کے استعمال میں دانستہ اور غیر ضروری ابہام پر تکیہ کرلیا ہے۔ لیکن یہ الزام درست نہیں ہے، اس لیے کہ وہ اپنی شاعری کے بنیادی موضوعات سے کبھی غیر وابستہ نہیں رہا۔ بقول پروفیسر بلاط: یہاں ابہام اتنا قصوروار نہیں، زیادہ بد قسمتی اس کے قارئین کی ہے کہ وہ شاعر نہیں ہیں اور ایسا عریض جال نہیں بُن سکتے جس میں اس کی تمام علامتیں مکمل طور پر سما سکیں(۲۲۴)

محمود درویش نے شاعری کو با مقصد بنایا انہوں نے شاعری کو شعور دلانے' بیداری لانے' انقلاب کی شمع روشن کرانے جیسے عظیم مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ محمود درویش کو اپنی نظموں پر مکمل بھروسہ ہے کہ میری نظمیں' انقلاب کے لیے راہیں ہموار کریں گی' اگر میری نظموں میں حرارت' شدت اور شعلہ پیدا کرنے والے اوزار کی مانند نہ ہو جائیں تو شعر اور ان کی شیرینی کیا فائدہ دے گی"" "وفا" کے عنوان سے لکھی نظم میں محمود درویش کا کہنا ہے کہ:

تمہاری آواز میرے دل میں میری رگِ جاں میں گونجتی ہے
اگر تم اس معرکے میں میرے ہمرکاب نہیں بھی ہو تو کیا ہے
یہ ساری کہانی جواب میرے لہو میں شامل ہو چکی ہے
اس نے میرے رگ وپے میں نفرت بھر دی ہے
میرے ہونٹوں پر آگ کا فتیلہ رکھ دیا ہے
میں اپنے شعروں اوران کے حسن بیان کو ہوا میں بکھیر دوں گا
اگر میرے اوزان اور قافیے شعلہ اگلتی ہوئی تلواریں ثابت نہ ہوئے(۲۲۵)

محمود درویش نے ہر جہت سے مزاحمت کی ہے'اور ہر دلیل سے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آخر صیہونیوں کو ہم پر حکمرانی کا حق کیوں دیا گیا'مان لیا ہم کم عقل لوگ ہیں'ہم کاشت کار کی اولاد ہیں'ہم میں کوئی گالف کے کھلاڑی نہیں'اس کا مطلب یہ بھی نہیں تم آکر ہمارے اوپر قابض ہو جائے اور ہمیں غلام بنا دے۔

چلو فرض کر لیتے ہیں کہ تمہاری بات درست ہے
مان لیا کہ میں ایک کند ذہن'فاتر العقل احمق ہوں'
یہ بھی ٹھیک کہ میں کبھی گولف کا ماہر کھلاڑی نہیں بن سکوں گا
نہ ترقی یافتہ ٹیکنالوجی میری دسترس میں آئے گی
نہ میں کبھی جہاز اڑانے کے قابل ہوں گا
لیکن کیا اس سے تمہیں حق مل جاتا ہے
کہ تم میری زندگی پر قابض ہو جاؤ(۲۲۶)
یہ محاصرہ تب تک جاری رہے گا
جب تک ہم اپنے دشمنوں کو اپنی کنعانی شاعری کے
قصائد نہیں سکھا دیتے(۲۲۷)

محمود درویش ایک دور اندیش شاعر ہے جو صرف ماضی پر گریہ نہیں کرتے بلکہ وہ حال کی عکاسی کرتے اور مستقبل کی بھی نشاندہی کرتے ہیں'صیہونیت کی ہر سازش سے وہ بخوبی آگاہ تھے۔یہی وجہ ہے انہوں نے کہا کہ محاصرہ اس وقت تک سخت رہے گا جب تک مطلق غلامی کو قبول نہ کر لیں۔جیسا کہ محمود درویش کا کہنا ہے کہ:

یہ محاصرہ اپنی گرفت سخت رکھے گا
جب تک ہم مطلق غلامی کی برکات کہ
پوری طرح قائل نہ ہو جائیں
ظاہر ہے کہ انتخاب کی مکمل آزادی کو بروئے کار لاتے ہوئے
مزاحمت کا مطلب یہ اندازہ کرنا ہے کہ
تمہارا دل اور فوطہ اب تک دھڑک رہے ہیں
اس کا یقین کرنے کے لیے تم ایک بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہو

جسے امید کہتے ہیں(۲۲۸)

اسرائیل کا وجود ناپاک ہے'اسرائیل اپنے کو صرف فلسطین تک محدود نہیں رکھنا چاہتے بلکہ وہ گریٹر اسرائیل کے خواب دیکھ رہے ہیں جس میں مشرق وسطیٰ کے کافی ممالک بھی آجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ نیل سے فرات تک اپنی ایک سٹیٹ قائم کرنے کے درپے ہیں۔ ان سازشوں کا ادراک محمود درویش کو ہو چکا تو وہ خاموش نہیں رہے۔ کہا کہ یہ ہر انقلاب پر ابھارنے والی نظموں اور صداؤں کو خاموش کرنے کے ہر حربے استعمال کریں گے لیکن انہیں نہیں معلوم تلوار سے ہوا زخمی نہیں ہوتی'ایک درخت کو کاٹیں گے تو ہر ہر شاخ سے کئی درخت نمودار ہوں گے۔ محمود درویش اپنی ایک نظم "گیت اور سلطان" میں اس قسم کی تمثال کاری خوبصورت انداز میں پیش کر رہے ہیں:

والسلطان مخلوق خیالی
قال ان العیب فی المرآة
فلیخلد الی الصمت مغنیکم وعرشی
سوف یمتد
من النیل الی نهر الفرات
اسجنواهذی القصیدة(۲۲۹)

ترجمہ: سلطان بہت ذہین ہے'اس نے کہا" قصور آئینے کا ہے"' اپنے مغنیٰ کو خاموش کر دو'میری سلطنت نیل سے فرات تک پھیلا دو'وہ چلایا" اس نظم کو جیل میں ڈال دو'جاؤ سلطان سے کہہ دو'تلوار چلانے سے ہوا زخمی نہیں ہو سکتی'وہ چلایا" یہ میرا حکم ہے'اس نظم کا سر قلم کر دو'نافرمان اولاد کے لیے'مقتل بہترین جگہ ہے"(۲۳۰)

محمود درویش کے نزدیک الفاظ بھی زندگی رکھتے ہیں اور الفاظ کی تاثیر بھی دیرپا ہوتی ہے'الفاظ سے نغمہ بنتا ہے'نغمہ پھر ایک کھیت میں درخت کی مانند جان دے سکتا ہے لیکن اس کی جڑیں کئی کھیتوں سے نکل سکتی ہیں لہذا الفاظ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے محمود درویش نے مزاحمتی شاعری جاری رکھی جب تک مسئلہ فلسطین حل نہیں ہوتا محمود درویش کے الفاظ اور نغمے نہیں مریں گے اور کئی ذہنوں اور دلوں میں انقلاب کی شمع روشن کرتے رہیں گے۔ محمود درویش نے نغمہ کو کھیت اور سوکھے ہوئے تنے سے تشبیہ دی ہے۔ لہذا محمود درویش کے ہاں خوبصورت علائم اور تمثیلات کے ساتھ تشبیہات بھی بھرپور انداز میں ملتی ہیں۔

نغمہ ایک کھیت میں
درخت کے سوکھے تنے کی طرح مر سکتا ہے
مگر اس کی جڑیں

تمام کھیتوں سے نکل آتی ہیں (۲۳۱)

محمود درویش کی شاعری ان کی اپنی ذات اوراہل فلسطین کی سرگذشت ہے۔ محمود درویش نے فلسطین کے ابتلامیں آنے کو آنکھوں سے مشاہدہ کیا'اپنی آنکھوں سے ہی فلسطین کو اغیار کے ہاتھوں جاتے ہوئے دیکھا'اہل فلسطین کو مرتے دیکھاتو محمود درویش اپنی ایک نظم "میں نے قتل عام دیکھا ہے" میں لکھتے ہیں:

میں نے قتل عام دیکھا ہے
میں ایک نقشے کی بدولت ظلم کا نشانہ بن چکا ہوں
میری پرورش سیدھے سادھے لفظوں پر ہوئی ہے
جس نے ٹھیکریوں کو اڑتے دیکھا ہے
میں نے شبنم کے قطروں کو بموں کی طرح کرتے دیکھا ہے (۲۳۲)

عام طور پر یہ سننے میں آتا ہے مثلاً فلان کو سیاسی لحاظ سے خطرہ سمجھتے ہوئے جلاوطن کیا'لیکن یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ جس کا وطن ہی جلاوطن کیا ہو'جس کے وطن کو بھی نکال باہر کیا ہو'یہ بات ہمیں صرف فلسطین کے حوالے سے ملتی ہے۔ لیکن فلسطینیوں کی وطن سے محبت دیدنی ہے۔بقول ان کے ہم مریں گے تو یہاں کٹیں گے تو یہاں اور اسی سرزمین فلسطین میں اور ہاں ہمارے ہی خون سے زیتون کا درخت اُگے گا۔ "زیتون کا لفظ بطوراستعارہ محمود دریش کی شاعری میں درآیاہے۔جو کہ انقلاب کی طرف اشارہ کررہاہے۔ محمود درویش اپنی ایک نظم "زمین ہم پر تنگ ہورہی ہے" میں لکھتے ہیں کہ:

ہم کہاں جائیں آخری سرحدوں کے بعد
پرندے کہاں اڑیں آخری آسمان کے بعد
پودے کہاں سوئیں ہوا کے آخری سانس کے بعد
ہم اپنے نام سُرخ ندی سے لکھیں گے
اُس گیت کے ہاتھ کاٹ دیں گے
جو ہماری لاشوں پر ختم ہو گا
ہم یہاں مریں گے
یہاں آخری راستے میں

یہاں اور یہاں

ہمارے خون سے زیتون کا درخت اُگے گا(۲۳۳)

محمود درویش کی شاعری میں غم و غصہ دونوں کیفیتیں ساتھ ساتھ ملتے ہیں۔ جب صیہونی اہل فلسطین کا راستہ روک لیتے ہیں انہیں فلسطین کے بے دخل کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں تو محمود درویش کا کہنا ہے کہ ان قبیح کاموں سے اہل فلسطین میں ذوق شہادت مزید ابھرنے لگتا ہے۔ اس نظم میں "سرخ پھول" بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ محمود درویش اپنی ایک نظم "میں نے قتل عام دیکھا ہے" میں لکھتے ہیں:

جب وہ میرے دل کا در مجھ پر بند کرتے ہیں

رکاوٹیں بناتے ہیں اور کرفیو لگاتے ہیں

تو میرا دل ایک تنگ گلی بن جاتا ہے

میری پسلیاں پتھروں میں ڈھل جاتی ہیں

اور سرخ پھول اُگنے لگتے ہیں(۲۳۴)

لہذا محمود درویش کی شاعری کا ایک حصہ مزاحمت اور مقاومت کی شاعری پر مشتمل ہے۔اس کے لیے محمود درویش نے کبھی براہ راست اسلوب اپنایا تو کبھی علامتوں کا سہارا لیا۔ تو کبھی تشبیہات 'استعارات اور تمثال کاری کو بھی اپنے اسلوب کا حصہ بنایا۔ محمود درویش صیہونیت 'استعماریت 'طبقاتی اور استحصالی نظام کے خلاف مزاحمتی شاعری کرتے رہے اور آج بھی ان کے اشعار انقلابیوں میں زبان زد عام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محمود کو ضمیر کا شاعر 'فلسطین کا قومی شاعر' یہاں تک کہ فلسطین کی سانس بھی کہا گیا۔ انہوں نے کبھی اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کیا جس کی وجہ سے ایک متعہد شاعر کے حوالے سے بھی جانے گئے۔ فلسطینی شاعری میں ایک مارکسی شاعر ہونے کے ناتے بھی محمود کی ایک حیثیت اجاگر ہوتی ہے انہیں لینن امن ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

ہ: فیض احمد فیض اور فیض درویش کی مزاحمتی شاعری کا تقابل:

محمود درویش اور فیض احمد فیض میں چند چیزیں مشترک ہیں تو کئی جہات سے وہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔ فیض احمد فیض کا شمار اردو کے نمائندہ شعراء میں ہوتا ہے جن کی شاعری میں کلاسیکیت اور جدیدیت کا ملاپ نظر آتا ہے۔ جبکہ محمود درویش ایک عرب فلسطینی شاعر ہیں جو فلسطین کے قومی شاعر ہونے کا اعزاز بھی رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی کلاسیکی عرب شاعری کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ فیض احمد فیض

اور محمود درویش ہم عصر شاعر ہونے کے ساتھ ایک دوسرے سے گہری وابستگی اور دوستی بھی رہی۔ مزید یہ کہ فیض احمد فیض جہاں ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے یعنی مارکسی تھے وہاں محمود درویش بھی اپنے کو مارکسی تصور کرتے تھے۔ یہ دونوں شعرا انسانیت کا درد رکھنے والے تھے یہی وجہ ہے دونوں کی شاعری میں انسان دوستی چھلکتی نظر آتی ہے۔

بات اگر مزاحمتی شاعری کی 'کی جائے تو دونوں کی شاعری میں مزاحمتی لب ولہجہ کبھی براہ راست انداز میں ملتا ہے تو کبھی رومانوی ذائقہ کے ساتھ مزاحمت کی کیفیتیں ملتی ہیں تو کبھی علامتی پیرایہ میں مزاحمت کا بیان ریکارڈ کراتے نظر آتے ہیں۔ ان دونوں کی مزاحمت کبھی استعمار کے خلاف ہوتی ہے تو کبھی فلسطینی عوام کی محرومیت کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے 'تو کبھی مقامی آمریت تو کبھی غاصب صیہونی کے ناپاک عزائم کو طشت از بام کرنے کے لیے میدان میں اُترتی نظر آتی ہے۔

محمود درویش کی نظموں میں محبت کا عنصر ایک شدید جذبے کے طور پر موجود ہے۔ لیکن اس کی نظموں کا لیریکل اسلوب پابلو نیرودا سے ماخوذ ہے 'اس اعتبار سے وہ فیض احمد فیض سے مماثل ہے جو وطن کی محبت اور عورت سے کو ایک استعارے میں گوندھ کر محبت کے جذبے کو حریت کے جذبے میں بدلتا ہے یہ اسلوب تیسری دنیا میں لکھی جانے والی مزاحمتی شاعری میں کافی مقبول ہے 'محمود درویش کی تمام نظموں میں ایک طرح کی جذباتی تھکن اور ناممکن کو ممکن بنانے اور اس سے پیدا شدہ احساس ہزیمت کا احساس غالب ہے[۲۳۵] فیض احمد فیض کی شاعری میں مزاحمت کی یہ جہات قابل ذکر ہیں 'آمریت کے خلاف مزاحمت، طبقاتی نظام اور طبقاتی استحصال کے خلاف مزاحمت، مذہبی اجارہ داری کے خلاف مزاحمت اور فلسطین کے بارے میں مزاحمتی شاعری۔

فیض احمد فیض وطن دشمن مارکسی نہیں تھے بلکہ فیض ایک وطن دوست اور محب وطن شاعر تھے۔ وطن اور وطن کے باسیوں کو لیلائے وطن کے نام سے یاد کرنے والے سازشی کیسے بن سکتے ہیں لیکن ناکردہ گناہی میں حاکم وقت نے راولپنڈی کیس میں فیض کو قید وبند کی صعوبتوں میں مبتلا رکھا۔ لیکن بزبان شاعر

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

فیض لکھنے سے باز نہیں آئے۔ بلکہ ان کا جیل میں بار بار جانے سے ان کی تخلیقی صلاحتیں مزید نکھرنے لگیں۔ ان کو شہہ ملتی رہی۔ فیض کو لکھنے کے لیے فرصت میسر آئی۔ لوح وقلم یوں کو چھینے گئے لیکن خون دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھنے کی طرح ڈالی۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے (۲۳۶)

فیض احمد فیض کو راولپنڈی کیس میں ملزم قرار دے کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے محبوس رکھا گیا۔اس دوران فیض احمد فیض نے بڑے جاندار انداز میں حبسیہ شاعری کی۔قید و بند کی صعوبتوں نے فیض کو غور و فکر کے مزید دروازے وا کیے۔یہی وجہ ہے کہ فیض نے اپنے نظریئے سے کنارہ کشی اختیار کیے بغیر آمریت کے خلاف بولنے کو اپنا وطیرہ بنائے رکھا اور یوں انہوں نے اپنے ذاتی کرب اور ظلم کی چکی میں پستی ہوئی غریب عوام کے اجتماعی کرب کو الفاظ کا جامہ پہنایا اور ایک توانا صورت میں آمریت کے بھیانک چہرے کو منظر عام پر لانے کے لیے شاعری کو مجاہدہ قرار دیتے ہوئے سنت منصور ادا کرتے ہوئے مزاحمتی رویہ اپنائے رکھا۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے۔۔
ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم، مشق ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے۔۔
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اک اشک سے پیدا
رنگ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے (۲۳۷)

فیض احمد فیض لفظ کی حرمت پر ایمان رکھتے ہیں۔ویسے یہ بات طنزاً عام طور سے کی جاتی ہے کہ "جو کچھ نہیں کر تا وہ شاعری کرتا ہے"فیض بھی دوران قید ایک تو اپنا فرض بھی تھا اور دوسرا وقت کی ضرورت بھی شاعری سے دل کی بھڑاس نکالتے رہے اور آمریت کے خلاف شعر کہتے رہے اور کبھی اپنے نظریے سے پیچھے نہیں ہٹے مظلوموں 'مجبوروں اور مقہوروں کا ساتھ دیتے رہے' ظالموں اور سلطان جابر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مزاحمت جاری رکھی۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں (۲۳۸)

آمریت کو کبھی قبول نہیں کیا۔ فیض جمہوری طرز کی حکومت چاہتے تھے جہاں طبقاتی استحصال نہ ہو لیکن یہ خواب پورا نہیں ہوا۔ آمریت کبھی مارشل لاء کا لبادہ اوڑھ کر عوام کا استحصال کرتی رہی کبھی مذہب اور اسلامی شریعت کا نام لے کر زور و زبردستی سے کام چلایا گیا یوں آمریت کے بتوں سے قیامتیں برپا ہوتی رہیں۔

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوف خدا گیا
وہ جو روز پڑی ہیں قیامتیں کی خیال روز جزا گیا (۲۳۹)

فیض احمد فیض کی شاعری میں مقامی آمریت کے خلاف مزاحمت ملتی ہے تو محمود درویش کی شاعری میں صیہونیت کے مظالم کے خلاف مزاحمت ملتی ہے۔ محمود درویش نے جہاں عملی میدان میں اتر کر صیہونیت کے خلاف مزاحمت کی وہاں الفاظ کے قالب میں مزاحمت شاعری کی صورت میں کرتے رہے۔ جس طرح فیض کو قید رکھا گیا اسی طرح بولنے کے جرم میں محمود درویش کو قید و بند کی صعوبتوں میں رکھا لیکن یہ سختیاں بھی محمود درویش کو باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہوئی اور مسلسل مزاحمت کرتے رہے۔

لفظ کی حرمت پر میرا ایمان ہے
چاہے اس کی خاطر میں مر کر خاک ہو جاؤں یا زندہ رہوں
اور دشمن کی گھات میں بیٹھوں
لفظ کی ناریت پر میرا ایمان ہے
چاہے اس آگ میں خود بھی جل کر خاک ہو جاؤں
یا میرا دشمن اس میں بھسم ہو (۲۴۰)

لہذا فیض احمد فیض اور محمود درویش دونوں نے لفظ کی حرمت کو سمجھتے ہوئے ظلم و بربریت کے خلاف توانا اسلوب میں شاعری کی ہیں۔ اس خاطر انہوں نے جمالیاتی ذوق کو بھی برقرار رکھا ہے اس کی واضح نشانی یہ ہے کہ دونوں شاعروں نے رومانی پیرایے میں اپنے افکار کا ابلاغ کیا ہے۔ فیض احمد فیض اپنے ملک میں آمریت کا خاتمہ چاہتے تھے۔ جبکہ محمود درویش فلسطین کی بحالی کے خواہاں تھے۔ فیض احمد فیض نے سماجی استحصال کے خلاف بھی آواز اُٹھائی ہے۔ فیض جب کسی بازار میں لہو مزدور کا لہو بہتا دیکھتے ہیں تو انہیں اپنے دل پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت

شاہراہوں پہ غریبوں کالہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پہ مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے (۲۴۱)

محمود درویش بھی باقی ظلم برداشت کرنے پر آمادہ ہیں لیکن بھوک اور پیاس کی حالت میں نفرت اور غصہ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں نتیجے میں دھمکی آمیز لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔

ہاں تو پہلے ہی صفحے پر سب سے اوپر یہ لکھو
مجھ کو انسانوں سے کوئی بغض یا نفرت نہیں
لیکن اتنا ہے کہ اگر میرا رزق اگر چھن جائے گا
غاصبوں کا گوشت بھی کچا چباؤں گا میں
بس ڈرو تم بھوک سے میری ڈرو
اور میرے غیض و غضب سے ڈرو (۲۴۲)

فیض احمد فیض کی شاعری میں آمریت 'استعماریت 'مذہبی اجاداری '(اور ظاہر داری)اور طبقاتی استحصال کے خلاف براہ راست مخالفت کی'وہاں علامتی انداز میں مزاحمتی شاعری بھی کی ہے۔فیض احمد فیض نے علامتی مقامی آمریت کو اپنے نشانے کا ہدف بنایاتودوسری جانب محمود درویش نے صہیونی طاقت سے لفظی محاذ جنگ کھولے رکھا۔فیض نے کلاسیکی علامات واستعارات کا سہارا لے کر انہیں نئی معنویت سے مالامال کیا۔فیض نے شیخ'فقیہہ اور واعظ جیسے الفاظ کے ذریعے ظاہر داری کے خلاف مزاحمت کی'محمود درویش نے زیتون'اوڈیسیس'ماں'محبوب جیسے الفاظ سے اپنی شاعری کی قدبڑھالی۔فیض احمد فیض کی علامتی کے پیچھے آمریت کی سختی کا عمل دخل ہے۔یعنی سنسرشپ سے بچاؤ کاراستہ یہی تھا کہ شاعر علامات واستعارات کو بروئے کارلائے جاتے ہیں تاکہ اپنی بات عوام تک پہنچ جائے اوراحتساب سے بھی بچ نکلے۔فیض کی طرح محمود درویش کی بھی مجبوری اوراپنے عہد کی ضرورت تھی'جس کی وجہ سے علامات واستعارات کو بر محل استعمال میں لائے۔

حوالہ جات

۱۔ ظفر حسین، آغا، مزاحمت اور پاکستانی شعراء، ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۱۰۹

۲۔ Danish.pk ۲۸ مارچ ۲۰۱۹ء، 3:20pm

۳۔ فیض احمد فیض، دست صبا، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۴۶

۴۔ مصدق حسین، ڈاکٹر، فیض احمد فیض کی نظریاتی وسماجی شاعری ایک جائزہ، مشمولہ: زبان وادب، شمارہ ۹، ۲۰۰۱ء، ص ۸۷

۵۔ www.urdulink.com ۱۹ اکتوبر ۲۰۱۸ء، 10:14pm

۶۔ سلیم، اختر، ڈاکٹر، تخلیق، تخلیق شخصیات اور تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہو، ۱۹۸۹ء، ص ۲۲۴

۷۔ فیض احمد فیض، میزان، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ص ۱۲

۸۔ ظفر اقبال، فیض ایک غیر مزاحمتی شاعر مشمولہ: ادبیات (سہ ماہی)، اکادمی ادبیات اسلام آباد، شمارہ ۸۲، جنوری مارچ، ۲۰۰۹ء، ص ۳۴

۹۔ نصرت چوہدری، ڈاکٹر، فیض کی شاعری (ایک مطالعہ) شان پبلشنگ ہاؤس، سرینگر۔ کشمیر، جون ۱۹۷۵ء، ص ۱۰۴

۱۰۔ urdu.dunyatoday.com ۸ جنوری ۲۰۱۹ء، 2:30pm

۱۱۔ منصور احمد قریشی، ڈاکٹر، فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری، مشمولہ: ارتقاء، مطبوعات، کراچی، شمارہ ۵۳، جون 2012ء، ص ۱۹۳

۱۲۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کارواں، لاہور، ص ۱۱۶

۱۳۔ علی محمد فاطمی، فیض ایک نیا مطالعہ، ایجوکیشنل ہاؤس، علی گڑھ، بھارت، ۲۰۱۲ء، ص ۲۹

۱۴۔ محولہ بالا ص ۲۹، ۳۰

۱۵۔ ابرار احمد، مزاحمتی ادب، مشمولہ: مزاحمتی ادب، اکادمی ادبیات، اسلا آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۴۸

۱۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، "معاصر ادب" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۲۲۰

۱۷۔ منصور احمد قریشی، ڈاکٹر، فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری، شمارہ ۵۳، ص ۲۲۳

۱۸۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، زنداں نامہ، ص ۴۹

۱۹۔ روبینہ شہناز،ڈاکٹر،اردو تنقید میں پاکستانی تصور قومیت، مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد، طبع اول ،۲۰۰۷ء،ص۲۱۷

۲۰۔ Danish.pk۱۶جولائی۲۰۱۹ء،12:۱۲pm

۲۱۔ فیض احمد فیض، دست تہہ سنگ، مکتبہ کارواں،لاہور،۱۹۷۴ء ص۸۱

۲۲۔ فیض احمد فیض، نقش فریادی، مکتبہ کارواں،لاہور،۱۹۷۴ء ص۹۹

۲۳۔ آغاناصر،ہم جیتے جی مصروف رہے،سنگ میل پبلیکیشنز،لاہور،۲۰۰۸ء ص

۲۴۔ فیض احمد فیض، دست صبا، ص۵۴

۲۵۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص۴۶

۲۶۔ آغاناصر،ہم جیتے جی مصروف رہے، ص۱۲۴

۲۷۔ منصوراحمد قریشی،ڈاکٹر، فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری، شمارہ ۵۳، ص۲۱۸

۲۸۔ فیض احمد فیض، دست تہہ سنگ، ص۱۴، ص۵۲

۲۹۔ منصوراحمد قریشی،ڈاکٹر، فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری، شمارہ ۵۳، ص۲۱۸

۳۰۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، سر وادی سینا، ص۲۰

۳۱۔ آغاناصر،ہم جیتے جی مصروف رہے، ص۱۵۴

۳۲۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، سر وادی سینا، ص۲۹

۳۳۔ فیض احمد فیض، دست صبا، ص۸۴

۳۴۔ ادبیات، اکادمی ادبیات اسلام آباد، شمارہ ۸۲، جنوری مارچ،۲۰۰۹ء،، ص۱۴۰

۳۵۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص۸۰

۳۶۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،زنداں نامہ، ص۸۷

۳۶۔ فیض احمد فیض، نقش فریادی، ص۲۷

۳۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،زنداں نامہ، ص۹۲

۳۸ فیض احمد فیض، دست صبا، ص۸۳

۳۹۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، نقش فریادی، ص۵۸

۴۰۔ منصوراحمد قریشی،ڈاکٹر، فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری، شمارہ ۵۳، ص۲۲۳، ۲۲۴

۴۱۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، ص ۱۱۶

۴۲۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، ص ۱۱۷

۴۳۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص ۲۸

۴۴۔ عبد الرؤف ملک، فیض: ایک سازشی شاعر، مشمولہ: فیض شناسی، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، اپریل، ۲۰۱۱ء، ص ۶۴

۴۵۔ آئی۔ اے۔ رحمان، فیض کی عالمی استعمار کے خلاف جدوجہد، شیخ عبد الرشید (مرتب)، موجودہ عالمی استعماری صورتحال اور فیض کی شاعری، یونیورسٹی آف گجرات،، مارچ ۲۰۱۱ء، ص ۶۵

۴۶۔ محولہ بالا

۴۷۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، فیض کو کیسے نہ پڑھیں، مشمولہ: فیض احمد فیض کی شاعری، اشتیاق احمد (مرتب)، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۹۵

۴۸۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، ص ۹۸

۴۹۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، ص ۱۴۱

۵۰۔ حمید نسیم، پانچ جدید شاعر، فضل سنز، نومبر ۱۹۹۴ء، ص ۵۱

۵۱۔ فیض نمبر، مزاحمتی شاعری، ص ۲۱۹

۵۲۔ www.urdulinks.com ۱۲۸ اکتوبر ۲۰۱۸، 2:12pm

۵۳۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، زنداں نامہ، ص ۸۴

۵۴۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، ص ۹۳

۵۵۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، ص ۹۸

۵۶۔ شیخ عبد الرشید (مرتب)، موجودہ عالمی استعماری صورتحال اور فیض کی شاعری ص ۶۷

۵۷۔ حسن جعفر زیدی، موجودہ استعماری توسیع پسندی اور فیض کی شاعری میں اس کے آثار مشمولہ: موجودہ عالمی استعماری صورتحال اور فیض کی شاعری، ص ۱۳۲

۵۸۔ اصغر ڈاکٹر، فلسفہ استعمار اور فیض کی شاعری، ص ۹۹

۵۹۔ محولہ بالا ص ۱۰۱

۶۰۔ فیض احمد فیض، فیض احمد فیض، دست صبا، ص ۸۴

۶۱۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، زنداں نامہ، ص ۴۷

۶۲۔ میجر اسحاق، دیباچہ، فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، زندان نامہ،، ص ۲۴

۶۳۔ Lib.bazmeurdu.net ۱۸اگست ۲۰۱۸، 6:24pm

۶۴۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے۔ ص ۴۳

۶۵۔ www.urdulinks.com۲جون ۲۰۱۹ء، 8:09pm

۶۶۔ lib.bazmerdu.net۱فروری ۲۰۱۹ء، 12:10am

۶۷۔ محولہ بالا

۶۸۔ منصور احمد قریشی، ڈاکٹر، فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری، شمارہ ۵۳، ص ۲۱۹

۶۹۔ lib.bazmeurdu.net۲۲جنوری ۲۰۱۹ء، 1:50pm

۷۰۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، غبار ایام، ص ۲۳

۷۱۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص ۴۹

۷۲۔ نثار ترابی، ڈاکٹر، فیض اور تحریک آزادی فلسطین، مشمولہ: زبان وادب، شمارہ ۹، شعبہ اردو، جی سی فیصل آباد، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۱، ۱۱۲

۷۲۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، ص ۱۰۴

۷۳۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، تحقیق، تنقید، تعبیر، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۶ء ص ۱۹۳

۷۴۔ محمد حمید شاہد، راشد۔ میراجی۔ فیض نایاب ہیں ہم، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۲۱۹

۷۵۔ فیض احمد فیض، دست صبا، ص ۳۰

۷۶ا۔ منصور احمد قریشی، ڈاکٹر، فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری، شمارہ ۵۳، ص ۲۲۳

۷۷۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے، جنگ پبلشرز، لاہور، اکتوبر ۱۹۹۹۲ء ص ۱۶۶

۷۸۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص ۴۴

۷۹۔ فتح محمد ملک، فیض شاعری اور سیاست، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۱

۸۰۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، سر وادی سینا، ص ۵۲

۸۱۔ محولہ بالا، ص ۵۲

۸۲۔ آغا ناصر ہم جیتے جی مصروف رہے، ۷۷

۸۳۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص ۶۲
۸۴۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، ص ۱۳۱
۸۵۔ فیض احمد فیض، شام شہر یاراں، مکتبہ کارواں، لاہور، س ن، ص ۹۰
۸۶۔ فردوس انور قاضی، اردو کے مختلف زاویے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور،، ۲۰۱۷، ص ۲۷۷
۸۷۔ فیض احمد فیض، مرے دل مرے مسافر، ص ۶۳
۸۸۔ فیض احمد فیض، زنداں نامہ ص ۴۵
۸۹۔ یحیٰ احمد، ڈاکٹر فیض کی ملاشناسی، مشمولہ: ارتقا، فیض نمبر، کراچی، شمارہ ۵۳، ص ۱۸۷
۹۰۔ محولہ بالا، ص ۱۸۳
۹۱۔ اشفاق احمد، ملامتی صوفی، مشمولہ: شام شہریاراں، فیض احمد فیض، مکتبہ کارواں، لاہور، س ن، ص ۲۵
۹۲۔ یحیٰ احمد، ڈاکٹر فیض کی ملاشناسی، شمارہ ۵۳، ص ۱۸۴
۹۳۔ ممتاز حسین، پروفیسر، ادب اور شعور، ادراہ نقد ادب، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۲۲۴
۹۴۔ محمد امین، ڈاکٹر، ادب وثقافت، مشمولہ: فیض کی شاعری میں سماجی شعور کا ارتقاء: ،مشال پبلشرز، فیصل آباد، س ن، ص ۳۴
۹۵۔ منصور احمد قریشی، ڈاکٹر، فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری، شمارہ ۵۳، ص ۲۲۲
۹۶۔ فیض احمد فیض، نقش فریادی ص ۷۷،۷۸
۹۷۔ منصور احمد قریشی، ڈاکٹر، فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری، شمارہ ۵۳، ۲۲، ۲۲۳
۹۸۔ فیض احمد فیض، دست صبا، ص ۸۹
۹۹۔ محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، دیدہ معنی کشا، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۳، ص ۵
۱۰۰۔ تبسم عنبرین شاکر، ڈاکٹر، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، نمل، اسلام آباد، ص ۳۳
۱۰۱۔ فیض احمد فیض، نقش فریادی، ص ۶۷
۱۰۲۔ افتخار بیگ، اردو شاعری پر وجودیت کے اثرات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد، شعبہ اردو، ۱۹۹۹ء، ص ۳۳۲
۱۰۳۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، زنداں نامہ، ص ۶۲
۱۰۴۔ نصرت چوہدری، ڈاکٹر، فیض کی شاعری (ایک مطالعہ)، ص ۴۳

۱۰۵۔ محولہ بالا، ص ۴۴،۴۴، ۴۵

۱۰۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، نقش فریادی، ۳۷، ۴۷

۱۰۸۔ محمد شفیع، تحریک آزادی فلسطین، مشمولہ: ماہ نو، بیاد فیض، جلد نمبر ۶۱، شمارہ نمبر ۵ مئی جون ۲۰۰۸، ص ۱۰۳

۱۱۹۔ Lib.bazmeurdu.net ۲۲ جنوری ۲۰۱۹ء، 10:20pm

۱۱۰۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، سر وادی سینا، ص ۸۴

۱۱۱۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، فیض سے ایک بات چیت، مشمولہ: فیض کی تخلیقی شخصیت، تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹، ص ۳۰۵

۱۱۲۔ khayaban.uop.pk ۲۴ مئی ۲۰۱۹ء، 3:30pm

۱۱۳۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۱۳، ص ۲۷۱

۱۱۳ ۔ میمونہ سبحانی ،"فیض کی شاعری میں رات کی علامت"، مشمولہ :زبان وادب ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، شعبہ اردو، شمارہ ۵، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۹، ص ۱۳۳

۱۱۴۔ رشید امجد، جدید ادبی تناظر، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۴۹

۱۱۵۔ طارق ہاشمی، جدید نظم کی تیسری جہت، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۸

۱۱۶۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، نقش فریادی، ص ۴۷

۱۱۷۔ فیض احمد فیض، دست تہہ سنگ، ص ۱۴

۱۱۸۔ سبط حسن، سخن در سخن، مکتبہ دانیال، کراچی، اشاعت دوم، ۲۰۰۹ء، ص ۹۴، ۹۵

۱۱۹۔ ثاقب رزمی، سائنسی فکر اور ہمعصر زندگی، نگارشات، لاہور، ۱۱۸۸ء، ص ۳۹

۱۱۹۔ پروفیسر شاہد کامران ، تحریک آزادی فلسطین کو روشن خیالی سے نکالنے کی کوشش ، مشمولہ: علامہ اقبال اور تحریک آزادی فلسطین، فریدہ الٰہی، جاوداں پبلی کیشنز، اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۷ء، ص ۸

۱۲۰۔ سبط حسن، سخن در سخن ص ۹۵

۱۲۱۔ عبدالحق حقانی القاسمی، فلسطین کے چار ممتاز شعراء، تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی ۱۹۹۵، اشاعت اول، ص ۵۴

۱۲۲ ۔اسماء رشید، ڈاکٹر، مقبوضہ فلسطین کا ادب المقاومۃ، مشمولہ: فلسطین اردو ادب میں (مرتب) فتح محمد ملک ،سنگ میل لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۳۱

۱۲۳۔ فتح محمد ملک، فلسطین اردو ادب میں، ص ۳۷

۱۲۴۔ عبد الحق حقانی القاسمی، فلسطین کے چار ممتاز شعراء، ص ۱۵

۱۲۵۔ محولہ بالا

۱۲۶۔ سعادت سعید (مترجم) دانشور، سہ ماہی ادبی رسالہ: محمود درویش، جنوری ۱۹۹۰ء، شمارہ ۶، ص ۲۷

۱۲۷۔ فضل توصیف، محمود درویش کہ ہمارا شاعر تھا، مشمولہ: ماہنامہ اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۸۰

۱۲۸۔ www. deed ban. magazine.com ۲۳مئی ۲۰۱۹ء، 12:20am,

۱۲۹۔ عبد الحق حقانی القاسمی، فلسطین کے چار ممتاز شعراء، ص ۶۹

۱۳۰۔ محمود درویش، اعمال الکاملہ، ۴۵۵

۱۳۱۔ منو بھائی، مترجم، فلسطین فلسطین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴، ص ۶۶

۱۳۲۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش میں، قوسین، لاہور، طبع اول، ۲۰۱۵ء، ص ۶۷

۱۳۳۔ http://www.al-ayyam.ps ۲۰مئی ۲۰۱۹ء 10:30pm

۱۳۴۔

Marwan A. Hamd, an International journal of Humanities and Social Science

،Darwish's Voicing Poetics of Resistance: A Receptionist Review، Vol.۶, No. ۱۰

۱۳۵۔ web.facebook.com ۱۰اپریل ۲۰۱۹ء، 5:30pm

۱۳۶۔ فتح محمد ملک، فلسطین اردو ادب میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲

۱۳۷۔ آصف فرخی، ارض فلسطین کا جیالا شاعر محمود درویش، مشمولہ، دنیا داز، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۱۹

۱۳۸۔ Epaper.kashmiruzma.net ۱۰اکتوبر ۲۰۱۸ء، 4:30pm,

۱۳۹۔ اجمل کمال، مترجم: محاصرہ (محمود درویش کی ایک طویل نظم)، آج، ادبی کتابی سلسلہ، شمارہ ۴۷، ذکی سنز پرنٹرز، کراچی، جنوری ۲۰۰۵ء، ص

۱۴۰۔ دنیازاد، کتاب ۲۳، شہرزاد، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۸ء

۱۴۱۔ منو بھائی، مترجم: فلسطین فلسطین، ص ۱۲

۱۴۲۔ دنیازاد، کتاب ۲۳، ص ۲۷۴

۱۴۳۔ محمد کاظم، اخوان الصفا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۲۵۴

۱۴۴۔

Marwan A. Hamd, an International journal of Humanities and Social Science

۱۰, No. ٦Vol.،Darwish's Voicing Poetics of Resistance: A Receptionist Review،

۱۴۵۔ www.dunya.com ۱۲اپریل۲۰۱۹ء6:20pm

۱۴۶۔ اجمل کمال، مترجم: محاصرہ (محمود درویش کی ایک طویل نظم)، شمارہ ۴۷، ص 57

۱۴۷۔ محولہ بالا، ص ۲۳

۱۴۸۔ غسان کفانی، ادب الفلسطین تحت الاحتلال، فلسطین اور اردو ادب، ص ۱۲۸

۱۴۹۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش میں، ص ۹

۱۵۰۔ مرتضیٰ قائمی، ڈاکٹر، بررسی کاربرد رنگ ھادر تصویر پردازی محمود درویش از مقاومت فلسطین، دانش کدہ ای ادبیات وعلوم انسانی، کرمان، ایرانم ۱۳۸۹ھ، ص ۸

۱۵۱۔ دنیازاد، کتاب ۲۳، ص ۲۲۱

۱۵۱۔ محمود درویش، اوراق الزیتون، بطاقۃ ھویہ، ص ۴۸، ۴۹

۱۵۲۔ منو بھائی، مترجم: فلسطین فلسطین، ص ۳۱

۱۵۴۔ محمود درویش، حالۃ الحصار، مؤسسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ، ص ۳۶

۱۵۵۔ عبد الحق حقانی القاسمی، فلسطین کا ممتاز مزاحمتی شاعر: محمود درویش، مشمولہ: فکر و نظر، شمارہ نمبر ۱، دہلی، ص ٦٦، ٦٧

۱۵٦۔ محمود درویش، عاشق من فلسطین، مؤسسہ محمود درویش، دار النشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ، ص ۱۵

۱۵۷۔ www.express.pk ۱۲اپریل۲۱۰۹ء،2:20pm

۱۵۸۔ دنیازاد، کتاب ۲۳، ص ۲۱۹

۱۵۹۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش میں، ص ۱۱۱

۱٦۰۔ دنیازاد، ص ۲۱۹، اکتوبر ۲۰۰۸، کتاب ۲۳، ص ۲۱۴

۱٦۱۔ منو بھائی فلسطین فلسطین، ص ۱۴

۱٦۲۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش میں ص ۱۱۱

۱٦۳۔ محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۸۱

۱۶۴۔ محمود درویش، عاشق من فلسطین، نشید، ص ۵۸

۱۶۵۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش میں، ص ۸۲

۱۶۶۔ pu.edu.pk ا مئی ۲۰۱۹ء، 5:20pm

۱۶۷۔ محمود درویش، عاشق من فلسطین، ۱۹۶۶، ص ۳۷

۱۶۸۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین، ص ۲۷

۱۷۱۔ pu.edu.pk، ۹ دسمبر ۲۰۱۸ء، 1:17pm

۱۷۰۔ محمود درویش، آخر اللیل، مؤسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ، ص ۷۷

۱۷۱۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش میں، ص ۱۸۳

۱۷۲۔ pu.edu.pk ۲ جولائی ۲۰۱۸ء، 2:12am

pu.edu.pk ا دسمبر ۲۰۱۸ء، 3:30pm

۱۷۳۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین، ص ۴۱

۱۷۴۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین، ص ۶۷

۱۷۵۔ pu.edu.pk ۲ جولائی ۲۰۱۸ء، 2:20pm

۱۷۶۔ اجمل کمال، مترجم: محاصرہ (محمود درویش کی ایک طویل نظم)، شمارہ ۷۴، ص ۵۵

۱۷۷۔ محولہ بالا، ص ۴۳

۱۷۸۔ محمود درویش، اوراق الزیتون، مؤسہ محمود درویش، دار النشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ، ص ۱۴

۱۷۹۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش میں، ص ۹

۱۸۰۔ Pu.edu.pk ۲ جولائی ۲۰۱۸ء، 2:12am

۱۸۱۔ محمود درویش، الاعمال الاولیٰ، اوراق الزیتون، عن انسان، ص

۱۸۲۔ فاروق حسن، مترجم، محمود درویش اپنی زمین کی تلاش میں، ص ۴۶

۱۸۳۔ محمود درویش، طوفان کا وعدہ، مشمولہ، فلسطین کے چار ممتاز شعرا، مرتب عبد الحق حقانی قاسمی
تخلیق کار پبلیشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۶

۱۸۴۔ عبد الحق حقانی قاسمی، فلسطین کا ممتاز مزاحمتی شاعر: محمود درویش، فکر و نظر، دہلی، ص ۶۴

۱۸۵۔ محمد کاظم، اخوان الصفا، ص ۲۵۴

۱۸۶۔ عبدالحق حقانی قاسمی، فلسطین کا ممتاز مزاحمتی شاعر: محمود درویش، ص ۱۰۳

۱۸۷۔ محولہ بالا، ص ٦٦

۱۸۸۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین ص ۱۵

۱۸۹۔ عبدالحق حقانی قاسمی، فلسطین کے چار ممتاز شعرا، ص ۱٦

۱۹۰۔ عبدالحق حقانی قاسمی، فلسطین کا ممتاز مزاحمتی شاعر: محمود درویش، مشمولہ: فکر و نظر، ص ۱۰۷

۱۹۱۔ www.dunya.com ۹جولائی ۲۰۱۹، 2:30pm

۱۹۲۔ محمود درویش، عاشق من فلسطین، ص ٦۲

۱۹۳۔ فاروق حسن، مترجم، محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۸۷

۱۹۴۔ محولہ بالا، ص ۱

۱۹۵۔ محولہ بالا، ص ۴٦

۱۹٦۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین، ص ۱۵

۱۹۷۔ عبدالحق حقانی القاسمی، فلسطین کے چار ممتاز شعراء، مشمولہ،: فکر و نظر ص ۱۱۹

۱۹۸۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین، ص ۱۱، ۱۲

۱۹۹۔ محولہ بالا ص ۱۲

۲۰۰۔ فاروق حسن، مترجم، اپنی زمین کی تلاش میں،

۲۰۱۔ عبدالحق حقانی القاسمی، فلسطین کے چار ممتاز شعراء، ص ٦۷

۲۰۲۔ محولہ بالا، ص ۷۱

۲۰۳۔ محولہ بالا ص ۴۷

۲۰۴۔ عامر مفتی، مترجم، آصف فرخی، دنیازاد،، اکتوبر ۲۰۰۸ء، کتاب ۳۳، ص ۲٦۴

۲۰۵۔ عبدالحق حقانی القاسمی، فلسطین کے چار ممتاز شعراء ص ۲۱۵

pu.edu.pk ۳جون ۲۰۱۹ء، 8:30pm

۲۰۷۔ محمود درویش، الاعمال الاولیٰ، اوراق الزیتون، عن الامنیات، ص ۵۳

۲۰۸۔ محمود درویش، "خواہش" مترجم ضمیر احمد، مشمولہ دوسروں کی شاعری، کراچی، شہر زاد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۸۴

۲۰۹۔ ابوالکلام قاسمی، فلسطین کا ممتاز مزاحمتی شاعر: محمود درویش، مشمولہ: فکر و نظر، ص ۴۷

۲۱۰۔ فاروق حسن، مترجم، محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۴۵

۲۱۱۔ محولہ بالا

۲۱۲۔ محولہ بالا، ص ۴۵

۲۱۳۔ محولہ بالا، ص ۴۳

۲۱۴۔ محولہ بالا، ص ۲۲

۲۱۵۔ محولہ بالا ص ۱۹

۲۱۶۔ عبدالحق حقانی القاسمی، فلسطین کا ممتاز مزاحمتی شاعر: محمود درویش، ص ۴۷

۲۱۷۔ امجد اسلام امجد، عکس، مشمولہ: مقدمہ: محمد کاظم، مجلس ترقی ادب، لاہور، جون ۱۹۷۶ء، اشاعت اول ، ص ۲۵

۲۱۸۔ محمود درویش، محمود درویش کی ایک گفتگو اور ایک طویل نظم، مشمولہ اخوان الصفا اور دوسرے مضامین، ص ۲۵۶

۲۱۹۔ عبدالحق حقانی القاسمی، فلسطین کا ممتاز مزاحمتی شاعر: محمود درویش، ص ۴۴

۲۲۰۔ محمود درویش، عاشق من فلسطین، صوت من الغابة، ۱۹۶۶، ص ۲۷

۲۲۱۔

Bahram Amani,Symbolism and Symbols of Resistance Movement in Mahmoud Darwish's Poetry،INTERNATIONAL JOURNAL OF HUMANITIES AND CULTURAL STUDIES ISSN ۲۳۵۶-۵۹۲۶

۲۲۲۔ محمود درویش، حبیبی تنہض من نومھا، مؤسسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ، ص ۴۶

۲۲۳۔ عبدالحق حقانی القاسمی، فلسطین کا ممتاز مزاحمتی شاعر: محمود درویش، فکر و نظر، ص ۵۷

۲۲۴۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش میں، ص ۱۲

۲۲۶۔ اجمل کمال، مترجم: محاصرہ (محمود درویش کی ایک طویل نظم)، شمارہ ۷۴، ص، ص، ۵۱

۲۲۷۔ محولہ بالا

۲۲۸۔ محولہ بالا

۲۲۹۔ محمود درویش، آخر اللیل، ص ۸۸

۲۳۱۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین، ص۸۷

۲۳۲۔ محمد حارث، مترجم، دانشور، سہ ماہی ادبی رسالہ: محمود درویش،، ص ۴۵

۲۳۳۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین ص۱۵۷تا۱۵۹

۲۳۴۔ محمد حارث، مترجم، دانشور، سہ ماہی ادبی رسالہ: محمود درویش،، ص ۴۵

۲۳۵۔ محولہ بالا، ص۳۲،۳۱

۲۳۶۔ فیض احمد فیض، دست صبا، ص۱۵

۲۳۷۔ محولہ بالا ص۳۰

۲۳۸۔ محولہ بالا ص۲۶

۲۳۹۔ فیض احمد فیض، شام شہریاراں، مکتبہ کارواں، لاہور، س ن، س ۸۲

۲۴۰ ۔ اجمل کمال، مترجم: محاصرہ (محمود درویش کی ایک طویل نظم)، شمارہ ۴۷، ص، ص ۲۳

۲۴۱۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، نقش فریادی، ص ۶۲

۲۴۲۔ pu,edu.pk ۲جولائی۲۰۱۸ء، 2:12am

باب سوم

فیض احمد فیض اور محمود درویش کی جلاوطنی کی شاعری کا تقابل

الف۔ فیض کی جلاوطنی کی شاعری کا پس منظر:

جلاوطنی ایک ذہنی کرب سے عبارت ہے'جب ایک شخص اپنے وطن سے دور ہوتا ہے تو وہ شب وروز وطن کی یاد میں لگا رہتا ہے۔شاعری میں جلاوطنی ""ادب المہجر"کی طرح وطن کی یاد'سفری مشکلات'اجنبیت'وطن سے محبت'اور وطن کی بہتری اور وطن کو خوبصورت دیکھنے کی خواہش سے ابھر آتی ہے۔قدیم یونانی ادب سے جلاوطنی کا بیان ہوتا رہا ہے'اوڈیسی کی مکمل کہانی وطن سے بچھڑ کر وطن واپسی کی روداد ابتلاء کو بتارہی ہے۔لیکن جلاوطنی ایک رجحان کی صورت اظہار نو آبادیاتی ممالک کے شعرا کے ہاں نظر آتی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر محمد سفیر اعوان کا کہنا ہے:

> "جلاوطنی اور بدیسی اجنبیت(Exile & Alienation) مابعد نو آبادیاتی مطالعہ میں ایک اہم فکری موضوع ہے۔ جیسا کہ اس کی ابتدا بڑے دانش وروں کے اجنبیت کے اس نقطہ نظر میں موجود ہے۔ جنہوں نے نو آبادیاتی قوموں کے بارے میں مغرب کے غالب بیانیے کو چیلنج کیا۔تیسری دنیا کے ادبی اور سیاسی منظر نامے میں الجزائر کے فرینٹز فیانن (Frantz Fanon)، امریکہ کے ایڈورڈ سعید(Edward Said)، چلی کے پیولو نیو رودا (Pablo Neruda)، کینیا کے گوگی واتھیا آنگو(Ngugi wa Thiongo) اور پاکستان کے اقبال احمد ظلم کے خلاف کے تحریری اور حقیقی احتجاج سے نمایاں تھا۔۔فیض نے بیسویں صدی کے اس دور میں لکھا جب دنیا کے کئی عظیم عوامی دانشور سرمایہ دارایت اور استعماری قوتوں کے خلاف مزاحمت کررہے تھے"(۱)

فیض احمد فیض کا شمار اردو کے نمایاں شعراء میں ہوتا ہے۔فیض احمد فیض کی ابتدائی شاعری رومانویت سے مملو تھی بعد ازاں ان کی شاعری میں غم روزگار بھی غم جاناں سے زیادہ ابھر کر سامنے آیا۔عصری اور سیاسی وسماجی شعور کی وجہ سے ان کی شاعری صرف اپنے تک محدود نہیں رہی بلکہ ان کی شاعری ہر مزدور'محنت کش اوراستحصال زدہ لوگوں کی حمایت اور سرمایہ داریت اورآمریت کی مزاحمت میں پیش پیش نظر آتی ہے۔فیض احمد فیض کو مارکسزم سے وابستگی اور ممکنہ انقلاب کے سدباب کی وجہ سے راولپنڈی کیس میں الجھایا گیا۔باربار جیلوں میں بند رہنے کی وجہ سے فیض

نے جلاوطن ہونے کاارادہ کیا'یوں فیض خودساختہ جلاوطنی اختیار کرگئے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر فیض نے خودساختہ جلاوطنی کیوں کی؟اور کتنی بار جلاوطن ہوئے پھر یہ کہ آخری جلاوطنی کیوں طول کیوں پکڑی؟ جلد ہی واپس ہو جاتے؟اس سوال کا جواب فیض نے خوددیا:"یہ بات نہیں کہ اپنی جنگ اب ختم ہوچکی ہے۔بات صرف یہ ہے کہ میں اب پہلے کی طرح جوان نہیں ہوں اور بڑھاپے میں جسمانی سزابرداشت کرنامشکل کام ہے۔میری روح توجسمانی اذیت برداشت کرنے کواب بھی تیار ہے مگر جسم گریزاں ہے"(۲)

جلاوطنی میں فیض احمد فیض مارشل لاء سے تو بچ گئے'لیکن آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'فیض کوجب جسمانی آزادی جیلوں سے میسر آئی'لیکن فیض پر ذہنی کرب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔جس کی وجہ سے فیض کی تنہائی مزید بڑھتی گئی۔فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

"جلاوطنی میں آدمی جسمانی سزا کی اذیت اور قید تنہائی کے عذاب سے تو بے شک بچ جاتا ہے مگر ایک طرح کی روحانی تنہائی کے کرب میں مبتلا ہوجاتا ہے۔جلاوطنی کی مدت طویل سے طویل تر ہوتے چلے جانے کے ساتھ فیض کے ہاں رونق میں ویرانی کا احساس اور ہجوم میں تنہائی کا کرب شدید سے شدید تر ہونے لگا"(۳)

اشفاق حسین اپنے ایک مضمون"فیض کی زندگی کے آخری سات سال"میں لکھتے ہیں:

فیض کے نشتر کا اصل ہدف یہی خداوندان سرزمین ہیں جن کی ہوس اقتدار پرستی نے فیض جیسے عاشق کووطن بدری کے لبادے میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔زندگی کے آخری سات برسوں میں جوموضوعات ان کی شاعری کااحاطہ کرتے ہیں۔اُن میں جلاوطنی کاکرب سرفہرست ہے۔فیض کی جلاوطنی اختیاری ہونے کی وجہ سے عام سیاسی جلاوطنی سے ذرامختلف ہے۔فیض صاحب نے ٹورنٹو میں کسی کے پوچھنے پر جواب دیا تھا کہ"نہیں مجھے کسی مارشل لاء کی عدالت سے جلاوطنی کاپروانہ نہیں ملاہے بلکہ حالات ہی کچھ ایسے ہوئے تھے کہ یہ راہ اختیار کرنی پڑی"(۴)

جلاوطنی کیاہوتی ہے اوراس کے نتیجے میں انسان پر کیاگزررہی ہوتی ہے اس کا اندازہ ایک انسان اس وقت لگاسکتاہے جب وہ خوداس کرب سے گزرجائے بات کوسن لینااور ہوتاہے اورخودتجربے کی بھٹی میں سے گزرنااور ہوتا ہے۔ایک بات ہے کہ جلاوطن شاعر کوجلاوطنی کی حالت میں دیکھنا ایسا ہے جلاوطنی کی شاعری کی تجسیم کودیکھنایعنی شاعر کی اضطرابی کیفیت'بے چینی'کرب'وطن کی یاد میں کھویاکھویاہونا'ناسٹلجیائی حالات'وطن کی فکر میں رہناوطن

کوخوبصورت بنانے کی سعی میں رہنااوروطن کی بہتری اورانقلاب کے لیے سوچناوغیرہ یہی جلاوطنی کی شاعری ہوتی ہے۔جس کااندازہ شاعر کوجلاوطنی کی کیفیت میں بنفس نفیس دیکھنے سے لگایاجاسکتاہے کہ شاعر کس درداور کرب کی زندگی گزارر ہاہے۔

اپنی جلاوطنی کے دوران فیض کچھ عرصہ ایڈورڈ سعید اور اقبال احمد کے ساتھ رہے۔سعید اس وقت کو اپنے ایک مضمون میں ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں: "کسی شاعر کو جلاوطنی میں دیکھنا، باخلاف اس کے کہ جلاوطنی کی شاعری کو پڑھا جائے، ایساہی ہے جیسے کہ جلاوطنی کی تجسیم کو دیکھنا۔کئی سال قبل میں نے کچھ وقت عصر حاضر کے عظیم ترین اردو شاعر فیض احمد فیض کے ساتھ گزارا۔ضیاءالحق کے آمرانہ دور حکومت میں انہیں اپنے آبائی وطن پاکستان سے جلاوطن کر دیا گیا۔اور بیروت کی تباہی نے ان کو خوش آمدید کہا۔ان کے قریب ترین دوست فلسطینی تھے لیکن میرا اندازہ ہے کہ گو ان میں بظاہر باہمی وابستگی تو تھی لیکن کوئی بھی چیز مکمل طور پر مماثلت نہیں رکھتی تھی، چاہے وہ زبان ہو، شعری روایت ہو یازندگی کی تاریخ، صرف ایک دفعہ جب اقبال احمد، جو کہ خود ایک پاکستانی جلاوطن تھے، بیروت آئے تو ایسا نظر آیا کہ فیض اپنے چہرے پر بیگانگی کے تاثرات پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔ہم تینوں ایک رات ایک چھوٹے سے ریسورنٹ میں بیٹھے اور فیض نے ہمیں اپنی نظمیں سنائیں۔کچھ وقت کے بعد فیض اور اقبال احمد نے میرے لیے اشعار کا ترجمہ کرنا چھوڑ دیا، لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔کیونکہ میں یہ جان چکا تھا کہ اس کو ترجمے کی ضرورت نہ تھی"[۵] فتح محمد ملک لکھتے ہیں کہ:

> "جلاوطنی میں آدمی جسمانی سزا کی اذیت اور قید تنہائی کے عذاب سے تو بے شک بچ جاتا ہے مگر ایک طرح کی روحانی تنہائی کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔جلاوطنی کی مدت طویل سے طویل تر ہوتے چلے جانے کے ساتھ فیض کے ہاں رونق میں ویرانی کا احساس اور ہجوم میں تنہائی کا کرب شدید سے شدید تر ہونے لگا"[۶]

فیض احمد فیض ایک محب وطن شاعر ہیں۔لیکن آمریت کو فیض برداشت نہیں ہوئی نتیجے میں نہ چاہتے ہوئے جلاوطن ہوئے۔جلاوطنی کے دوران بھی فیض لیلائے وطن کے گیسو سنوارتے رہے۔

فیض کو اپنی شاعری میں انقلابی ومزاحمتی اظہار کے باعث ایوب خان کے دورِ اقتدار سے لے کر جنرل ضیاء الحق تک کئی مرتبہ وطن بدری اختیار کرناپڑی۔بھٹو کے دور میں کچھ عرصہ ہی وطن میں رہنانصیب ہوا لیکن پھر انہیں وطن عزیز کو خیر باد کہناپڑا۔کیونکہ وہ ظلم واستبداد کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔اور اس کے خلاف آوازِ حق بلند کئے بغیر بھی

نہ رہ سکتے تھے۔ جو ملک اس قدر امنگوں سے حاصل کیا گیا ہو۔اس وطن عزیز پر آمریت کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ سیاسی اختلافات کی بنا پر مخالفین کو قید و بند میں ڈالنا تو معمولی بات تھی'لیکن بد تر بات یہ تھی کہ مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار کر ان سے نجات حاصل کرنے کی روش بھی عام تھی۔ یہی وجہ تھی فیض روس'الجیریا'مصر'لبنان'ہنگری اور لندن میں مارے مارے پھرتے رہے۔ آغا ناصر کا کہنا ہے کی"فیض صاحب پر زندگی میں دوبار جلاوطنی کی واردات گزری۔ پہلی بار ۱۹۶۲ء میں'یہ ایوب خان کے مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ دوسری بار ۱۹۷۸ء میں یہ جنرل ضیاءالحق کی مارشل لاء کا زمانہ تھا۔

قید و بند کی طرح فیض پر جلاوطنی کے بھی دو دور آئے۔ ایوب آمریت کا دور غربت،ضیاءالحق کے زمانے میں جلاوطنی کی نسبت کم اذیت ناک تھا۔وجہ یہ کہ پہلے دور میں اہل خاندان کی رفاقت میسر تھی۔ پھر روس 'الجیریا'مصر'لبنان اور ہنگری وغیرہ ممالک کی سیر و سیاحت بھی اسی زمانے میں ہوتی رہی اور سب سے بڑھ کر یہ امید بھی تروتازہ تھی کہ بزبان فیض:

دشت شب میں اس گھڑی چپ چاپ ہے شاید رواں
ساقی صبح طرب'نغمہ بہ لب'ساغر بہ کف
وہ پہنچ جائے تو ہو گی پھر سے برپا انجمن
اور ترتیب مقام و منصب و جاہ و شرف (۸)

فیض نے جب جلاوطنی اختیار کی تو یوں تو بیرون ممالک میں آمریت کے احتساب کا کھٹکا تو ٹل گیا اور زندگی میں راحتیں میسر آنے کے باوجود بھی فیض اجنبیت کی زندگی گزارنے لگے'وطن اور لیلائے وطن کی یاد انہیں ستاتی رہی۔ جیسے جب زندان میں تھے تو بھی اہل وطن کو نہیں بھولے'اب دیار غیر میں بھی فیض اپنے ہم وطنوں کو صبا کے وساطت سے سلام بھیجتے ہیں۔ جن کی زندگی آمریت کی نذر ہو گئی ہے۔ جن پر آمریت کا نامہرباں سایہ تادیر سے قائم ہے۔

ان دنوں رسم ورہ شہر نگاراں کیا ہے
قاصدا قیمت گلگشت بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ مے خانہ ہے
آج کل صورت بربادئ یاراں کیا ہے (۹)

اس طرح کے سوالات فیض کو اضطراب میں لاتے ہیں۔

شرح فراق' مدح لب مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں
یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دلربا کے نام پہ خالی سبو کریں

ملک کو کئی وجوہات کی بنیاد پر خیر باد کہا جاتا ہے ایک یہ کہ انسان معیشت کو بہتر بنانا چاہتا ہے اس وجہ سے وطن سے دور ہو جاتا ہے دوسری یہ کہ حاکم وقت اسے وطن میں بیٹھنے نہیں دیتا اسے ملک بدر کرتا ہے اور تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی حاکم یا آمر اسے ملک بدر نہیں کرتا لیکن ملک میں رہنا اس کے لیے محال ہو جاتا ہے' حقوق جہاں سلب ہو رہے ہوں' ایجنسیوں کا غول جس کا پیچھا کر رہا ہو' اظہار رائے پر پابندی ہو تو وہ شخص اپنے ملک میں رہتے ہوئے اپنے ملک سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور ایک احساس مغائرت جنم لیتا ہے' گو کہ ایک ذہنی کرب اور پریشانی کا عالم نمودار ہوتا ہے نتیجے میں وہ شخص وطن سے مزید قریب ہونے کے لیے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کرتا ہے۔ فیض کا شمار بھی اس طرح کے لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے وطن کی چاہت میں جلاوطنی اختیار کی اور وطن کے بہتر مستقبل کے لیے کوشاں رہے۔ ڈاکٹر انوار احمد کا کہنا ہے:

"یہ درست ہے کہ فیض صاحب کو باقاعدہ حکم کے ذریعے وطن بدر نہیں کیا گیا تھا مگر ہر شخص جانتا ہے کہ جب مارشل لاء نافذ کر دیا جائے، بنیادی انسانی حقوق معطل کر دیئے جائیں اور ان حقوق کی ضمانت دینے والا دستور بھی سرد خانے میں رکھ دیا جائے تو پھر اس سرزمین پر رہنے والا ہر خوددار اور احساس شخص جلاوطن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وطن سے لوگوں کا رشتہ ان کے بنیادی انسانی حقوق کے طفیل بیدار رہنے والے احساس شرکت کی بدولت ہوتا ہے۔ اور جب انہیں اس سے محروم کر دیا جائے تو پھر وہ احساس مغائرت یا بیگانگی کا رویہ پیدا ہوتا ہے جو ملکوں کی تاریخ ہی نہیں جغرافیہ کو بھی بدل دیتا ہے (۱۰)

آمریت اور مارشل کے دور میں فیض نے دو مرتبہ جلاوطنی اختیار کی' پہلی بار ایوب خان کے دور میں لندن میں جلاوطنی کے دن گزارے وہاں وطن کی یاد کی قبا اوڑھے سوز تنہائی میں گھلتے رہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک کا حوالہ دیتے ہوئے آغا ناصر لکھتے ہیں "وطن اور یاران وطن کی جدائی نے انہیں سراپا اضطراب بنائے رکھا۔ زندان کے عدم آباد

جدائی کی مانند یہاں بھی انہوں نے صبا کی وساطت سے سلام وپیام کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ فیض صاحب نے لندن کو خیر آباد کہااور لیلائے وطن سے آملے (۱۱)

یوں فیض وطن کی غربت نصیبی پر جلاوطنی کے دوران بھی گریہ کرتے رہے۔فیض پر جلاوطنی کے دوران بیگانگیت کی کیفیت چھائی رہی۔عالم تنہائی میں فیض وطن کے بارے میں اس انداز کے مخاطب ہوئے ہیں:

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکر وطن
تو چشم صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں
ہم سے کہتے ہیں چمن والے 'غریبان چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ اپنے ویرانے کا نام
ہر منزل غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت در بدری نے
شرح فراق' مدح لب مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تیری گفتگو کریں

۱۹۷۷ء میں آمریت نے زیادہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ سخت مارشل لاء کا نفاذ کیا۔وطن عزیز نئے امتحان سے گزر رہا تھا۔اس کیفیت میں "وطن بدر ہوں کہ ہم تم" کی آوازیں سنائی دینے لگی۔اس دور کے بارے میں آغا ناصر کا کہنا ہے:

"۱۹۷۷ء کی جولائی میں ملک کا غالباً سب سے زیادہ ہولناک مارشل لا نافذ کیا گیا۔یہ کام ایک ایسے جنرل نے کیا تھا' جسے وزیراعظم بھٹو نے خاص اس عہدے کے لیے خود منتخب کیا تھا۔۱۹۷۷ء کے الیکشن کے بعد جب پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان نیشنل الائنس کے مذاکرات کامیاب ہونے کے قریب تھے کہ اچانک ۴اور ۵ جولائی کی درمیانی شب پاک آرمی حرکت میں آگئی اور جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا" (۱۲)

فیض کو جلاوطنی کے دنوں میں یہ بری خبر ملی کہ آمریت نے جمہوریت کا گلہ گھونٹ دیا ہے' مارشل لاء کا سہارا لے کر ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو جیسے بیباک اور نڈر سیاسی اور جمہوری لیڈر کو پھانسی کی راہ دکھائی ہے اور یوں بھٹو کی زندگی کی شمع گل ہوگئی۔فیض سے رہا نہ گیا' اس پس منظر میں فیض نے ایک نظم لکھی' جس کا لب لباب یہ ہے کہ

مادر وطن پر بہت برا وقت آن پڑا ہے' تاریکیوں اور ظلمتوں کا مسکن میرا وطن بنا ہوا ہے' مذہب کے نام پر معصوم لوگوں کا خون کیا جا رہا ہے' آئین کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہے' کوئی امید بھر نہیں آتی' کوئی سمت اور منزل کا تعین نہیں ہے' ان حالات کی وجہ سے عوام میں خوف اور دہشت کی فضا قائم ہوئی اس کی عکاسی فیض نے بڑی خوبصورتی سے ان اشعار میں کی ہے:

بکھر گئے اس کے تن بدن پر
نراس تنہائیوں کے سائے
اور اس کو کچھ بھی خبر نہیں ہے۔۔
کدھر کو جانے کا رخ کیا تھا
نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو
اب دماغ سفر نہیں ہے
یہ وقت زنجیر روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے (۱۳)

ب۔ فیض کی جلاوطنی کی شاعری کی جہات:

فیض احمد فیض کی جلاوطنی یوں تو خود اختیار کردہ یعنی خود ساختہ جلاوطنی ہے' اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فیض کی جلاوطنی کی شاعری کی اہم جہات یہ ہیں:

i۔ خود اختیار کردہ جلاوطنی کی شاعری

ii۔ وطن میں بے وطنی کا احساس

iii۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں جلاوطنی کے نئے میلانات

i۔ خود اختیار کردہ جلاوطنی کی شاعری:

فیض احمد فیض نظریاتی شاعر ہیں' وہ شاعری کو از راہ تفنن اخذ نہیں کرتے بلکہ اقبال کی طرح اپنے پیغامات کے ابلاغ کے لیے شاعری کا سہارا لیا ہے۔ فیض شاعری کو بڑا مقام دیتے ہیں اور جس قدر اس کا مقام ہے اسی مناسبت سے

اس کی ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے۔ فیض شاعری کے فرض منصبی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں "شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت 'زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے [۱۴] فیض نے مجاہدہ سے کام لیتے ہوئے مزاحمتی شاعری کی ہے وہاں فیض نے مزاحمت کے لبادے میں جلاوطنی کی شاعری بھی کی ہے "اسی مجاہدے میں فیض نے اسی (جلاوطنی کے) پر آشوب اور پیچیدہ تجربے کے ہر ذائقے کو چکھا [۱۵]

اردو کے عظیم شاعر فیض احمد فیض کو ایوب خان کے مارشل لاء نے ہجرت کرنے پر مجبور کیا تو ان کا قلم شعلہ بن گیا اور جلاوطنی میں اس سے ایسی نظم وغزل چنگاری بن کر نکلی جو مہجری ادب کے طور پر کبھی نہیں بھلائی جا سکتی [۱۶]

فیض لندن کو خیر آباد کہہ کر دوبارہ پاکستان آئے تو ترقی پسند تحریک از سر نو منظم کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں لیکن ان تدابیر کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا جمہوریت کا جنازہ اٹھنے لگا آمریت کو تقویت ملنے لگی 'زوالفقار بھٹو جیسے عظیم لیڈر کو تختہ دار پر لٹکایا گیا ان حالات کو دیکھ کر فیض گویا ہوئے "مرے دل مرے مسافر، ہوا پھر سے یہ حکم صادر" ان حالات کے پیش نظر فیض نے دوسری جلاوطنی اختیار کی۔ "پہلی جلاوطنی میں لندن کو بسیرا بنایا تھا۔ مگر اب کے بیروت عارضی مستقر ٹھہرا۔ لندن میں دوستوں اور عقیدت مندوں' مداحوں اور پرستاروں کی کمی نہ تھی لیکن بیروت میں کسی ہم زبان اور ہم نفس سے کبھی کبھار ہی غیر متوقع سامنا ہوتا تھا [۱۷] فیض عمر بھر ظالم حکمرانوں کی نفی سے اللہ کی ذات سے محبت کے سیاسی اور روحانی مسلک پر قائم رہے۔ اور یہی ثابت قدمی فیض کی اسیری اور پردیس میں دربدری کا باعث بنی۔ جلاوطنی کا دوسرا دور انتہائی اذیت ناک تھا [۱۸]

فیض کو جیلوں میں کئی سال رکھنے کے بعد جب رہائی ملتی ہے تو دوسری مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔ فیض پر مختلف ایجنسیوں عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا' اب فیض میں وہ طاقت نہیں رہی کہ ہر مشکل وقت کا مقابلہ کر سکے چنانچہ فیض اور ایلس دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب ملک سے باہر زندگی گزاریں گے "دلِ من مسافر کا پس منظر ڈاکٹر آفتاب احمد الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> کچھ دنوں کے بعد حکومت کی مختلف ایجنسیوں نے ان پر عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کچھ مخصوص قسم کے لوگ ان کے گھر گھومنے لگے۔ وہ باہر نکلتے تو ایک جیپ ان کے پیچھے لگی رہتی، فیض اب عمر کی اس منزل میں تھے کہ ان سے اس قسم کی ناروا کاروائی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کر دیا۔ ۱۹۷۸ء میں

سردیوں کے ایک دن وہ ایلس کے ساتھ پنڈی ہمارے گھر آئے۔ چند منٹ سے زیادہ بیٹھے نہیں
کہنے لگے ہم شام کی فلائٹ سے کراچی جارہے ہیں۔ وہاں سے لندن، بس تمھیں خدا حافظ کہنے
آئے ہیں۔ اب دیکھو کب ملاقات ہوتی ہے (۱۹)

فیض احمد فیض کو بنیادی طور پر مزاحمتی شاعر تو نہیں کہہ سکتے لیکن فیض کی شاعری میں ہر جگہ مزاحمت 'للکار' احتجاج' اور انقلاب کی باتیں ملتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی جلاوطنی پر مشتمل شاعری میں بھی مزاحمت کا لہجہ موجود ہے۔ گویا فیض احمد فیض نے جلاوطنی کے بیان میں بھی رزمیہ آہنگ کو اپنایا ہے۔ جیسا کہ فیض جلاوطنی پر برہم ہو کے اس طرح گویا ہوئے:

صحرا پہ لگے پہرے اور قفل پڑے بن پر
اب شہر بدر ہو کر دیوانہ کدھر جائے (۲۰)
ہم مسافر یونہی مصروف سفر جائیں گے
بے نشان ہو گئے جب شہر تو گھر جائیں گے
دیار غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیض ذکر وطن اپنے روبرو ہی سہی (۲۱)

فیض احمد فیض کی ابتدائی نظموں میں جلاوطنی کی کیفیات نہیں ملتی 'کیونکہ ابتدا میں انہیں جلاوطنی کا کرب سہنے کو نہیں ملا' بلکہ وہ عشق مجازی میں رومانوی شاعری کررہے تھے۔ جب وہ دو مرتبہ جلاوطن ہو جاتے ہیں تو جلاوطنی کی شاعری بھی درآئی ہے۔ لہذا ان کے آخری مجموعوں میں جلاوطن شخص کے احساسات اور جذبات توانا انداز میں ابھر آئے ہیں۔ اس حوالے سے قمر رئیس فیض کے بارے میں لکھتے ہیں: "سر وادی سینا' شام شہریاراں اور مرے دل میرے مسافر کے کئی اشعار انہوں نے جلاوطنی کے دوران کہے اس لیے ان شعری مجموعوں میں جلاوطنی کا کرب نمایاں طور پر نظر آتا ہے "(۲۲)

ایک انسان کو جب کوئی دکھ یا غم ملتا ہے تو اس کو بھلانے کے لیے دو کام کرنے ہوتے ہیں یا تو اپنے ہم راز کو اپنا دکھڑا سنا دے یا تو کیتھارسس کے لیے شاعری کا سہارا لیا جائے ۔فیض نے اپنے غم 'مظلوموں کے غم اور پھر جلاوطنی کے غم کو شاعری کے ذریعے کم کرنے کی ٹھان لی اور اس کا ان کا غم بھی جاتا رہا اب فیض کی جلاوطنی کی شاعری اپنی ذات کی نہیں رہی بلکہ ہر جلاوطن شخص کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اشفاق حسین کا کہنا ہے کہ:

" کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے ہمت جواب دے گئی ہو' وہ (فیض احمد فیض) خود چونکہ امید بھرے لہجے کے شاعر تھے شاید اسی لیے ترکی کے جلاوطن شاعر ناظم حکمت کی نظم "او میرے وطن" کا اردو ترجمہ کر کے انہوں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ویسے بھی یہ نظم اُن کے حسب حال ہی نظر آتی ہے "(۲۴)

عبد اللہ حسین کا کہنا ہے کہ " جلاوطن اپنے قبیلے کی کشش سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا، چاہے وہ اپنے قبیلے سے مایوس ہی کیوں نہ ہو چکا ہو' یہاں کشش سے چھٹکارا پانے کا سوال نہیں، جلاوطن کی ساری ریاضت اور ذہنی مسافت وطن کو پُر کشش بنانے کے لیے ہوتی ہے "(۲۵)

ترکی کے جلاوطن شاعر کی ایک نظم کا ترجمہ فیض نے ہی کیا ہے ذرا ایک شعر میں دیکھئے کہ مکان کا بدلنا کتنا کٹھن مرحلہ ہے۔ کہ جہاں ایک انسان اپنی اصلی حالت کو بھی گنوا بیٹھتا ہے۔ بقول شاعر:

مری جان تجھ کو بتلاؤں' بہت بازک یہ نکتہ ہے
بدل جاتا ہے انساں' جب مکاں اس کا بدلتا ہے

ii۔ وطن میں بے وطنی کا احساس:

جلاوطنی کا اطلاق اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی کو اپنے وطن میں سانس لینے کی فرصت تک نہ دی جائے اور بقول فیض "ہوا پھر سے یہ حکم صادر' کہ وطن بدر ہوں ہم تم" جیسے بیانات سامنے آئے تو انسان جلاوطنی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی میں وطن سے کہیں دور جائے بغیر جلاوطنی کی کیفیات آ سکتی ہیں یا نہیں اس کا جواب (ہاں میں) مثبت میں دیا جا سکتا ہے۔ بہت سے شعرا ایسے ہیں جن کو جلاوطن تو نہیں کیا گیا لیکن حالات کچھ ایسے پیدا کیے گئے کہ ان شعرا کو اپنا وطن بھی دیار غیر لگنے لگا۔ نتیجے میں جلاوطنی کی کیفیات پر مبنی شاعری وجود میں آ گئی۔ اس حوالے سے کشور ناہید کے یہ اشعار قابل دید ہیں:

ہم لوگوں کو
اپنے ہی وطن میں جلاوطن کر دیا گیا ہے
کہ ہم بے روح جاندار
قصہ گویائی سے بھی منحرف ہیں (کشور ناہید)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملک میں رہتے ہوئے جلاوطنی کی شاعری کیسے ہو سکتی ہے؟ درحالانکہ فیض شناس اشفاق حسین کا کہنا ہے کہ "فیض کے ہاں جلاوطنی اور وطن بدری کا کانسپٹ پہلی بار ۱۹۷۷ـ۱۹۷۸ء میں آیا"[۲۵] اور اس حوالے سے وہ ان کی نظم مرے دم مرے مسافر کو ایگزائیل پوئٹری کا سنگ میل قرار دیتے ہیں۔اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ فیض کی شاعری میں براہ راست اور دوٹوک لفظوں میں جلاوطنی کا اظہار ایک رجحان کے طور پر مرے دل مرے مسافر میں نظر آتا ہے'لیکن اس سے قبل لکھی گئی نظموں میں جلاوطنی کے حوالے سے کئی اشعار فیض احمد فیض کہہ گئے تھے یہاں تک کہ جیل میں لکھی گئی کئی نظموں میں جلاوطنی کی کیفیات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

جن شعرا کو اپنے وطن میں جلاوطنی کی کیفیات برقرار رہی ان شعرا میں ایک نام فیض احمد فیض کا آتا ہے۔"اپنے وطن میں جلاوطنی اور کرب و تنہائی کا یہ تجربہ بڑا دوررس اور معنی خیز تھا۔ایسا لگتا تھا کہ یہ ان کے داخلی وجود میں جذب ہو کر ہمیشہ کے لئے ان کی حسیت کا ایک حصہ بن گیا"[۲۶]

فیض نے رومانوی رنگ میں اپنے عشق کا آغاز کیا اور پھر اسے عشق مقہور و مظلوم لوگوں سے ہوئے پھر ان کا عشق وطن کی طرف رخت سفر ہوا آگے جا کر ان کا عشق انسانیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔فیض احمد فیض کو دیار غیر میں بھی وطن کی یاد بہت آئی اور محبوب کی طرح وطن کو یاد کیا'اور وطن کو لیلائے وطن کے نام سے موسوم کیا۔ان کی حبسیہ شاعری میں بھی جلاوطنی کی کیفیات دیکھ سکتے ہیں جس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا ہونا اور اظہار رائے پر پابندی بھی جلاوطنی سے کچھ کم نہیں۔

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں[۲۷]

فیض کو جلاوطن نہیں کیا گیا البتہ انہوں نے خود ساختہ جلاوطنی' اپنے وقت کی آمریت سے تنگ آ کر اختیار کی۔لیکن فیض کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جلاوطن ہونے سے پہلے جلاوطنی کی کیفیات کو بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔اس کے پیچھے فیض کا سیاسی و سماجی شعور کارفرما ہے۔لہذا ایک دانشور کی طرح فیض نے جیل میں جلاوطنی کی شاعری لکھنے کی طرح ڈالی۔

ڈاکٹر محمد سفیر اعوان کا کہنا ہے کہ:

"فیض کو بھی ایک جلاوطن دانشور کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے ملک کے بارے میں لکھتے ہوئے جلاوطنی کے نقطہ نظر کو استعمال کیا اس سے قطع نظر کہ کئی دوسرے جلاوطنوں کی طرح وہ اپنے ملک میں بھی جلاوطنی ہی کی زندگی گزارتے رہے "(۲۸)

فیض احمد فیض ایک محب وطن شاعر تھے' وہ اپنے ملک سے عشق کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے رومانویت سے کسی حد تک کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے لیلائے وطن کے گیسو سنوارنے لگے۔ ان کی محبت کے لیے یہی کافی ہے کہ انہوں نے وطن کی یاد کو زندہ رکھا اور جیل کی کوٹھڑی میں بھی وطن اور وطن کے باسیوں کے لیے جدوجہد جاری رکھی' تاکہ وطن خوب سے خوب تر ہو سکے' جیل کو بھی انہوں نے جلاوطنی کی زندگی تصور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دوران جیل لکھی ہوئی اکثر نظموں میں ایک جلاوطن شخص کی سی کیفیات کو محسوس کر سکتے ہیں۔ انوار احمد کا کہنا ہے کہ:

"فیض بھی مکانی تبدیلی کی زد میں آئے، وہ قفس میں رہے اور دیار غیر میں بھی، مگر ان کی ہر سانس انہیں لیلائے وطن کا اور زیادہ شیدا بناتی چلی گئی، زندان و قفس ایک طرح سے فیض کی جلاوطنی کا نقطہ آغاز ہیں' اس لیے اُن کی حبسیہ شاعری کا بغور مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ وہ زندان میں وطن کا ذکر ایک جلاوطن کی طرح کرتے ہیں"(۲۹)

فیض جیل کی زندگی میں بھی وطن کو یاد کرتے رہے' وطن کی محبت کا دم بھرتے رہے' لیکن فیض اس تلخ حقیقت کا بھی احساس رکھتے ہیں کہ اس کے لیلائے وطن میں کوئی آزادی سے زندگی نہیں گزار سکتا' آزادی اظہار پر پابندیاں ہیں' سرعام کوڑے مارے جا رہے ہیں' تاکہ کوئی سر اُٹھا کے نہ چلے۔ ہر کوئی خوف اور دہشت کی کیفیت میں نظر آتا ہے۔ ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے فیض ان الفاظ میں اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار کر رہے ہیں:

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے (۳۰)

فیض احمد فیض کی شاعری میں انقلاب کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔انہوں نے وطن کو بہتر بنانے کی ہر ممکن سعی و کوشش جاری رکھی'جس کے لیے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا۔انقلابی ہونے کے جرم میں فیض جیلوں میں بھی کئی مرتبہ محبوس رہے۔جیل کی شاعری میں بے وطنی حوالے ان کی ایک نظم "قید تنہائی" میں بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر

خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر

کوئی نغمہ، کوئی خوشبو۔کوئی کافر صورت

عدم آبادِ جدائی میں مسافر صورت

دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام

حسن آفاق، جمال لب و رخسار کے نام (۳۱)

فیض ایک رجائی شاعر گزرے ہیں لیکن بعض اوقات ان میں قنوطیت کی طرف جھکاؤ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔یہ قنوطیت اس وقت اور زیادہ نمایاں ہو کر ابھرتی ہے جب فیض اپنے وطن سے وابستہ امیدیں پوری ہوتے نہیں دیکھتے تو لامحالہ ایک بیگانگیت کی فضا وجود میں آتی ہے۔جیسا کہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے

کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی

چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے

کہ اب سحر تری رخ پر بکھر گئی ہو گی (۳۲)

فیض کو جب پہلی مرتبہ جیل سے رہائی ملتی ہے تو فیض اس توقع سے باہر آتے ہیں کہ اب وطن کی مانگ بڑھ گئی ہو گی'وطن سے اب تاریکی اور ظلمت کا خاتمہ ہو چکا ہو گا'گویا وہ ایک جلاوطن شخص کی طرح وطن کے بارے میں'جیل سے نکلتے ہوئے پُر امید ہو کر نکلتے ہیں'لیکن جب جیل سے نکل کر وطن کی آزاد فضا میں نگاہیں دوڑنے لگتی ہیں تو وطن وہیں پر ہی نظر آتا ہے جہاں پر پہلے کھڑا تھا'کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی'البتہ وطن کی مجموعی فضا پہلے بدتر ہو چکی تھی۔

صحافی'ملازمین'پولیس'صنعت کار اور اہل قلم خاموش تھے'فیض نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے غریب عوام کی مجموعی صورتحال کو نمایاں کیا'جہاں وطن تاراج ہو رہا تھا'چمن اجڑ رہا تھا'ہر گھر میں تاریکی چھا گئی تھی'ہر کوئی خانماں خراب کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ان کیفیات کی عکاسی فیض احمد فیض نے ان الفاظ کے ساتھ کی ہیں:

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر
رہ یقین تری افشانِ خاک وخوں پہ سلام
مرے چمن ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر
ہر ایک خانہ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر، خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتہ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدہ پرنم کی آب وتاب کی خیر
رواں رہے یہ روایت، خوشا ضمانت غم (۴۳)

فیض احمد فیض پاکستان مخالف نہیں تھے یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان ٹائمز کی ادارت بخوبی سرانجام دی'البتہ فیض سرمایہ داریت اور فاشزم کے مخالف جبکہ مارکسیزم کے حامی رہے ہیں۔پاکستان کی آمریت کی نگاہیں جب فیض کمیونسٹ روپ میں دیکھ لیتی ہیں تو فیض کو آمریت کے لیے خطرہ متصور کیا جب اس چیز کو فیض نے بھانپ لیا اور جسمانی طاقتیں بھی بڑھاپے کی وجہ سے جواب دے رہی تھیں تو نہ چاہتے ہوئے فیض کو جلاوطن ہونا پڑا۔حفیظ الکبیر قریشی اپنے ایک مضمون "فیض کی شاعری میں لکھتے ہیں:

> پاکستانی سیاسی فضا کی مخصوص سازشی اور زہرناکی کی بنا پر انہیں ملک سے باہر رہنا پڑا۔لیکن وہ بھی کسی انقلاب پر رد عمل کی وجہ سے نہیں تھاملک کا ٹولہ اپنی بے بصری اور نادانی کی وجہ سے انہیں ایک خوفناک کمیونسٹ کے روپ میں دیکھتا تھا اور شاید انہیں ملک کی سلامتی اور تحفظ کے لیے خطرہ بھی سمجھتا تھا لیکن فیض کے اپنے عمل اور کردار سے ایسی کوئی بات واضح نہیں ہوتی (۴۴)

ہر نیا تجربہ ایک نئی تخلیق کا پیش خیمہ بنتی ہے۔فیض کا پہلے کسی افغان لڑکی کو دیکھ لینا سبب بنا کہ فیض رومانویت کی دنیا میں چلے گئے جب لینن 'کارل مارکس وغیرہ کا مطالعہ کیا اور پھر اپنے سماج کو دیکھا تو کہنا پڑا" تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے "جب فیض جیل جا پہنچے تو" متاع لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے "کا نعرہ لگایا لیکن جب یہی فیض

جلاوطنی کے تلخ اور کربناک تجربے کو سہہ لیتا ہے تو نتیجے میں فیض شاعری کی ایک اور دنیا بسانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔جیسا کہ جلاوطنی کے بارے میں فیض کا کہنا ہے:

> جلاوطنی بھی قید تنہائی کے مانند ایک یکسر نیا اور انوکھا تجربہ ہے۔از سر نو عشق میں مبتلا ہو جانے کے مانند یہ تجربہ بھی نئے آفاق اور نئے تخلیقی امکانات ساتھ لاتا ہے۔دنیا پھر سے نئی ہو جاتی ہے۔یوں جیسے چاندنی درختوں سے چھن چھن کر آ رہی ہو'یوں جیسے بہار چھا گئی ہو'صبا آ رہی ہو'ابتدائے شباب کی حسیات پھر سے بیدار ہو جاتی ہیں۔اور یہ تجربہ شاعری میں بھی اپنا اظہار پاتا ہے۔پھر رفتہ رفتہ یہ بھی ایک پیش افتادہ بات بن کر رہ جاتا ہے۔اور تھکن اور اکتاہٹ دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے[۳۵]

iii۔فیض کی جلاوطنی پر مشتمل شاعری میں نئے میلانات:

فیض احمد فیض نے اپنی جلاوطنی کا ایک معتدبہ حصہ بیروت میں گزارے۔جہاں انہوں نے "لوٹس کی ادرات بھی کی اور بڑے بڑے عرب شعراسے ملاقاتیں ہوئیں۔اور خاص کر محمود درویش سے گہری دوستی بھی تھی۔فیض فلسطین کو دوسرا گھر سمجھتے تھے'وہ فلسطینیوں کے حق خودارادیت اور آزادی ریاست سے طرفدار تھے۔فلسطین کی تحریک آزادی میں انہوں نے حصہ ڈالا۔فلسطین پر کئی نظمیں فیض نے لکھیں۔ان کا ایک پورا مجموعہ "سر وادی سینا"فلسطین پر مشتمل شاعری ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر محمد سفیر اعوان کا کہنا ہے:

> فیض نے مسئلہ فلسطین پر کئی نظمیں لکھیں جن میں ''فلسطینی بچے کے لیے لوری'' اور ''فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے '' وہ نظمیں ہیں جو انہوں نے جنرل ضیا الحق کے فوجی دور حکومت میں بیروت میں جلاوطنی (۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء) کے دوران لکھیں۔جہاں وہ فلسطینی مزاحمتی قائدین سے ملے جو فلسطین علاقوں پر اسرائیلی قبضے کی وجہ سے وہاں پر جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ان میں سے آخر الذکر نظم کو ان کی ''پاکستان سے اپنی جلاوطنی کے فصیح اظہار کے طور پر پڑھا جاسکتا ہے۔[۳۶]

ضیاء الحق کے مارشل لاء کے فوری بعد فیض دلی اور لندن سے ہوتے ہوئے بیروت پہنچے "لندن میں دوستوں اور عقیدت مندوں'مداحوں اور پرستاروں کی کمی نہ تھی لیکن بیروت میں کسی ہم زبان اور ہم نفس سے کبھی کبھار ہی غیر متوقع سامنا ہوتا تھا"[۳۷] بیروت میں انہوں نے "لوٹس" کی ادرات کا قلمدان سنبھالا۔فیض صاحب کو فلسطینیوں سے

شدید محبت تھی یہی وجہ ہے کہ فیض نے بیروت کو خیر آباد نہیں کہا بلکہ فلسطینیوں کے حق میں اپنے حصے کی جدوجہد میں مصروف عمل رہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا فیض کو شدت سے وطن کی یاد ستانے لگی اس ضمن میں آغا ناصر کا کہنا ہے:

> انہیں اپنا گھر، اپنے بچے، اپنے دوستوں کی محفلیں، شہر کی گلیاں اور بازار یاد آتے تھے تو ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ ملک سے آنے والی ہر خبر ان کے لیے دکھ اور تکلیف کے پیغام کے سوا کچھ نہیں لائی تھی۔ ضیاء الحق کی مارشل لاء میں عوام پر ڈھائے جانے والے جور وستم، بھٹو کی سزائے موت، فیض صاحب کے بعض شاعر اور ادیب دوستوں کا بزدلانہ رویہ۔ یہی کچھ ان دنوں ان کی شاعری کے موضوع تھے۔ وہ عالم تذبذب میں تھے۔ کچھ سے پوچھتے تھے "کیا کریں"(۳۸)

فیض جلاوطنی کے ایام میں وطن کی ابتر کیفیات کی تصویر کشی الفاظ میں کر رہے ہیں:

جو میری تیری رات کے
ستارے زخم زخم ہیں
جو میری تیری صبح کے
گلاب چاک چاک ہیں
یہ زخم سارے بے دوا
یہ چاک سارے بے رفو
کسی میں راکھ چاند کی
کسی پہ اوس کا لہو
یہ ہے بھی یا نہیں' بتا
یہ ہے کہ محض جال ہے
مرے تمہارے عنکبوت وہم کا بنا ہوا
جو ہے تو اس کا کیا کریں
نہیں ہے تو بھی کیا کریں
بتا بتا

بتا بتا[۳۹]

بیروت قیام کے دوران فیض نے مزاحمت میں مجاہدین کا ساتھ دیا۔ اور بیروت میں قیام کے دوران ان کے ذہن و فکر پر فلسطین سوار رہا۔ فلسطین کے لیے اپنے ذہن و فکر میں احترام کا جذبہ پیدا کیا اور پھر فلسطین سے اپنے آپ کو ایسا وابستہ کیا کہ وہ خود فلسطینی جیسے بن گیا اور فلسطین ان کا وطن ٹھہرا یہی وجہ ہے کہ ان کا موضوع سخن بھی فلسطین ہی رہا۔ اشفاق حسین کا کہنا ہے:

> " جلاوطنی کے علاوہ فیض صاحب کے آخری سات برسوں کا اہم ترین موضوع فلسطین رہا ہے۔ ویسے اس موضوع پر ان کی خوبصورت نظم ۱۹۶۷ء میں "سر وادی سینا" کے عنوان سے لکھی جا چکی تھی بلکہ ان کے پانچویں مجموعے کا نام بھی اسی نظم کے عنوان سے لیا گیا ہے "[۴۰]

فیض احمد فیض کی شاعری میں جتنی میٹھاس اور رس ہے اسی طرح ان کی شخصیت بھی بڑی جاذب تھی۔ فیض کا شمار ان شعرا میں نہیں جو درباری ہو' ان کا شمار ان شعرا میں نہیں جن میں منافقانہ اور مفاہمانہ رویہ ہو بلکہ فیض اس قدر عظیم شاعر ہے کہ ان کی انقلابی شاعری میں بھی ادبیت کا رس گھول رہا ہے' احترام کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نغمگی' جمال اور رومانوی فضا کو بھی برقرار رکھنے میں کمال کا ہنر دکھایا ہے۔ فیض کی شاعری میں کئی رنگ دیکھ سکتے ہیں ان رنگوں میں سے ایک اہم رنگ دیار غیر میں فلسطینیوں کے غم میں برابر کے شریک ہو کر اپنے کو فلسطینی کہلوانے میں نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے اشفاق حسین کا کہنا ہے:

> بیروت کے قیام نے فیض صاحب کو فلسطین کی جدوجہد کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ انہوں نے کہا تھا شاعری مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی ہے اچھی اور بڑی شاعری کے تین دائرے ہوتے ہیں۔ پہلا دائرہ اپنی ذات کا ہوتا ہے۔ دوسرا اس کی قوم اور معاشرے کا اور تیسرا دائرہ ہم عصر انسانی برادری یعنی ساری دنیا کا ہے۔ فیض صاحب کی شاعری اسی پہلے اور دوسرے دائرے سے ہوتی ہوئی فلسطین اور اس کے حوالے سے تیسرے دائرے یعنی ہم عصر انسانی برادری کے دائرے میں داخل ہوتی ہے[۴۱]

فیض انسانیت کا شاعر ہیں ان کے دل میں انسانیت کے لیے درد ہے' یہی وجہ ہے کہ جب فیض بیروت میں رہے تو بے گناہ فلسطینیوں پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو فیض کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔

راستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے

اشک کرتے رہے او چپ چاپ آنسو بہاتے رہے
لوٹ کر آ کے دیکھا تو پھولوں کا رنگ
جو کبھی سرخ تھا' زرد ہی زرد ہے
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے (۴۲)

فیض جب تک بیروت میں رہے فلسطین کے اوپر لکھتے ہیں' ان کا موضوع سخن ہی فلسطین بنا رہا۔ چھ کے قریب نظمیں خاص کر فلسطین کے گرد گھومتی ہیں۔ ہر نظم کی اپنی جگہ ایک انفرادیت ہے،۔ فیض نے کبھی مجاہدین کا حوصلہ بڑھایا' کبھی بچے کو لوریاں دیں۔ کبھی فلسطین کے شہید ہونے والوں کے پرچم کو موضوع سخن بنایا' یوں فیض کی شاعری فلسطین کے خول سے باہر نہیں آ سکی' کیونکہ فیض کا عشق' رومان و وطن سے ہوتا ہوا فلسطین تک جا پہنچا تھا۔

بیروت پہنچ کر فلسطینیوں کی مظلومیت دیکھی اور قومی درد کے حامل فیض نے فلسطین سے گہری وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے فلسطین کو اپنا دوسرا گھر (وطن) فرض کیا۔ اور فلسطینیوں کے حق میں شاعری بھی کی اور عملی میدان میں بھی فلسطینیوں کا ساتھ دیا اس بارے میں خود فیض کا کہنا ہے کہ:

"مجھے بیروت میں پناہ ملی' رسالہ لوٹس" کے ادارتی دفاتر وہیں پر تھے۔ اس لیے جہاں تک میرا تعلق ہے' دوسرا دائرہ میرے اپنے لوگوں کی بجائے لبنانی اور فلسطینی بنا رہے تھے وہ لوگ جن کے درمیان میں زندگی بسر کر رہا تھا اور جن کی زندگیوں میں حصہ دار تھا میرے قیام کے سارے عرصے میں یہ لوگ بیرون ملک سے اسرائیلی تشدد کا اور اندرون ملک اسرائیل کے حلیفوں کا بار بار نشانہ بنتے رہے۔ سڑکوں پر ہونے والی لڑائیوں اور قتل و غارت گری کے واقعات کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں ان سب سے گزرتا رہا۔ بیروت کے رہنے والوں کے مصائب اور غم و اندوہ میں شریک رہا یہاں تک کہ ان کی اور میری زندگی ایک ہو گئی" (۴۳)

فیض بیروت میں یوں تو ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ بیٹھے تھے' لیکن وطن سے دور ہونے کی وجہ سے فیض بے چینی کے عالم میں تھے اور اس دوران وہ ماتمی بن کر گویا ہوئے۔

نہ کوئی جادہ نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو

اب دماغ سفر نہیں ہے

یہ وقت زنجیر روز و شب کی

کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے

یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے (۴۴)

فیض احمد فیض کی زندگی کے آخری ایام کی شاعری جلاوطنی کی شاعری پر مشتمل ہے ان جلاوطنی کی شاعری میں ان کا ایک اہم موضوع فلسطین اور اس کا غم رہا۔ "فیض شخصیت اور شاعری" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں اکرام بریلوی لکھتے ہیں کہ:

> فیض نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اپنی 'لیلائے وطن' میں جمہوریت کا گلا گھونٹ کر آمریت کے پاؤں جمانے کا المناک منظر دیکھ لیا تھا۔ اور انہیں حالات کے پیش نظر جلاوطنی اختیار کی۔ ہر چند کہ انہیں کسی مارشل لاء کی عدالت سے یہ راہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ خود اختیار کردہ جلاوطنی اور بیروت کے قیام کے دوران ان کا اہم ترین موضوع فلسطین رہا(۴۵)

یوں فیض احمد فیض کی شاعری میں جلاوطنی کے انفرادی حوالے ملتے ہیں وہاں فیض کی شاعری میں فلسطینیوں کی جلاوطنی کے اجتماعی تجربے کی عکاسی بھی برابر ملتی ہیں۔ ان دونوں کیفیتوں نے مل کر اردو شاعری کو ایگزائل پوئٹری کا ایک نیا رخ اور رنگ دیا' جس کا سہرا فیض کو جاتا ہے بقول اشفاق حسین "فیض کی انفرادی وطن بدری کے استعارے نے فلسطینیوں کی اجتماعی وطن بدری کے استعارے سے مل کر اردو میں لکھی جانے والی ایگزائل پوئٹری کا ایک بہت حسین اور دلکش باب رقم کیا ہے"(۴۶)

فیض احمد فیض کی جلاوطنی کی شاعری میں "دل من دل مسافر" کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس نظم میں جلاوطنی کیوں اختیار کرنی پڑی' اور پھر جلاوطنی میں کیا کیا ذہنی کوفت ہوتی ہے کس طرح انسان خود کلامی پر اتر آتا ہے ان تمام چیزوں کے بیان کے ساتھ فیض اس بات کو قارئین تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جلاوطنی صرف ملک بدری کا نام نہیں بلکہ یہ ایک موت ہے جس میں انسان ہمیشہ احتضار کی کیفیت میں رہتا ہے اور یہ ایک کٹھن مرحلہ ہے لہذا انسان نفسیاتی طور پر اپنے کو موت کے منہ میں دیکھتا ہے اور ایک کرب' تکلیف اور غم کی کیفیت میں زندگی بسر کرتا ہے' جس انسان سے جلاوطنی کی وجہ سے دوست احباب' معاشرہ' گھربار' عزیز و اقارب' جغرافیہ' مکان اور ماحول

چھین جائیں تو یقیناً ایسے انسان کی بے وقت موت آتی ہے اور یہ موت بار بار آتی ہے' یہ موت ایسی موت ہے جس کا آغاز اور اختتام احتضار کی کیفیت میں رہنا ہے۔فیض کی بھی یہی کیفیت رہی' جنہیں آمریت نے جلاوطنی پر مجبور کر دیا' تو وطن سے بے پناہ محبت والفت کی وجہ سے فیض وطن سے دوری کو برداشت نہیں کر سکے ہر کسی سے وطن کے بارے استفسار کرتے وطن کی خیریت دریافت کرتے جب آمریت کے غلبہ کی بات سنتے اور مقہور و مظلوم کے استحصال کی خبریں ملتیں تو فیض اور بھی شدت غم سے نڈھال ہو جاتے اپنی تسکین کے لیے فیض نے شاعری کا سہارا لیا اور دل من دل مسافر جیسی مشہور زمانہ نظم کی تخلیق کی۔

مرے دل' مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا(۴۷)

فیض احمد فیض پر ایجنسیوں کی طرف سے کاروائیاں جب حد تجاوز کر گئیں تو فیض کا جینا مشکل ہو گیا' ان حالات کے تناظر میں فیض نے جلاوطن ہونے کا فیصلہ کیا' براہ راست اس میں آمریت کا ہاتھ نہیں تھا لیکن اس جلاوطنی کی بنیادی محرک آمریت ہے' جس کے پیچھے وردی کار فرما نظر آتی ہے۔مذکورہ اشعار میں "مرے دل مرے مسافر" "ہوا پھر سے یہ حکم صادر" پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فیض نے آمریت سے تنگ آ کر جلاوطنی اختیار کی لہذا فیض کی جلاوطنی میں بالواسطہ آمریت کار فرما ہے۔

سر کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا

کبھی اس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شب غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا(۴۸)

ان اشعار کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر فیض بخوشی جلاوطن ہو چکے ہوتے تو وطن کو یاد کر کے آہ فغاں بلند نہیں کرتے'فیض کو اپنے ملک میں آزادی سے رہنا نصیب نہ ہوا'ملک کے باسیوں پر جبر کی فضا کو مشاہدہ کرتے رہے'اور جلاوطنی میں بھی مظلوم و مقہور عوام کی مظلومیت پر آنسو بہاتے رہے'یہی وجہ ہے کہ فیض جلاوطنی کو موت سے تشبیہ دے رہے ہیں'لہذا جلاوطنی اختیاری نہیں تھی'اس کے پیچھے جبر کی طاقتیں کار فرما تھیں'اجنبیت کی انتہا کو فیض کی جلاوطنی میں ملاحظہ کرتے ہیں تو بے اختیار کہہ دیا کہ جلاوطنی صرف جسمانی طور پر انتقال کا نام نہیں یہ ایک موت ہے'جو بار بار انسان فیض کو آتی رہی۔

فیض لندن کو خیر آباد کہہ کر دوبارہ پاکستان آئے تو ترقی پسند تحریک از سر نو منظم کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں لیکن ان تدابیر کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا جمہوریت کا جنازہ اٹھنے لگا آمریت کو تقویت ملنے لگی'ذوالفقار بھٹو جیسے عظیم لیڈر کو تختہ دار پر لٹکایا گیا ان حالات کو دیکھ کر فیض گویا ہوئے:

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم (دل من مسافر من)

فیض عمر بھر ظالم حکمرانوں کی نفی سے اللہ کی ذات سے محبت کے سیاسی اور روحانی مسلک پر قائم رہے۔اور یہی ثابت قدمی فیض کی اسیری اور پردیس میں دربدری کا باعث بنی۔جلاوطنی کا دوسرا دور انتہائی اذیت ناک تھا(۴۹)

فیض کو جیلوں میں کئی سال رکھنے کے بعد جب رہائی ملتی ہے تو دوسری مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔فیض پر مختلف ایجنسیوں عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا'اب فیض میں وہ طاقت نہیں رہی کہ ہر مشکل وقت کا مقابلہ

کر سکے' چنانچہ فیض اورایلس دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب ملک سے باہر زندگی گزاریں گے "دلِ من مسافر کا پس منظر ڈاکٹر آفتاب احمد الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

کچھ دنوں کے بعد حکومت کی مختلف ایجینسیوں نے ان پر عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کچھ مخصوص قسم کے لوگ ان کے گھر گھومنے لگے۔ وہ باہر نکلتے تو ایک جیپ ان کے پیچھے لگی رہتی، فیض اب عمر کی اس منزل میں تھے کہ ان سے اس قسم کی ناروا کاروائی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کر دیا۔ ۱۹۷۸ء میں سردیوں کے ایک دن وہ ایلس کے ساتھ پنڈی ہمارے گھر آئے۔ چند منٹ سے زیادہ بیٹھے نہیں کہنے لگے ہم شام کی فلائٹ سے کراچی جارہے ہیں۔ وہاں سے لندن، بس تمھیں خداحافظ کہنے آئے ہیں۔ اب دیکھو کب ملاقات ہوتی ہے[۵۰]

فیض احمد فیض کے شعری مجموعوں میں ایک مجموعہ "مرے دل مرے مسافر" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجموعے میں جلاوطنی کی شاعری زیادہ نمایاں ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جانہ ہو گا یہ مجموعہ جلاوطنی پر مشتمل ہے' یہ سراپا ایگزائیل پوئٹری ہے۔ اس مجموعے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فیض ناظم حکمت 'نرودا اور محمود درودیش جیسے شاعروں سے متاثر ہوئے اوران کی صف میں اپنے آپ کو شامل کر کے جلاوطن شخص کی مکمل ڈائری شعری صورت میں اردو ادب کے حوالے کیا۔ افتخار عارف کا کہنا ہے کہ: میں سمجھتا ہوں جلاوطنی کی زندگی میں جتنی نظمیں انہوں نے لکھی ان میں یہ نظم "دل من دل مسافر" سب سے مقبول اور سب سے زیادہ دلوں میں گھر کرنے والی نظم ہے"[۵۱] فتح محمد ملک کا کہنا ہے :

" میں فیض احمد فیض جہاں خود کرب میں رہے وہاں اپنے وطن کی فکر کو بھی نہیں بھولے" فیض کو شب ہجر کے سخت ترین مرحلوں سے قید وبند اور جلاوطنی کے زمانے میں گزرنا پڑا۔ مگر اس عالم میں بھی انہیں ہمیشہ اپنے جسم وجاں کی سلامتی سے کہیں زیادہ پاکستان کی سلامتی کی فکر دامن گیر رہی ہے "[۵۲]

فیض احمد فیض وطن کو "چمن" سے ملاتے ہوئے کہتے ہیں کہ گل چیں کی غارت سے چمن کی حالت کچھ غیر ہو گئی ہے' آج نہیں معلوم کیاواقعہ پیش آیا' جیل سے صبا بھی بے قرار گزری ہے۔

چمن پہ غارت گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

جلاوطنی کے زمانے میں بھی وطن کو نہیں بھولے اور وطن سے جسمانی لحاظ سے ضرور دوری پہ تھے لیکن دل پاکستان کے لئے دھڑک رہا تھااور ہر آن پاکستانیوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔تنہائی میں پاکستان کو یاد کیا'اسے آنکھوں کا سرمہ بنائے رکھا'اوراس کا احترام شائستہ انداز میں بجالاتے رہے اور ساتھ ہی فیض اہل وطن پر ڈھائے جانے والے مظالم کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں جہاں اسے موت سروں پر منڈلاتی نظر آتی ہے جیسا کہ فیض گویا ہوئے ہیں:

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے

کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں

آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دست صبا کو

ڈالی ہیں کبھی گردن مہتاب میں باہیں

اے صبا شاید ترے ہمراہ یہ خوفناک شام

سر جھکائے جا رہی ہے شہر یاراں کی طرف

شہر یاراں جس میں اس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت

شیر دل بانکوں میں اپنے تیر ونشتر کے ہدف (۵۳)

فیض دوسری جلاوطنی میں یوں تو بیروت میں رہے لیکن خیال وطن کی طرف رہا۔

خیال سوئے وطن رواں ہے

سمندروں کی ایال تھامے

ہزار وہم وگماں سنبھالے

کئی طرح کے سوال تھامے (۵۴)

سلیمہ ہاشمی اپنے ایک مقالہ "میرے ابو" میں رقمطراز ہیں:

میرے خیال میں فیض نے کبھی یہ نہیں سوچا ہو گا کی فرض کی محبت کہاں ختم ہوئی اور وطن کی شروع ہوئی اور وطن کی کہاں ختم ہوئی تو بنی نوع انسان کی شروع ہو گئی۔ایک تو فیض کے وطن صرف پاکستان یا برصغیر نہیں تھا (۵۵) جب یہ کہا کہ

میں جہاں پر بھی گیا ارض وطن

تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے

دور پردیس کی بے مہر گزر گاہوں میں
اجنبی شہر کی بے نام ونشاں راہوں میں
جس زمین پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطین کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطین برباد
میرے زخموں نے کئے کتنے فلسطین آباد

فیض احمد فیض کا عشق بھی مختلف اور متعدد رہا' عشق مجازی کبھی غالب رہا تو کبھی لیلائے وطن سے تو کبھی فلسطین سے آگے بڑھتا ہوا عشق افریقہ تک پہنچ گیا' یعنی ان کے عشق کا خلاصہ کیا جائے تو ان کا عشق انسانیت سے تھا۔"تو پھر فلسطین بھی وطن ہو گیا۔ اور جب کہا کہ "میں افریقہ ہوں' دھار لیا میں نے تیرا روپ "تو افریقہ بھی وطن ہو گیا۔

فیض احمد فیض کی شاعری کو سمجھنے کے لیے فیض کی سوانح عمری کو مد نظر رکھنے کی ضرورت ہے فیض کی زندگی فیض کی شاعری کی تشریح و تعبیر میں مد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ فیض نے شاعری کے کئی مراحل اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ طے کیے ہیں۔ فیض کا سفر رومانویت سے ہوتا ہوا اشتراکیت پسندیت سے ترقی پاتا ہوا لیلائے وطن اور پھر لیلائے وطن سے ملن کے ساتھ ارض فلسطین کے داغ کو سینے میں لیے افریقا کو بیدار کرنے تک جاری وساری رہا اور پھر پوری انسانیت کے لیے دکھ' درد اپنے جگر میں لے کر "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں کا مصداق قرار پایا۔ اشفاق حسین کا کہنا ہے:

> "فیض نے لیلائے وطن کی یاد کو دل سے کبھی فراموش نہیں کیا۔ یہ جو محبت کی ایک چنگاری اُن کے دل میں ہمیشہ سے "دوسرے عشق" نے لگا رکھی تھی کبھی اس کی آنچ میں کمی نہیں آئی۔ وطن بدری کے دنوں میں انہوں نے جس جس طرح اپنے دیس اور اس کے مہرباں حوالوں کو شاعری میں سمویا ہے' وہ تو" پہلے عشق "سے بھی بازی لے گیا۔" تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیئے اے ارض وطن "جیسے مصرعہ سے شروع ہونے والی نظم اس مٹھاس بھرے محبوبانہ لہجہ میں ختم ہوتی ہے "(۵٦)

ہم تو مجبور وفا ہیں مگر اے جان جہاں
اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے

تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہمان ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا(۵۷)

فیض نے اپنی جلاوطنی کے دوران وطن کو جہاں یاد کیا اور لیلائے وطن کہہ گئے اسی طرح فیض کو اپنے وطن کی گلیاں بھی یاد آنے لگیں۔

تیرے کوچے میں بادشاہی کی
جب سے نکلے گداگری کی
جو گزرتے تھے داغ پر صدمے
اب وہی کیفیت سبھی کی ہے(۵۸)

ایک اور نظم ''سوچنے دو'' جو انہوں نے ۱۹۶۷ء میں ماسکو میں کہی، فیض نے کسی بھی ملک سے وابستہ نہ ہونے اور اپنی بنیاد سے کٹ جانے پر جذبات کو بیان کیا:

ہم سے اس دیس کا تم نام ونشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد آئے تو محبوب گزشتہ کی طرح
روبرو آنے سے جی گھبرائے(۵۹)

فیض کی جلاوطنی کی شاعری کرب اس قدر شدید ہے کہ شاعر خود کلامی پر اتر آتے ہیں۔ خود کلامی پر شاعر کیوں نہ اتر آئے' محرم راز دیار غیر میں کوئی نہیں تو فیض خود سے ہم کلام ہوئے' ہر ہر منزل پر فیض کو وطن کی یاد ستانے لگی' ہر سامنے آنے والی مسافرت کی منزل کو گھر سمجھنا شروع کیا۔ یوں فیض 'جناب فیض سے ہمکلام بھی ہوتے رہے۔ یہ خود کلامی انسان تب کرتا ہے جب اس کا دکھ یا کرب بڑا ہوتا ہے' یا انسان میں دیوانگی غالب آجائے تو خود کلامی کرتا ہے' یوں فیض کو وطن سے جدائی کا دکھ بھی تھا اور وطن سے دیوانگی کی حد تک چاہت بھی' تو نتیجے میں فیض نے خود کلامی سے اپنے دل و ذہن کو سکون دینے کی کوشش کی۔ جیسا کہ فیض کا کہنا ہے:

دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیض ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی(۶۰)
ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا

بہلایا ہے ہر گام بہت در بدری نے (۶۰)

چنانچہ غربت میں خیال وطن پیچ در پیچ سوالوں سے بندھا ہوا'مسافر کا زادِراہ بنتا ہے اور عجیب مرکب جذباتی اور حسی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔

فیض نہ ہم یوسف 'نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا'کنعان میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے (۶۱)

دل شکنی بھی'دل داری بھی
یاد وطن کچھ اس سے زیادہ
ہم مسافر یونہی مصروف سفر جائیں گے
بے نشاں ہو گئے جب شہر تو گھر جائیں گے
صحرا پہ لگے پہرے اور قفل پڑے بن پر
اب شہر بدر ہو کر دیوانہ کدھر جائے (۶۲)

ان اشعار میں فیض نے سادہ پیرایہ اظہار اپناتے ہوئے تلمیحات جیسے یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے اسمائے گرامی کا استعمال کیا۔فیض کا کہنا ہے کہ ہم نہ یوسف ہے جس کا یعقوب انتظار کرے اور نہ ہم کوئی یوسف ہے جو یعقوب کا انتظار کرے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم کنعان میں رہے یا مصر میں جا آباد ہو جائے'لیکن حقیقت یہ ہے کہ فیض وہ یعقوب ہے جو اپنے وطن یوسف کے لیے تڑپتے رہے'جب وطن یعنی کنعان میں تھا تو بھی وطن کا دکھ درد سہتے رہے اور جب مصر یعنی جلاوطنی کی زندگی گزارنی شروع کی تو بھی وطن کی طرف نگاہ رہی۔یوں وطن کی یاد میں فیض زندہ رہے۔"جب تاریخ، جغرافیہ، سیاست، معیشت، تہذیب، ثقافت، زمین اور زمانہ یعنی وطن کی شناخت کا حوالہ گم ہوا تب لوگوں پر کھلا کہ جلاوطن تو وطن کی آس میں زندہ رہتا ہے"(۶۳)

فیض احمد فیض کی زیادہ تر شاعری طبع زاد شاعری ہے اس کے لیے انہوں نے کلاسیکی علائم واستعارات کا سہارا لیا اور نئے معانی ان کو پہنائے ہیں گویا ان کو فیض نے ایک نئی حیات بخشی'یہ فیض کی تخلیقی فیاضی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔طبع زاد شاعری کے ساتھ ساتھ فیض نے نثر اور تنقید میں اپنا لوہا منوایا وہاں فیض نے ادبیات عالم کے کئی شعری ترجمے بھی کیے ہیں ان میں سے ایک مشہور نظم میں فیض ایک عام جلاوطن ہونے والے شخص کی کیا حالت ہوتی ہے اس کی عکاسی اس نظم میں دیکھ سکتے ہیں یہ ایک آسان نظم ہے اس میں علائم واستعارات کا استعمال نہیں ہے سیدھے سادھے

الفاظ میں فیض جلاوطنی کے دکھ کو ان الفاظ میں بیان کر رہے ہیں کہ وطن سے جو ٹوپی میں پہن آیا تھا وہ ٹوپی نہیں رہی' وطن کی جوتی پھٹی پرانی ہو چکی ہے' وطن سے سلائے کپڑے تار تار ہو چکے' صرف میرے پاس جھریاں رسیدہ چہرے اور ایک ٹوٹا ہوا دل بچا ہے۔

او میرے وطن' او میرے وطن' او میرے وطن
مرے سر پر وہ ٹوپی نہ رہی
جو تیرے دیس سے لایا تھا
پاؤں میں وہ اب جوتے بھی نہیں
واقف تھے جو تیری راہوں سے
میرا آخری کرتا چاک ہوا
تیرے شہر میں جو سلوایا تھا
اب تیری جھلک
بس اڑتی ہوئی رنگت ہے میرے بالوں کی
یا جھریاں میرے ماتھے پر
یا میرا ٹوٹا ہوا دل ہے
وا میرے وطن' وا میرے وطن' وا میرے وطن[۶۴]

اس میں جلاوطن شاعر نے 'او میرے وطن' سے بات شروع کر کے عجیب کرب آمیز طریقے سے 'وا میرے وطن' پر بات ختم کی اور گلہ کیا تھا کہ[۶۵]

فیض طویل جلاوطنی کاٹنے کے بعد وطن واپس ہوئے تو بھی آمریت کا بھیانک سایہ ختم نہیں ہوا تھا۔ فیض کو ہر جگہ ویران نظر آئی' کوئی درماں نہیں' دل ٹوٹا' سینہ چاک ہوا' لیکن آمریت کا حصار نہیں ٹوٹا۔ ہر طرح سے آمریت نے پنجے مضبوط کیے کوئی مداوا کرتے دکھائی نہیں دیا تو فیض بے ساختہ کہہ اٹھے:

بے بسی کا کوئی درماں نہیں کرنے دیتے
اب تو ویرانہ بھی ویراں نہیں کرنے دیتے
دل کو صد لخت کیا' سینے کو صد پارہ کیا

اور ہمیں چاک گریباں نہیں کرنے دیتے
ان کو اسلام کے لٹ جانے کا ڈر اتنا ہے
اب وہ کافر کو مسلماں نہیں کرنے دیتے(۶۶)

فیض کی زندگی درد کا استعارہ ہے۔ پہلے پہل زندگی انہوں نے عشق مجازی میں ناکامی کے دکھ درد سہے' یوں غم جاناں سے غم روزگار تک کا سفر طے کیا' غم روزگار کے خلاف آواز اٹھائی تو آمریت اس کے پیچھے پڑ گئی اور جیل کے مصائب ڈھا دیئے' اسی پر اکتفا نہیں کیا' فیض کو جلاوطن ہونے پر بھی مجبور کیا' لیکن فیض ناامید نہیں ہوئے اسے اپنے اہداف پر یقین تھا' وہ اصول سے ہٹنے والے نہیں تھے' وہ متعهد شاعر تھے' یہی وجہ ہے وہ امید دلاتے رہے لاتے اور ظالموں کے خاتمہ کی پیش گوئی بھی کرتے رہے۔

آخر کو سرفراز ہوا کرتے ہیں احرار
آخر کو گرا کرتی ہے ہر جور کی تعمیر
ہر دور میں سر ہوتے ہیں قصر جم و دارا
ہر عہد میں دیوار ستم ہوتی ہے تسخیر
ہر دور میں ملعون شقاوت ہے شمر کی
ہر عہد میں مسعود ہے قربانی شبیر(۶۷)

پاکستان کی سیاسی عدم استحکام' متشددانہ طرز حکومت اور مارشل لاء کی وجہ سے پاکستان کی اچھی تصویر دنیا کے سامنے نہیں آئی بلکہ کا امیج خراب ہوا اس کا نوحہ جلاوطن شاعر فیض ان الفاظ میں پڑھ رہے ہیں:

میں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے
تری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے
تیری الفت، تری یادوں کی کسک ساتھ گئی(۶۸)

فیض کی شاعری میں بے گھری:

فیض کی شاعری میں جلاوطنی کے ساتھ ساتھ اس سے ملتے جلتے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع بے گھری ہے۔ گھر آرام و سکون اور چین سے زندگی کرنے کا نام ہے محمود درویش کے مطابق گھر ماں کے ہاتھ کی بنی روٹی

کھانے 'کافی پینے اور جب مر جائے تو پاؤں پھیلا کے سونے کا نام ہے۔ فیض کی زندگی بے گھری سے عبارت رہی یہی وجہ ہے ان شاعری میں بے گھری کے موضوع بڑے جاذب انداز میں درآیا ہے۔ ڈاکٹر انا سوردا اپنے ایک مضمون فیض اور جدید اردو شاعری میں بے گھری "کا موضوع میں لکھتے ہیں کہ:

بیسویں صدی میں جو شعرا کبھی سیاسی اور کبھی انفرادی وجہ سے مغرب میں جلاوطن ہو گئے۔ انہوں نے بے گھری کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جلاوطنی اور بے گھری کے موضوعات ہمارے عہد کی انسانیت کی عالمگیر قدروں میں شامل ہیں اوران کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ اس اعتبار سے جدید اردو شاعری عالمی ادب کے ایک اہم رجحان کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے[۶۹] اپنی ایک " نظم مرے دل مرے مسافر" میں فیض لکھتے ہیں:

دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائے
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا[۷۰]

"مرے دل مرے مسافر: ایک پر آشوب عہد کی شاعری" میں پروفیسر سحر انصاری لکھتے ہیں:

جلاوطنی کا تجربہ بجائے خود دل و دماغ کے لیے ایک تخلیقی محرک بن سکتا ہے اس سے قبل فیض نے جب غیر ممالک میں مختصر قیام کیے تو وہاں کی اپنی مرضی اور سیر و سیاحت یا کسی دعوت کا نتیجہ تھا۔ لیکن اس بار انہیں اس کیفیت سے گزرنا پڑا "اس نظم کا تاثر بہت گہرا ہے کیونکہ جب یہ منزل آجائے کہ ہر اجنبی سے اپنے گھر کا پتہ پوچھنا پڑ جائے اور ناشناسوں سے دن رات گزارنے کے لیے ضرورتاً مکالمہ کرنا پڑ جائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا آفت ہو سکتی ہے۔ اور یہ بار بار کی بے وطنی اور دیار غیر میں زندگی بسر کرنے کا عذاب ایک بار ہی ہوتا تو برداشت کر لیتے یہاں فیض نے مصحفی اور غالب سے استفادہ کرتے ہوئے نظم یوں ختم کی ہے "[۷۱]

ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

شاعر اور اس کا دل دونوں گھر لوٹنے کے لیے بے چین وبے قرار ہیں۔گھر تحفظ دیتا ہے اور میں آرام وسکون نصیب ہوتا ہے۔شاعر جب جلاوطن ہو جاتا ہے تو اسے اپنے وطن کی یاد بہت آتی ہے وطن سے جب وہ جلاوطن ہوتا ہے تو اپنے آبائی گھر سے بھی بے گھر ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بشمول فیض اردو کے شعرا نے جلاوطنی کے بیان کے لیے "بے گھری" اور "غربت" جیسے الفاظ کا سہارا لیا۔اس حوالے سے ڈاکٹر اناسوردا اپنے ایک مضمون "فیض اور جدید اردو شاعری میں بے گھری" کا موضوع" میں لکھتے ہیں:

فیض کی شاعری اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی مسائل کا اظہار کرتی ہے۔فیض کی غزل اس اعتبار سے نئی غزل ہے کہ انہوں نے اردو غزل میں روایتی لفظیات اور استعارات کو عصری مسائل سے آشنا کیا۔مثلاً فیض نے گھر "اور غربت" کے روایتی موضوع کو تازہ کیا اور اس طرح انہوں نے وطن سے دوری اور سیاسی جلاوطنی کا نیا موضوع پیدا کیا"[۷۳]

جیسا کہ فیض نے بے گھری اور غربت یعنی عالم مسافرت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

شرح فراق' مدح لب مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں
یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دل رُبا کے نام پہ خالی سبو کریں[۷۴]

اردو غزل میں گھر "اور غربت" کے الفاظ کبھی علامت اور کبھی استعارے کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔عام طور پر گھر "تحفظ کی علامت ہے "غربت" یا صحرا و بیاباں "گھر کے میر اور غالب کے یہاں یہ مضمون زیادہ پیچیدہ اور معنی سے لبریز ہے۔جدید اردو شاعری میں گھر "اور غربت جیسے الفاظ کا روایتی تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور غربت "کی جگہ یہی بے گھری" کبھی کبھی سیاسی جلاوطنی کی علامت بن جاتی ہے۔اس غربت "میں شاعر کی اجنبیت اور تنہائی کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے لیے گھر اور وطن کی یاد دل کے درد کا مرہم بن جاتی ہے[۷۵]

دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیض ذکر وطن اپنے روبرو ہی سہی

فیض کی نظموں میں بھی جلاوطنی اوراس سے پیدا ہونے والی افسردگی یا گھر کی تمنا کے موضوعات بہت عام ہیں۔قدیم غزل کی روایت کے مطابق "گھر" دل کا بھی استعارہ ہے جسے عشق کی آگ میں جلاکر برباد کردیتی ہے۔اگر فیض کا بھی دل "گھر" کا استعارہ ہے تو وہ بے اختیار "بے گھر" ہونے اور جلاوطن بننے پر مجبور ہے "(۷۶)

ہم سے کہتے ہیں چمن والے 'غریبان چمن

تم کوئی اچھاسار کھ اپنے ویرانے کانام

شرح فراق، مدح لب مشکبو کریں

غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں(۷۷)

فیض احمد فیض کا شمار اردو کے نمایاں شعراء میں ہوتا ہے۔فیض احمد فیض کی ابتدائی شاعری رومانویت سے مملو تھی بعد ازاں ان کی شاعری میں غم روزگار بھی غم جاناں سے زیادہ ابھر کر سامنے آیا۔عصری اور سیاسی وسماجی شعور کی وجہ سے ان کی شاعری صرف اپنے تک محدود نہیں رہی بلکہ ان کی شاعری ہر مزدور 'محنت کش اوراستحصال زدہ لوگوں کی حمایت اور سرمایہ داریت اورآمریت کی مزاحمت میں پیش پیش نظر آتی ہے۔فیض احمد فیض کو مارکسزم سے وابستگی اور ممکنہ انقلاب کے سدباب کی وجہ سے راولپنڈی کیس میں پھنسایا گیا۔اور فیض احمد فیض کو سیاسی سطح پر جلاوطن نہیں قرار دیا بلکہ فیض نے اپنے اوپر پہرے بٹھائے رکھنے کو گنوارا نہیں کیا۔بالآخر فیض کا جینا جب دوبھر ہو گیا تو بہ امر مجبوری فیض نے جلاوطنی کی راہ اپنانے کا سوچا اس طرح فیض اپنے وطن سے اور قریب ہونے کے لیے جلاوطن ہو گئے۔

دور جاکر قریب ہو جتنے

ہم سے کب تم قریب تھے اتنے

فیض احمد فیض نے ایوب خان اور ضیاء الحق دونوں کے دورآمریت میں جلاوطنی اختیار کی۔جب زبان پہ پابندی ہو'اور جہاں مطلق العنانیت ہو اور جس پر پہرے بٹھائے گئے ہوں آخر وہ انسان جلاوطنی اختیار نہ کرے گا تو اور کون کرے گا۔سر وادی سینا'شام شہریاراں اور مرے دل میرے مسافر کے کئی اشعار انہوں نے جلاوطنی کے دوران کہے اس لیے ان شعری مجموعوں میں جلاوطنی کا کرب نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

ہر نیا تجربہ ایک نئی تخلیق کا پیش خیمہ بنتی ہے۔فیض کا پہلے کسی افغان لڑکی کو دیکھ لینا سبب بنا کہ فیض رومانویت کی دنیا میں چلے گئے جب لینن 'کارل مارکس وغیرہ کا مطالعہ کیا اور پھر اپنے سماج کو دیکھا تو کہنا پڑا" تجھ سے بھی دلفریب

ہیں غم روزگار کے "جب فیض جیل جاپہنچے تو"متاع لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے "کا نعرہ لگایالیکن جب یہی فیض جلاوطنی کے تلخ اور کربناک تجربے کوسہہ لیتا ہے تو نتیجے میں فیض شاعری کی ایک اور دنیابسانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں

فیض نے اپنی جلاوطنی کے دوران وطن کو جہاں یاد کیا اور لیلائے وطن کہہ گئے اسی طرح فیض کو اپنے وطن کی گلیاں بھی یاد آنے لگیں۔انہیں اپنا گھر،اپنے بچے،اپنے دوستوں کی محفلیں،شہر کی گلیاں اور بازار یاد آتے تھے تو ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ملک سے آنے والی ہر خبر ان کے لیے دکھ اور تکلیف کے پیغام کے سوا کچھ نہیں لائی تھی

بیروت قیام کے دوران فیض نے مزاحمت میں مجاہدین کا ساتھ دیا۔اور بیروت میں قیام کے دوران ان کے ذہن وفکر پر فلسطین سوار رہا۔ فلسطین کے لیے اپنے ذہن وفکر میں احترام کا جذبہ پیدا کیا اور پھر فلسطین سے اپنے آپ کو ایسا وابستہ کیا کہ وہ خود فلسطینی جیسے بن گیا اور فلسطین ان کا وطن ٹھہرا یہی وجہ ہے کہ ان کا موضوع سخن بھی فلسطین ہی رہا۔

فیض کی شاعری میں جلاوطنی کے ساتھ ساتھ اس سے ملتے جلتے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع بے گھری ہے۔گھر آرام وسکون اور چین سے زندگی کرنے کا نام ہے محمود درویش کے مطابق گھر ماں کے ہاتھ کی بنی روٹی کھانے 'کافی پینے اور جب مر جائے تو پاؤں پھیلا کے سونے کا نام ہے۔فیض کی زندگی بے گھری سے عبارت رہی یہی وجہ ہے ان شاعری میں بے گھری کے موضوع بڑے جاذب انداز میں در آیا ہے۔

فیض نے گھر "اور غربت "کے روایتی موضوع کو تازہ کیا اور اس طرح انہوں نے وطن سے دوری اور سیاسی جلاوطنی کا نیا موضوع پیدا کیا۔ غربت "کی جگہ یہی بے گھری" کبھی کبھی سیاسی جلاوطنی کی علامت بن جاتی ہے۔اس غربت "میں شاعر کی اجنبیت اور تنہائی کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے لیے گھر اور وطن کی یاد دل کے درد کا مرہم بن جاتی ہے

ج۔ محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی کا پس منظر:

شاعر انسانی جذبات 'احساسات اور تاثرات کو معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کے ساتھ بیان کر سکتا ہے 'جس شاعر کا جتنا بڑا تجربہ ہوتا ہے اسی اعتبار سے بڑی شاعری منظر عام پر آتی ہے۔شاعری جہاں خارجیت کا بیان دے سکتی ہے وہاں داخلیت جیسے درد' دکھ 'ہجر اور جلاوطنی جیسے ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا بیان بھی فصیح وبلیغ پیرائے میں دے سکتی ہے۔دنیا کے دیگر شعرا کی طرح عرب شاعری میں بھی مرثیہ کا چلن رہا۔لیکن جلاوطنی کی شاعری رثائی رنگ میں فلسطینی شعرا سے پہلے ایک رجحان کی صورت میں نظر نہیں آتی۔جلاوطنی کا بڑا تجربہ اہل فلسطین کو ہوا یہی وجہ ہے کہ

فلسطین کے شعرا پابلو نرودا کی پیروی میں جلاوطنی پر مشتمل اشعار کہہ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک معتبر نام محمود درویش کا آتا ہے۔ حسن مجیدی کا کہنا ہے کہ: "حرم الشعب الفلسطینی من الامن وحریۃ البیان لیس لہ حق الحیاۃ وھو محکوم بالتشرد والسجن والخوف والاغتیال ،سلب منہ وطنہ"(۷۸)

یعنی اسرائیلیوں نے فلسطینی قوم پر امن' آزادی اور اظہار بیان پر قدغنیں لگائی ہوئی تھیں۔ انہیں جینے کا حق بھی میسر نہیں تھا۔ اور وہ جلاوطنی' دہشت اور اضطراب کا مرقع بنے ہوئے تھے۔ ان کا وطن اور تمام بنیادی انسانی حقوق بھی ان سے سلب کیے ہوئے تھے محمود درویش کو جلاوطنی کا تجربہ بچپنے سے ہی ہوا۔ محمود درویش فقد بلبل بن کر گل پر نالہ نہیں کیا بلکہ اس کی جلاوطنی پر مشتمل شاعری جلاوطنی کے پس پردہ عوامل اور محرکات سے بھی پردہ اٹھاتی ہے۔

محمود درویش نے اپنی شاعری میں جلاوطنی کو بیان کرنے کے لیے اظہار کے ان اسالیب کو استعمال کیے ہیں: براہ راست جلاوطنی کا اظہاریہ' علامتی اظہاریہ اور ناسٹلجیائی اظہاریہ۔ ایک اور بات محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی کی خاص خوبی یہ ہے کہ جلاوطنی ان کا خود ذاتی تجربہ ہے انہوں نے ذاتی تجربے کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا ہے۔

د۔ محمود درویش کی جلاوطنی پر مشتمل شاعری کی جہات:

محمود درویش کی جلاوطنی پر مشتمل ان کی شاعری کو ان جہات میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

i۔ محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی

ii۔ محمود درویش کی شاعری میں علامتی جلاوطنی (پناہ گزینی)

iii۔ محمود درویش کی شاعری میں گھر بدری

iv۔ محمود درویش کی شاعری میں ناسٹلجیائی کیفیات

v۔ محمود درویش کی شاعری میں علامتی پیرایہ اظہار

i۔ محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی:

محمود درویش کی شاعری صرف اپنے تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ان کی شاعری ہر اس شخص کی آواز ہے جو اپنے وطن سے بے وطن ہے۔ بے وطن انسان اپنا شاعر محمود درویش کو گردانتے ہیں۔ ابو الکلام قاسمی کا کہنا ہے کہ:

> اپنے کھوئے ہوئے وطن کے غم نے وہ شعر کہلوائے کہ محمود اور فلسطین ایک حقیقت کے دو نام بن گئے۔ اپنی پوری شاعرانہ قوت اس وطن کے لیے وقف کر دی انھیں اپنے وطن سے اتنا گہرا پیار اور اٹوٹ لگاؤ ہے کہ کبھی اسے ماں کہہ کر پکارا، کبھی بہن تو کبھی معشوق، وطن سے اپنے

جذباتی ذہنی اور روحانی تعلق کی داستان کچھ اس درد بھرے لہجے اور پُر سوز انداز میں بیان کی کہ باہر کی دنیا بھی اس آواز کی قوت محسوس کی اور ان کے حقیقی درد و کرب کا احساس دنیا کے باضمیر اور حساس لوگوں کو ہونے لگا(۷۹)

محمود درویش کو کئی بار جلاوطن کیا گیا تو کئی بار نظر بند رکھا تو کئی بار جیل کی سلاخوں میں مقید رہے۔یوں ایک بے خانماں کی زندگی گزارتے رہے'ان کی زندگی میں خوشی اور لبوں پر مسکراہٹ تک نہیں آئی۔"ذاق درویش مرارة الغربة والبعد --فی المنفی من الاغتراب والاحساس بضیاع الهویة،ووحشة البیت الخالی من الضحک والسرور"(۸۰)عربی شاعری میں قصیدے شاعری کو بنیادی حیثیت رہی ہے۔امر القیس سے لیکر محمود درویش تک کی شاعری میں مرثیہ'قصیدہ کا ایک اہم عنصر رہا ہے۔کبھی اپنے عزیز کی موت پر مرثیہ لکھتے تو کبھی محبوب کے اجڑے دیار میں ٹھہر کر آنسو بہاتے محمود درویش ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے دیس کی یاد میں گریہ بلند کرتے ہیں۔سلمٰی اعوان کا کہنا ہے کہ:

> کہا جاتا ہے کہ عربی شاعری کا دامن قصیدہ گوئی یا مرثیوں سے بھرا ہے۔امراؤالقیس سے لیکر محمود درویش تک مرثیے کا رنگ بہر طور عربی شاعری میں بہت زیادہ میسر ہے۔یہ ضرور ہے کہ اِس کی صورت بدلتی رہی ہے کبھی یہ عزیزوں کے لئے تو کبھی وطن سے جدائی پر۔دوسرا پہلو درویش کی شاعری میں بدرجہ اتم دکھائی دیتا ہے۔اُن کے تیس کے قریب شاعری کے مجموعے ہیں اور تقریباً ہر شعری سطر مقبوضہ فلسطین کے دُکھ کا اظہار کرتی ہے۔اِسی مناسبت سے اُن کو فلسطین کی سانس کہا گیا اور تمام فلسطینیوں کے احساسات درویش نے اپنے شعروں میں سموڈالے ہیں(۸۱)

محمود درویش کی شاعری میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔جب انہوں نے ۱۹۷۱ء میں فلسطین چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی تو یہی سننے میں آیا کہ محمود درویش نے فراریت کی راہ اپنائی ہے۔اس رد عمل پر محمود درویش نے ان الفاظ میں وضاحت دی کہ میں نے اپنے کم گشتہ وطن سے قریب تر ہونے کے لیے اپنے وطن سے خیر آباد کہہ دیا۔فلسطین سے محمود درویش کو الگ نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ محمود درویش کا کہنا ہے:

انا من انا،مثلما
انت من انت:تسکن فیَ
واسکن فیک الیک ولک(۸۲)

ترجمہ:میں آخر کون؟اور تو بتا ہے کون؟تم مجھ میں زندہ ہو'میں تم میں'میں تمہاری طرف اور تمہارے لیے زندہ ہوں۔

عربی اخبارات شاید فلسطینی شاعری کی اس ندی کو جدید عربی کے عظیم دریا سے نکال کر سنسنی خیز اور جذبات انگیز صحافت کی آبیاری قرار دینے کے درپے تھے۔ چنانچہ محمود درویش نے ۱۹۷۱ میں مقبوضہ فلسطین سے باہر نکل آنے کا اعلان کیا تو تمام عربی اخبارات نے ان کی اس حرکت کو "محاذِ جنگ سے بھاگنے "اور "اپنا مورچہ چھوڑنے " کے مترادف قرار دیا۔ اور ہدف علامت بنایا اور اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا کہ مقبوضہ فلسطین میں محمود درویش کی شاعری ہی نہیں زندگی بھی خطرے میں تھی۔ وہاں وہ جیل کی سلاخ یا کنویں کے مینڈک بن کر وہ جاتے ہیں۔ عربی اخبارات کے اس واویلا کے جواب میں محمود درویش نے کہا" میں کوئی پہلا محب وطن شاعر نہیں ہوں جس نے اپنے وطن سے قریب تر ہونے کے لیے اپنا وطن چھوڑا"[۸۳]

شام کے ادونیس'فلسطین کے سمیع القاسم اور محمود درویش نے جدید عرب شاعری میں بہت مقبولیت پائی ہے۔ محمود درویش کی شاعری کو ان کی اپنی زندگی میں ہی ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کی شہرت اور مقبولیت صرف یہ نہیں کہ انہوں نے فلسطینی عوام کے لیے شاعری کی ہے'بلکہ اس جہت سے بھی ان کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے کہ انہوں نے ہر جلاوطن شخص کی ترجمانی کی ہے۔ اور ہر وہ شخص جو اپنے وطن میں بے وطن ہے محمود درویش کو اپنا شاعر سمجھ سکتا ہے[۸۴] ۲۰۰۲ء میں ۷۴ چھوٹی نظمیں بعنوان "جو کچھ تم نے کیا ہے اس کے لیے معذرت خواہ نہ ہو" یہ نظمیں سترہ سال پہلے لکھی جانے والی "تھوڑے گلاب" والی نظموں کی طرح جلاوطنی کی اذیت کو بیان کرتی ہیں[۸۵]

محمود درویش ایک سنجیدہ شاعر ہے جس کا بنیادی موضوع اس کے ملک کا المیہ ہے جس کی عقدہ کشائی پچھلے ستر برس سے نہیں ہو سکی ستم تو یہ ہے کہ اُسے اپنی سرزمین سے بے دخلی، بے گھری، جلاوطنی اور دربدری تک اختیار کرنی پڑی۔ فلسطین کی سرزمین'جو اس سے چھن چکی ہے، اس کی محبوبہ بن جاتی ہے("فلسطینی زخم کی ڈائری" میں صراحتاً کہتا ہے "میں عاشق ہوں اور زمین میری محبوبہ ہے" "فلسطین سے عاشق" نظم میں وہ پہلے اپنی محبوبہ کو چہار جانب تلاش کرتا ہے، اس کی شناخت کرتا ہے، پھر اس کی تجسیم کر کے اسے فلسطین کا نام دیتا ہے۔ ایڈورڈ سعید کا کہنا ہے کہ:

> "جن لوگوں سے ان کی زمین کا فرش اور سر پر حکومت کا سایہ چھن جائے۔ دنیا کا کوئی بھی خطہ انہیں برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو اور کہیں چلے جانے کا راستہ بھی نہ رہے اور ان کا ماضی محض ایک تلخ یاد کے طور پر زندہ ہو، ان احساسات کو کوئی بھی دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا"[۸۶]

محمود درویش کی جلاوطنی کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اس کے تین زاویئے قابل غور ہیں'ایک تو محمود درویش جلاوطنی کا ردعمل کیسے کرتے ہیں؟ دوسرا یہ کہ محمود درویش اپنا اور فلسطینیوں کا تعارف کیسے بیان کرتے

ہیں؟ تیسرا یہ کہ محمود درویش پر جلاوطنی سے کونسی ذہنی کیفیت طاری ہوگئی؟اس حوالے سے اپنے ایک مضمون *Exile in Contemporary Palestinian Poetry* میں حسین حمزہ لکھتے ہیں:

> "Anyone who follows the evolution of the motif of exile in Darwīsh's poetry will also notice how the motif developed in Palestinian poetry in general. This development may be divided into three parts: Exile – the reaction; exile – molding an identity; and existential exile"[۸۷]

محمود درویش کی شاعری کا بنیادی محور فلسطین ہے'ان کی ساری شاعری فلسطین کے گرد گھومتی ہے'فلسطین اوراس کی اپنی ذات سمیت تمام فلسطینیوں کا مرثیہ ان کی شاعری ہے'رثائی رنگ ان کی شاعری میں غالب ہے۔البتہ وہ فکر کو بھی مہمیز دیتے ہیں'وہ سیاسی اور سماجی شعور بھی رکھتے تھے۔اوراپنے اشعاراوراپنے الفاظ کی حرمت کا انہیں اندازہ تھا'وہ اپنی شاعری کو کئی بموں سے زیادہ وزنی سمجھتے تھے'ان میں غالب کی سی انانیت تھی'اپنی ذات پر کامل اعتماد تھا۔

محمود درویش کواپنے وطن سے والہانہ عشق ہے۔وطن سے حرماں نصیبی انکی قسمت میں تھی دیارِ غیر میں اجڑے دیار کی یاد بار بار آتی ہے لیکن محبت بشرط استواری وہ وطن کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کے درپے ہیں اور یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ ایک نہ ایک دن یقیناً قسمت ہمارا ساتھ دے گی۔اپنی ایک نظم "وطن" میں محمود درویش کا کہنا ہے کہ:

علقونی علی جدائل نخلہ/واشنقنی--فلن اخون النخلہ!/ھذہ الارض لی--وکنت قدیماً/احلب النوق راضیاً وموله/وطنی لیس حزمة من الحکایا/لیس ذکری ولیس حقل اهلہ/وطنی لیس قصة اونشیداً/لیس ضوءا علی سوالف فلہ/وطنی غصبة الغریب علی الحزن/وطفل یرید عیداً وقبلہ/ورياح ضاقت بحجرة سجن/وعجوز یبکی بنیہ--وحقلہ/ھٰذہ الارض جلد عظمی/وقلبی--/فوق اعشابها یطیرکنحلہ/علقونی علی جدائل نخلہ/واشنقونی فلن اخون النخلہ[۸۸]

ترجمہ:"میرا وطن" مجھے کھجور کے پتوں سے باندھ دو/ پھانسی پر لٹکا دو/ مگر میں کھجور سے بے وفائی نہیں کروں گا/ یہ میرا وطن ہے۔ازل سے/ اداسی اور خوشی'دونوں حالتوں میں/ میں اونٹنی کا دودھ دوہتا رہا ہوں/ میرا وطن داستانوں کا مجموعہ نہیں ہے/ یادوں کا گلدستہ نہیں ہے پہلی کے چاند کا کھیت بھی نہیں ہے/ میرا وطن کوئی افسانہ یا ترانہ نہیں ہے/ یاسمین کی جھاڑی کی خوشبو پر پڑنے والی روشنی بھی نہیں ہے/ میرا وطن!/ جلاوطنی کا غصہ/ دکھوں کی مجبوری/ ایک بچہ ہے جو رونق اور پیار چاہتا ہے/ ہوا کا جھونکا ہے/ جو جیل کی کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا ہے/ بڑھاپا

ہے / جو بچوں اور کھیتوں کی موت پر ماتم کناں ہے / میرا وطن میری ہڈیوں کی جلد ہے / اور میرا دل / اس کے گھاس پر شہد کی مکھی کی طرح اڑ رہا ہے / مجھے کھجور کے پتوں سے باندھ دو / پھانسی پر لٹکا دو / مگر میں کھجور سے بے وفائی نہیں کروں گا"(۸۹)

محمود درویش کی شاعری جلاوطنی کا روزنامچہ ہے۔ اس حوالے سے ان کی ایک نظم جلاوطنی کا غم نامہ قابل ذکر ہے۔ جس میں جلاوطن شخص اپنی خیر وعافیت اور حالات سے گھر والے کو باخبر رکھنے کے لیے خط لکھ رہے۔ لیکن جلاوطن شخص پریشان ہے کہ کون سی ڈاک ہے جو انہیں لے جائیگی 'بری 'بحری اور ہوائی راستے بند ہیں۔ محمود درویش کی نگاہ میں موت دو قسم کی ہوئی ایک تو اصلی موت جس کے نتیجے میں انسان دنیا میں نہیں ہوتا ایک وہ موت جو جلاوطنی سے طاری ہو جاتی ہے۔ وطن انسان کا سرمایہ 'وطن زندگی ہے' جس کسی سے وطن چھن جائے تو اس انسان کی پہچان ختم ہو جاتی ہے' جب پہچان ختم ہوتی ہے تو اس انسان کی قیمت بھی صفر ہو جاتی ہے۔

پیاری ماں!
نہیں جانتا کہ یہ کاغذ کالے کیوں کر رہا ہوں
بغیر گھر کے
بغیر جھنڈے کے
بغیر پتے کے (۹۰)

جلاوطن ہر اس شخص کو کیا جاتا ہے جسے حاکم یا حکومت وقت اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرے جب محمود درویش کی شاعری کا مطالعہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جہاں فلسطینی بشمول محمود درویش اپنے وطن سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں صیہونی عناصر ان کو فلسطین سے مکمل بے دخل کیے جا رہے ہیں ایک انسان کے لیے کس قدر مشکل اور کٹھن مرحلہ ہے جہاں اغیار اس کے وطن کو اپنا وطن سمجھے اور وہ اپنے وطن کو اپنا وطن کہنے سے بھی قاصر رہے۔

فلسطین کی ایک تاریخی اہمیت ہے یہ انبیاء کی سرزمین ہے یہ مسلمانوں کا قبلہ اول ہے' اس کا دفاع کرنا اخلاقی لحاظ سے بھی ایک فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس مقام و مرتبہ پر فلسطین فائز تھا اسی حساب سے فلسطین کو صیہونیوں نے فلسطین کے ساتھ ظلم روا رکھا۔ اور یہ ملک ایک پرندہ ہے جو ہمیشہ شکاری کے جال میں پھڑکتا ہے اور صرف اپنا خون کرتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے محمود درویش اپنی ایک نظم "فلسطین کے لیے آٹھویں مناجات" میں لکھتے ہیں:

اے ملک: جس کے نام مزاج کی نسبت

سے جانے جاتے ہیں
کبھی تاریخ کے چابکوں کی
کبھی اس کے جیل خانوں کی اور
کبھی اس کی جلاوطنی کے مقامات کی نسبت سے
اور تم جو ہر زمانے میں اسیری کی حالت
میں رہتے ہیں(۹۱)

صیہونیوں کی نئی آبادکاری میں محمود درویش کے آبائی گاؤں "البروہ بلڈوز کی نذر ہو گیا تو محمود درویش کے گھر' جائیداد سب کچھ ملبہ بن چکا تھا یہی وجہ ہے کہ صیہونیت کے مظالم کی وجہ سے محمود درویش جہاں گھر کو تلاشتے رہے وہاں وطن کی تلاش میں بھی سرگرداں رہے۔

میرا شکار مجھ سے کہتا ہے
مجھے کنواریوں سے بھری جنت سے
یا ابدی نعمتوں سے کوئی غرض نہیں تھی
مجھے اس زمین کی زندگی سے محبت تھی'
انجیر اور صنوبر کے پیڑوں کے درمیان
لیکن مجھے اس جنت سے محروم کر دیا گیا
پھر بھی میرے پاس جو کچھ تھا اس سے کام لے کر
اپنی رگوں میں خون کے آخری قطرے تک
تلاش کرتا رہا[۹۲]

محمود درویش یوں تو زندگی کا بیشتر حصہ فلسطین میں گزرا لیکن وہ فلسطین میں رہتے ہوئے فلسطین کو اپنا وطن کہنے سے قاصر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمود درویش ذہنی انتشار کی کیفیت میں نظر آتے ہیں۔ اپنی ایک نظم "دشمن" میں لکھتے ہیں:

میں وہاں تھا ایک مہینہ پہلے
میں وہاں تھا ایک سال پہلے
میں وہاں تھا ہمیشہ' جیسے میں کبھی کہیں اور نہیں رہا[۹۳]

محمود درویش پر الزام لگا کہ محاذ چھوڑ کر محمود درویش نے بزلی مظاہرہ کیا تو اس کا جواب اس طرح سے دیا کہ میں وطن سے اور زیادہ نزدیک ہونے کے لیے وطن کو خیر باد کہا' یقیناً محمود درویش نے باہر ملک جا کر مزید شعور حاصل کیا اور پہلے سے بھی جاندار قسم کی شاعری فلسطین کے حق میں کی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد والی شاعری پختہ نظر آتی ہے جہاں جذبات کے ساتھ فکر کا بھی حسین امتزاج ملتا ہے۔ محمود درویش اپنی ایک نظم "فلسطین کے لیے نویں مناجات" میں لکھتے ہیں:

تم سے دور بھاگتے ہوئے
تاکہ تمہارے قریب آسکوں
میں وقت کو دریافت کیا ہے
تمہارے قریب آتے ہوئے
تاکہ تم سے دور جاسکوں
میں نے اپنے احساسات کو دریافت کیا ہے
قربت اور دوری کے درمیان
خواب کے جسم کا ایک پتھر ہے
جو نہ قریب آتا ہے
نہ دور جاتا ہے (۹۴)

محمود درویش وطن کی تلاش میں رہا' محمود ایسا اوڈیسیس ہے جسے اپنی پینے لوپیا یعنی فلسطین میسر نہیں آیا۔ البتہ محمود وطن کا کرب سہتا رہا اور وطن کے دکھ کو ہار بنا کر گلے سے لگائے رکھا۔

تم میرے وطن کے بارے میں جاننا چاہو گے
اور یہ کہ ہمارے مابین کیا ہے؟
میرا وطن پابہ زنجیر ہونے کی خوشی ہے
ایک بوسہ جو ڈاک میں بھیجا گیا
اس وطن سے جس نے مجھے قتل کیا
میں نئی موت کے جواز اور اپنی ماں کا رومال چاہتا ہوں (۹۵)

محمود درویش کی شاعری صرف اپنی ذات تک محدود نہیں ہے' بلکہ ان کی شاعری کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ ہر جلاوطن اور بے گھر شخص کی ترجمانی ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ وطن سے اس حد تک ہر کسی کو لگاؤ ہوتا ہے کہ ایک ایسی جگہ ملے جسے وہ اپنا وطن کہہ سکے' اور آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکے' محمود درویش کو یہ چیز میں میسر آئی بالآخرہ محمود درویش فلسطین سے گہری وابستگی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ اگر میرے جسم کو وطن میسر نہ آیا تو کم از کم اتنا حق تو دو کہ میری روح آزادانہ وطن میں چل پھر سکے۔ "وہ مجھے مردہ دیکھنا چاہتے ہیں" کی نظم میں محمود دریش گویا ہیں:

پوچھا: میرا قتل کب کروگے؟
بولے' وہ تو ہم نے شروع بھی کر دیا ہے
مگر تم نے اپنے جوتے روح کو کیوں دے دیئے؟
"اس لیے کہ روح میری زمین پہ چل سکے' میں نے بتایا
انہوں نے پوچھا تم نے سفید نظم کیوں لکھی
جب کہ زمین کالی سیاہ ہے؟
"اس لیے کہ میرے دل میں تیس سمندر موجزن ہیں" (۹۶)

محمود درویش کی محبت اپنے وطن سے حد درجے کی ہے' وطن پر رونا' وطن پر کراہنا محمود درویش کی نشاۃ ثانیہ بن چکا ہے۔ لیکن وہ کس زمین پر روئے جسے وہ اپنا بھی نہیں کہہ سکتے' لاچاری کی حد کر دی' لیکن باوجود اس کے محمود درویش نے وطن کو یقیناً چھوڑا لیکن جسمانی اعتبار سے تو وطن سے دور ہوئے لیکن ذہنی طور پر محمود درویش فلسطین میں رہے اور وطن کی محبت اور وطن سے عشق دل و نگاہ میں بسا کر وطن کی اور بھی بڑھ کر چاہت کرنے لگے۔

فلسطینی جو صدیوں سے فلسطین میں رہائش پذیر تھے' پھر ایک استعماری سازش کے تحت امریکہ اور یورپ کی پشت پناہی میں فلسطین کو صیہونیوں کے حوالے کر دیا۔ فلسطینیوں کو اپنے وطن سے بے دخل کر دیا۔ فلسطینیوں نے نقل مکانی شروع کر دی نتیجے میں ان کی اکثریت بعض علاقوں میں اقلیت میں تبدیل ہو گئی اور اسرائیل کی ناجائز اولاد غالب آتی گئی نتیجے میں ایک کسمپرسی کے عالم میں فلسطینی وطن سے بے وطن ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ پروفیسر ڈاکٹر اسماء رشید کا کہنا ہے:

فلسطینی عوام کو ان کی سرزمین سے جہاں وہ دوہزار سال سے رہتے چلے آئے تھے، بے دخل کر دیا تا کہ وہاں ایک غیر ملکی خالصتا یورپی استعماری ریاست کے قیام عمل میں لایا جائے جس کی بنیاد نسلی برتری کے اصول پر ہے، اسرائیلی فوج اور دہشت پسندوں نے فلسطین کی بیشتر عرب آبادی کو انتہائی کسمپرسی کے عالم میں اپنی زمینوں اور گھروں کے چھوڑنے پر مجبور کیا، جبکہ باقی ماندہ عرب آبادی نے آناً فاناً اپنے کو ایک معزز صاحب جائیداد اکثریت سے ایک محروم، مظلوم اقلیت میں تبدیل ہوتے اور اپنے ہی وطن میں غریب الوطن ہوتے پایا[۹۷]

تحیة۔۔۔وقبلة
ولیس عندی مااقول بعد
من این ابتدئ؟
واین انتھی؟
ودورة الزمان دون حد
وکل مافی غربتی
زوادة فیھارغیف یابس ووجد
ودفتر یحمل عنی بعض ماحملت
بصقت فی صفحاته ماضاق بی من حقد[۹۸]

اسی نظم کے آگے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ماں کے نام (جلاوطنی کا خط) پیاری ماں! / نہیں جانتا کہ یہ کاغذ کالے کیوں کر رہا ہوں / کون سی ڈاک ہے جو انہیں لے جائیگی / بری 'بحری اور ہوائی راستے بند ہیں / اور ہو سکتا ہے کہ تم سب مر چکے ہو / یا پھر زندہ ہو بغیر کسی پتے کے / کیا کوئی زندہ رہ سکتا ہے / بغیر ملک کے / بغیر گھر کے / بغیر جھنڈے کے / بغیر پتے کے[۹۹]

محمود درویش کی نظموں میں سے ایک اہم نظم "رسالة الیٰ المنفی" ہے یعنی جلاوطن کا غم نامہ۔یہ نظم جلاوطنی کے ایام میں جلاوطن شخص کے دردوالم کی تجسیم ہے۔اس میں کرب نمایاں ہے 'ہر جلاوطن اسے اپنا تجربہ قرار دیا جاسکتا ہے 'گویا محمود درویش نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا ہے۔اس بارے میں رسول بلاوی لکھتے ہیں:

> زندگی درآوارگی یا درپناہ اردوگاہ ھای اقامت اجباری در شعر محمود درویش بہ گونہ ای بسیار تاثر انگیز تصویر شدہ است۔ اودر قصیدہ ی "رسالة من المنفی" غم نامہ ی انسان فلسطینی آوارہ رابہ تصویر می کشد، علی الرغم وضوح وآشکاری در عنوان شعر کہ نشان می دھد ازرنج انسان در تبعید سخن بگوید، اما شاعر بہ کلی از تعبیر مستقیم دوری می کند و بہ ترسیم تصویر انسانی پناہ می برد کہ روابط این فلسطینی آوارہ راباخانو دہ اش تجسم می کند واحساسات پر از غم ووضعیت زندگی روزانہ ای کہ

احساس غربت رادر ہر لحظہ برای اواملا کردہ واین احساس رانزد او تاکید می کند راآشکار می سازد[۱۰۰]

یعنی محمود درویش کی زندگی ایک پناہ گزینی کی زندگی تھی'ان کی شاعری میں اس کی تصویر اثر انگیز ہے۔ان کا قصیدہ" جلاوطنی کا غم نامہ "ایک جلاوطن شخص کی ترجمانی کرتا ہے۔اس نظم میں ایک جلاوطن کے دکھ اور درد کو مجسم انداز میں پیش کیا ہے۔کہ ایک جلاوطن شخص کیا کیا احساسات رکھتے ہیں ان احساسات اور جذبات کو صفحہ قرطاس پر لاکر ایک پر تاثیر نظم کی طرح ڈالی ہے۔

محمود درویش اپنے آپ کو عاشق اور وطن کو محبوب سمجھتے ہیں۔وطن سے محبت جہاں ایمان کا حصہ ہے وہاں ہر باضمیر،باغیرت اور باحمیت انسان اپنے وطن سے فطری لگاؤ رکھتا ہے۔محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی کا دکھ جہاں ان کا ذاتی تجربہ ہے وہاں ان کی شاعری ہر جلاوطن افراد کے وطن کے بارے میں جذبات واحساسات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔

محمود درویش کی شاعری کی خوبی یہ ہے کہ اس کی شاعری میں اجتماعیت چھلکتی ہے'صرف ایک شخص کی جلاوطنی کی عکاسی ان کی شاعری میں نہیں ملتی بلکہ ان کی شاعری میں اہل فلسطین کے ملک بدر ہونے کی باتیں پوری سلیقہ مندی سے ملتی ہیں۔جیسا کہ خیریت دریافت کرنے پر ملک بدر فلسطینی کا جواب یہی ہوتا ہے کہ ہم بخیر وعافیت ہیں'ناراحتی کا اظہار کوئی نہیں کرتا'اس مضمون کو محمود درویش ان الفاظ میں منظوم کرتے ہیں:

میں نے ریڈیو پر جلاطنوں کے پیغام سنے
سب یہی کہتے ہیں ہم ٹھیک ہیں
کوئی یہ نہیں کہتا" میں ناخوش ہوں "[۱۰۱]

محمود درویش کی شاعری میں وطن کا المیہ اور غم کا نہ تھمنے والا سلسلہ موجود ہے'اس کی شاعری میں غم کا بیان نہایت عمدہ طریقہ پر ہوا۔اداسی ضرور جلاوطنی جیسے تلخ تجربے سے آئی مگر محمود درویش ناامید نہیں ہوئے۔اس بارے میں حسن مجیدی رقمطراز ہیں" تمتزج قصائد محمودد رویش التی تمحور عن غربۃ المنفی،بالحزن والحسرۃ،ولکن لایختم علیھا الیاس،بل فی کثیر من قصائدہ یجدالامل بالعودۃ الی لوطن"یعنی محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی کا بیان حزنیہ اورالمیہ انداز میں ہوا ہے۔اس پر مایوسی کی کیفیت بر قرار رہتی ہے۔البتہ ان کے بیشتر قصیدوں میں وطن کی جانب واپسی کی امید بھی دکھائی دیتی ہے۔

جلاوطنی پر مشتمل نظموں میں سے ایک نمائندہ نظم "ماں کے نام(جلاوطن کا خط)" ہے۔جس کو پڑھتے ہوئے چشم نم ہوئے بغیر نہیں رہتے۔اس نظم میں محمود درویش ایک نوجوان کے جلاوطن ہونے کا دکھ بیان کر رہا ہے۔جو اپنی ماں کو جلاوطن ہونے کے بعد خط لکھ رہا ہے۔وہ نوجوان مردوں کی سی زندگی گزار رہا ہے' ریسٹورنٹ میں چند درہم کے عوض اپنی جوانی کے قیمتی اوقات گنوا رہا ہے۔ایک مسکراہٹ عارضی سی چھائی ہوئی ہے۔گزرا ہوا کل بھی جس کا تاریک تھا تو آنے والا کل بھی دھندلا دکھائی دے رہا ہے۔خط لکھتے لکھتے نوجوان پر اجنبیت کی چھینٹیں پڑنی شروع ہو جاتی ہیں۔یہ نظم صرف ایک نوجوان کی دکھ بھری کہانی نہیں بلکہ ہر فلسطینی نوجوانوں کی یہی کیفیت ہے بلکہ ہر جلاوطن انسان اسی کروفر اور کرب کے دردناک عذاب سے گزر رہا ہوتا ہے۔

میں اب بیس سے اوپر ہو گیا ہوں / ماں! مجھے کبھی دیکھو / میں مردوں کی طرح زندگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں / ایک ریستوران میں کام کرتا ہوں۔برتن دھوتا ہوں / گاہکوں کے لیے کافی بناتا ہوں / اداس چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ اوڑھے رکھتا ہوں / کہ وہ آرام و سکون محسوس کریں / جانتی ہو ماں! میری آنکھیں کیوں بھیگ جاتی ہیں / فرض کرو میں کسی شام بیمار پڑھ جاؤں / کیا رات مجھ پر ترس کھائے گی / ایک مہاجر پر جو یہاں آیا اور پھر واپس اپنے گھر نہ جا سکا / کیا اس درخت کو جس کے نیچے میں گروں گا / یہ معلوم ہو گا کہ یہ مردہ چیز کبھی انسان تھی / کیا وہ میری لاش کو گدھوں سے بچالے گا / پیاری ماں! / نہیں جانتا کہ یہ کاغذ اے کیوں کر رہا ہوں / کون سی ڈاک ہے جو انہیں لے جائیگی / بری' بحری اور ہوائی راستے بند ہیں / اور ہو سکتا ہے کہ تم سب مر چکے ہو / یا پھر زندہ ہو بغیر کسی پتے کے / کیا کوئی زندہ رہ سکتا ہے / بغیر ملک کے / بغیر گھر کے / بغیر جھنڈے کے / بغیر پتے کے[۱۰۳]

وطن سے دور ہونا' قیامت سے کم نہیں' وطن ایک رحمت کا سایہ ہے جو اس کی عوام کو اپنی آغوش میں رکھتا ہے' وطن کو "ماں" کا درجہ بھی دیا جاتا ہے جب وطن سے انسان دور جاتا ہے تو وہ ایک طرح سے خبطی کی کیفیت میں آتا ہے۔اور ہر چیز کو اجنبی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔محمود درویش نے بھی اس کرب کا گہرائی سے تجربہ کرنے کے بعد متنوع شاعری کی ہے جو لائق تحسین ہے۔اس بارے میں سنان انطون(Sinan Antoon) کا کہنا ہے کہ:

> The harrowing experience of losing his home and being an internal exile in his land at such a young age would haunt Dervish's poetry and become a central theme with rich and complex variation running throughout his oeuvere[۱۰۴]

جلاوطن ہونا کس قدر کرب ناک اور وحشت ناک ہے کہ جہاں انسان کو ایک موت نہیں آتی بلکہ یہ موت بار بار آتی ہے۔ اپنی ایک نظم "جلاوطن نامہ" میں محمود درویش کا کہنا ہے کہ:

ماذاجنینا نحن یااماہ
حتی نموت مرتین
فمرۃ نموت فی الحیاۃ
ومرۃ نموت عند الموت(۱۰۵)

اماں! ہم سے کیا سہو ہوا ہے / کہ ہمارے مقدر میں دوبار موت لکھی گئی ہے؟ / ایک بار زندگی میں / اور دوسری بار موت میں؟(۱۰۶)

محمود درویش قرب مکانی کے اعتبار سے وطن کے قریب رہے ہیں بلکہ وطن میں ہی رہے ہیں لیکن وطن کی تاریخ' جغرافیہ اور زمین سب کچھ صیہونیوں کے قبضے میں گیا۔ تو محمود درویش صیہونیوں کی سازشوں کے لمبے عرصے کے لیے بنے گئے جال کا ادراک کرتے ہوئے اپنی ایک نظم "ایک خانہ بدوش نغمہ" میں وطن کے دور ہو کو اس انداز میں لکھتے ہیں:

میرا ملک بہت دور ہے
ملک! جس کا کوئی نشان موجود نہیں(۱۰۷)

محمود درویش اپنی شاعری کے ذریعے پہلے تو جلاوطنی کے حوالے سے اپنی ذات کے گہرے مشاہدہ کو بیان کرتے ہیں' آگے جا کر جلاوطنی کی اجتماعی کیفیت کو کلام موزوں میں لے آتے ہیں۔ بات صرف یہاں تک نہیں رکتی بلکہ وہ اپنے آپ سے خود کلامی کرنے لگتے ہیں۔ اپنے وطن کے بارے میں وہ اپنے آپ سے جواب مانگتا ہے مگر اس معاملے میں وہ اپنے آپ کو بھی لاجواب پاتا ہے وہ اپنے دیس کے ساتھ خود کو بھی پردیسی سمجھتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ صیہونیت نے فلسطینیوں سے فلسطینی پہچان اور شناخت تک کو غارت کیا ہے۔ محمود درویش ان کیفیات اور حالات میں صرف یادوں اور موت کے اسباب کی تمنا کرتے ہیں۔ اپنی ایک نظم "دور خزاں میں ہلکی بارش" میں لکھتے ہیں:

تم میرے وطن کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟
اور میرا اس سے کیا تعلق ہے؟
میرا وطن اسیری کی لذت میں ہے
جیسے ڈاک کے ذریعے بھیجا گیا بوسہ
میں اور کچھ نہیں چاہتا

اس ملک سے جس نے مجھے قتل کیا

فقط

اپنی ماں کا رومال اور ایک نئی موت کے اسباب (۱۰۸)

محمود درویش کی شاعری وطن کی تلاش، وطن سے محبت اور جلاوطنی کے دکھ سے عبارت ہے۔ محمود درویش نے اختیار نہیں کی۔ انہیں بچپنے میں ہی جلاوطن ہونے پر مجبور کیا گیا۔ جب شعور کے مرحلے تک پہنچا تو اسے احساس ہوا کہ وہ ایک دیس سے نکالا ہوا فرد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمود درویش اپنے وطن فلسطین کو بھی اجنبی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، میرے وطن میں تمہیں اپنی محبتیں نہیں دے سکا 'میرے وطن تو کس قدر خوبصورت ہو' میرے وطن مجھ سے اجنبیت محسوس نہ کرتے ہوئے میری آنکھوں کو اور میرے دل کو اپنے حسیں ہاتھوں سے پکڑو اے میرے محبوب وطن۔ اس حوالے سے ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وطنی لم یعطنی حبی لک

غیراخشاب صلیبی

وطنی یاوطنی مااجملک

خذ عیونی ،خذفؤادی،خذحبیبی (۱۰۹)

محمود درویش کی شاعری میں وطن کی محبت اور عشق مجازی دونوں آپس میں مدغم ہو گئی ہیں۔ ان کی شاعری کے ایک بند میں محبوب (عشق مجازی) کا بیان ہے تو دوسرے بند میں بچھڑے ہوئے فلسطین محبوب کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس بارے میں روبینہ الماس کہنا ہے کہ "محمود درویش وطن اور فلسطین سے اپنی محبت اور کسی عرب دوشیزہ کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کو باہم گڈمڈ کرتا رہتا ہے" اس حوالے سے ان کی ایک نظم "ڈینیوب نیلا نہیں ہے" کی مثال دے سکتے ہیں۔

صیہونیت محمود درویش کی شاعری کو اپنے وجود کے لیے خطرہ سمجھتی رہی یہی وجہ ہے کہ محمود درویش کو کبھی جلاوطن کیا، کبھی خود ساختہ جلاوطن ہونا پڑا، کبھی علامتی جلاوطنی اختیار کرتے ہونے پناہ گزینی اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا تو کبھی اپنے دیس میں جلاوطنی کی کیفیتوں سے گزارا گیا۔ محمود درویش کی جلاوطنی کی شاعری وطن سے محبت، وطن کی یاد وطن کے دکھ اور پھر وطن کے باسیوں کے مصائب و آلام پر براہ راست مرثیہ ہے۔

محمود درویش نے جلاوطنی کے دوران اپنے گزرنے والے ہر کرب کی جزئیات میں جا کر شاعری کی ہے۔عام طور پر جب کوئی اپنے عزیزوں سے کہیں دور چلا جاتا ہے تو فطری طور پر اپنے عزیز وا قارب کی بڑی یاد آ رہی ہوتی ہے' ان یادوں کو کوئی نہیں روک سکتا' شاعر پھر اپنی قلبی تسکین کے لیے اپنے دکھ' درد اور غم کو الفاظ کے قالب میں ڈال دیتا ہے۔ محمود درویش نے بھی اپنی دھرتی کو ماں کے لقب سے نوازا اور ماں کے نام جلاوطن کا خط شعری قالب میں تحریر کیا' جس کو پڑھتے ہوئے ہر جلاوطن شخص اپنا ذاتی تجربہ محسوس کرتا ہے' یہی چیز محمود درویش کی شاعری کو آفاقیت سے نوازتی ہے۔

محمود درویش کی زندگی مہاجرت سے عبارت ہے جس کا سفر اپنے وطن کی تلاش میں جاری رہا لیکن مہاجرت تو زندگی کے ساتھ ختم ہوئی لیکن وطن کی چاہت اور محبت کو پانے میں ناکام رہے اور یوں بے گھری ،بے وطنی اور مہاجرت کے عذاب کو سہتے ہوئے عالم بیگانگی میں دنیا کو خیر آباد کہا اور ابدی نیند سو گئے۔اس حوالے سے محمود درویش اپنی ایک نظم "جلاوطن نامہ" میں اپنی ماں سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں:

تمہیں معلوم ہے کہ کس بات سے میری ہچکیاں نہیں تھمتیں؟

فرض کرو، میں کسی رات بیمار ہو جاؤں

بیماری میرے جسم کو ایذا میں جکڑ لے

کیا اس شام کو یاد رہے گا کیسے ایک مہاجر

یہاں آیا تھا اور اپنے وطن نہیں لوٹ سکا تھا؟

کیا اس شام کو یاد رہے گا کیسے ایک مہاجر

بغیر کفن کے مر گیا تھا؟(۱۱۰)

جلاوطنی عذاب ہے' دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں' محمود درویش نے اپنے بڑوں سے سن رکھا تھا کہ جس کسی انسان کے نصیب میں وطن نہ ہو' اسے پاؤں پھیلا کے آرام کرنے لیے زمین میں جگہ میں نہیں مل سکتی۔اپنی ایک "اپنے والد کے لیے ایک نظم" میں محمود درویش کا کہنا ہے: میرے والد نے ایک بار بیان دیا تھا/ جس آدمی کا کوئی وطن نہیں ہے / زمین پر اس کی قبر بھی نہیں ہو گی(۱۱۱)

محمود درویش کو وطن میسر نہیں آیا زندگی بھر وطن کی تلاش میں سرگرداں رہے آخر کار محمود درویش دوبارہ سے جنم کی تمنا کر رہے ہیں شاید اگلی جنم میں وطن کی آغوش میں ننھا بچہ بن پرورش پا سکے۔اپنی ایک نظم "مجھے دوبارہ جنم

دو کہ میں جان سکوں!" میں کہتے ہیں: مجھے دوبارہ جنم دو تا کہ میں / اپنے وطن کا دودھ پی سکوں، اور / تمہارے بازوؤں میں ننھا بچہ بن کر رہوں(۱۱۲)

ii۔ محمود درویش کی شاعری میں (علامتی جلاوطنی) پناہ گزینی:

محمود درویش کی زندگی کا معتد بہ حصہ پناہ گزینی میں گزری جیسے بے خانماں کی زندگی بھی کہا جاتا ہے۔ محمود دریش نے چھ برس کی عمر میں ہی پناہ گزین کے طور پر بیروت میں پناہ لی۔ واپسی پر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مردم شماری سے رہ گیا ہے تو ابتدا میں شناختی کارڈ سے بھی محروم رہا" کوئی بھی فلسطینی' جس کا اندراج پہلی اسرائیلی مردم شماری میں نہیں ہوا تھا' نئی اسرائیلی ریاست کے نزدیک پناہ گزین تھا۔ مردم شماری کے دوران درویش لبنان میں تھے چنانچہ وہ اپنی ہی سرزمین پر غیر قانونی طور پر زندہ رہنے پر مجبور ہوئے"(۱۱۳) محمود کی زندگی وطن کے لیے ترستی رہی۔ درویش نے کمیونسٹ اسرائیلی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ "جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ ایک پناہ گزین کو پرانے پتے کی جگہ نیا متبادل پتہ میسر آیا۔ پہلے میں لبنان میں پناہ گزین تھا لیکن اب میں اپنے ملک میں بھی پناہ گزین تھا"(۱۱۴)

محمود درویش کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کو آپ بیتی سے نکال کر جگ بیتی کے مقام تک پہنچایا یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر جلاوطن انہی کرب سے گزرتا ہے۔ جس کرب کو محمود درویش نے بیان کیا ہے۔

البروہ محمود درویش کا آبائی گاؤں تھا۔ اسے اسرائیل نے ملیامیٹ کر دیا' اس کا نقشہ تک باقی نہیں رہا۔ البروہ کو بنجر زمین میں تبدیل کر دیا۔ لیکن البرہ کا نقش محمود درویش کے ذہن میں محفوظ رہا' اس کے ذہن میں البروہ جنت گم گشتہ کی صورت میں اپنے وجود کا احساس دلاتا رہا۔ اسرائیلی مظالم کی یہ انتہا ہے کہ جب ۱۶ اپریل ۲۰۰۱ء کا وہ سیاہ دن آتا ہے تو انہوں نے بلڈوزروں کے ذریعے البروہ کے قبرستان سے نئی سڑک کی تعمیر کی داغ بیل ڈالی تو انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں چاروں جانب بکھر گئیں۔ ان حالات محمود درویش کو بڑا شاعر بنا دیا۔ "یوں معدوم دیہات ایک بے گھر اور بے وطن شاعر کے لیے ایسے سامان کا شعری استعارہ بن گیا ہے جسے پناہ گزین کی حیثیت سے وہ کم و بیش ۳۵ برس تک کندھوں پر اٹھائے پھرا"۔

محمود درویش جلاوطنی کو موت سے مشابہ گردانتے ہیں۔ اور ان کے مطابق یہ موت کہیں بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اس کیفیت میں شاعری کا جواز پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح زندگی کو بہتر بنایا جا سکتا ہے' کیسے اپنے آپ کو بار بار جنم دیا جائے۔ محمود دریش نے ایمسٹرڈیم میں پناہ گزینی کے دوران ایک تقریر کرتے ہوئے کہا:

صرف ایک ہی جگہ پیدا پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس کے بر خلاف وہ کہیں اور کئی مرتبہ مر سکتا ہے جلاوطنی میں اور قید خانوں میں اس وطن میں جسے قبضے اور بندش نے بھیانک خواب بنا کر رکھ دیا ہے شاید شاعری ہی وہ چیز ہے ہمیں اس دل فریب تصور کو فروغ دینا سکھاتی ہے، کس طرح اپنے ہی آپ سے بار بار نیا جنم لیا جائے۔ وہ الفاظ کے ذریعے سے ایک بہتر دنیا کی تعمیر کی جائے، ایک افسانوی دنیا جو زندگی کے ساتھ مستقل اور مکمل اس کے معاہدے پر دستخط کرنے کی طاقت بخشتی ہے (۱۱۵)

محمود درویش صرف پناہ گزین نہیں رہے بلکہ ان کا اپنا وطن بھی پناہ گزینی میں تھا جیسا کہ ان کی ایک نظم "ایتھینز کا ہوائی اڈہ" ہے اس نظم میں ایک کسٹم آفیسر جب ایک بڑھیا سے پوچھتا ہے کہ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے گاؤں کا پتا کیا ہے؟ تو وہ جواب دیتی ہے "میری گٹھڑی میرا گاؤں ہے" گویا محمود درویش جس طرح بچپنے کی زندگی سے لے کر آخر عمر تک پناہ گزینی کی کیفیت میں رہا' فلسطین بھی طول تاریخ سے خاص اسرائیلیوں کے قبضے کے بعد مسلسل پناہ گزینی کے عالم میں ہے۔

میں عاشق ہوں اور زمین میری محبوبہ ہے
میرا وطن سفری بیگ نہیں ہے
اور نہ ہی میں مسافر ہوں
میں عاشق ہوں اور زمین میری محبوب ہے (۱۱۶)

جس شخص کو اپنی جائیداد سے محروم رکھا جسے ابتدا میں شناختی کارڈ سے بھی محروم رکھا گیا ہو' جس کی زندگی پناہ گزینی سے عبارت ہو' اس شخص کے پاس محرومی کے سوا کچھ اور چیز کہاں سے بر آمد ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھار محمود درویش پر اداسی چھا جاتی ہے اور محرومی کی کتاب کھولنے بیٹھ جاتے ہیں۔

بچپنے میں پناہ گزین ٹھہرے 'بیروت میں ریڈ کراس کے صدقے پر زندگی کے ایام گزارنے پر مجبور ہوئے' واپس وطن لوٹے تو نقشہ بدل چکا تھا' یوں ابتدا سے ہی بیگانگی کی فضا قائم ہوئی یہی بیگانگیت زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رہی اور اسی بیگانگیت میں فلسطین کو خیر آباد کہہ کر فلسطین کی سرزمین میں جا آباد ہوئے۔ شاید قبر میں بھی محمود درویش کو چین نہ ملا ہو گا وطن جواب بھی پناہ گزینی کی کیفیت میں ہے۔

ماں کے نام (جلاوطنی کا خط)

تمہارے لیے پیار اور نیک تمنائیں
اور کیا کہہ سکتا ہوں
کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کر دوں
وقت بے اختیار گزرتا جا رہا ہے
اور اس جلاوطنی میں میرے پاس کچھ بھی نہیں علاوہ
ایک روٹی
اداسی
اور محرومیوں سے بھری ہوئی ایک کتاب کے (۱۱۷)

محمود درویش فلسطین کے عاشق ہیں' ایک محبوب کی طرح فلسطین کا چاہا ہے' فلسطین کو بنانے کی دھن میں لگے رہے۔ فلسطین سے فرقت کے داغ سینے میں اٹھائے رکھے' فلسطین کے حصول کے لیے در در کی ٹھوکریں کھائیں' فلسطین کو تلاشتے رہے۔ فلسطین کو صیہونی ہنکائے لے جا رہے ہیں' محمود درویش فلسطین کو تھامے رکھنے کی کوشش میں نظر آتے ہیں' لیکن اسرائیلی ہتھکنڈوں کے پیچھے دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں کارفرما ہونے کی وجہ سے فلسطین' محمود درویش سمیت فلسطینیوں سے کہیں دور جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے' فلسطینیوں کو فلسطین اجنبی محسوس ہونے لگے' اس سے بڑھ کر عذاب کیا ہو سکتا ہے جو اپنی زمین کو اپنی نہ کہہ سکے۔ جس کے وطن کو دھکیلا جا رہا ہو' جس کے وطن کو زندان میں ڈالا جا رہا ہو' جس کے وطن کو جلاوطن کیا جا رہا ہو اس وطن کے باسیوں پر کیا گزرتا ہو گا۔ انہیں تجربات کو مشاہدات کے بہترین عکاسی کرنے کا ہنر محمود درویش ہی جانتے ہیں۔ جیسا کہ "ایک فلسطینی عاشق" نام کی نظم میں محمود درویش کا کہنا ہے کہ: میں نے کل تمہیں بندرگاہ پر دیکھا / تم عازم سفر تھی' بغیر اہل خانہ کے۔۔۔ بغیر زادِ راہ کے / میں یتیموں کی طرح لپک کر تمہاری طرف گیا / کہ اگلوں کی دانائی کی کوئی بات تم سے پوچھوں / تم سے پوچھوں کہ ایک کشتِ سرسبز کو کیوں اس طرح دھکیلا جاتا ہے زندان کی طرف۔۔۔ جلاوطن کی طرف۔۔۔ بندرگاہ کی طرف (۱۱۸)

محمود درویش اپنے ملک کو سفری تھیلا گردانتے ہیں' ان کے نزدیک جس کی کوئی دیوار نہیں' لوگ گیتوں اور دھویں کے خیمے میں رہتے ہیں۔ وطن کی تلاش میں سرگراں ہے۔ لوگ بھی پناہ گزینی کی زندگی گزار رہے ہیں تو ساتھ وطن بھی پناہ گزین بنا ہوا ہے' لوگوں کو وطن کی تلاش ہے اور وطن کو عوام کی تلاش ہے۔ اور ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ ان کی نظم کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

میر املک ایک سفری تھیلا ہے / یایوں کہو کہ ایک سفری تھیلا'میر املک ہے / یہاں کوئی پلیٹ فارم نہیں / کوئی دیوار نہیں / میرے پاؤں کے نیچے کوئی زمین نہیں / کہ میں اس طرح مر سکوں جیسے میں چاہوں / میرے ارد گرد کوئی آسمان نہیں ہے / کہ میں پیمبری کی خیمہ بستی میں پناہ لے سکوں / میری کمر دیوار کے ساتھ لگی ہے / دیوار بھی کیسی۔۔۔ایک گری ہوئی دیوار / میر املک ایک سفری تھیلا ہے / میر اسنہری تھیلاخانہ بدوشوں کاملک ہے / یہ لوگ گیتوں اوردھویں کے خیمے میں رہتے ہیں / یہ لوگ اپنے وطن کی تلاش میں / نوکیلے پتھروں اور بارشوں میں مارے مارے پھرتے ہیں (۱۱۹)

iii۔ناسٹلجیائی اظہاریہ:

ناسٹلجیا علم نفسیات کی اصطلاحات میں سے ایک اصطلاح ہے جو اب ادب کا حصہ بن چکا ہے۔ناسٹلجیا میں ماضی کی جہاں یاد ہوتی ہے وہاں وطن لوٹنے کی خواہش بھی ہوتی ہے بقول غزالہ شفیق "ناسٹلجیا کی کیفیت اپنی زمین سے دور ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے لیکن شاید یہ دوری اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں'اس کی طرف لوٹنے کی خواہش بھی ضروری ہے"(۱۱۹) محمود درویش کی شاعری میں کئی جہات سے ناسٹلجیائی حوالے ملتے ہیں۔اس بارے میں احمد رضا کا کہنا ہے کہ "لدیہ(محمود درویش)اشعارنوستالوجیہ لاجل البعد عن الوطن ذکریٰ ایام الطفولۃ الحلوۃ والفتہ بالوطن المالوف وایضاً البعد عن الاصدقاء والاقرباء"(۱۲۰) یعنی محمود درویش کی شاعری میں جہاں ماضی کی یاد ہے وہاں وطن کی یاد بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ در آئی ہے اوران کی شاعری میں وطن کو خوبصورت دیکھنے کی آرزو ہے۔لہذا یہ کہا سکتا ہے کہ محمود درویش کی شاعری میں ناسٹلجیائی کیفیتیں بھی بھر پور انداز میں اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں۔انیس ناگی کا کہنا ہے:

> "محمود درویش کی نظموں کا ایک ہی موضوع ہے اوروہ فلسطین کی تاریخی صورتحال'اس کی نظموں کی جذباتی سطح اورنفسیاتی کیفیت کو جنم دیتی ہے۔کھوئی ہوئی محبت، چھنا ہوا ملک، طاقتور دشمن سے مقابلہ، پیہم بے بسی کا احساس اور سب سے بڑھ کر اپنی سرزمین کے لیے ناسٹلجیا بدلی ہوئی شکلوں میں محمود درویش کی نظموں کا موضوع بنتے ہیں"(۱۲۱)

پس محمود درویش کی شاعری وطن کی تلاش میں سرگرداں ہے۔اس کی شاعری وطن کو پانے کی جستجو میں نظر آتی ہے۔لیکن وطن سے معانقہ کرنے کا موقع فلسطین سے فلسطین کے عاشق کو میسر نہیں آتا تو محمود درویش ایک محبوب کی جدائی کی طرح فلسطین کے اپنے سے کوسوں دور ہونے کا رونا روتے ہیں۔اس خاطر کبھی خودکلامی

پر شاعر اتر آتا ہے تو کبھی ناسٹلجیائی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ تو کبھی فلسطین سے بے دخلی پر ماتم کناں تو کبھی پناہ گزینی جیسی کربناک زندگی کے تلخ ترین تجربات پر دل آویز اور رقت آمیز شاعری قارئین کے سامنے پیش کرنے میں محمود درویش کامیاب ہو جاتے ہیں۔

محمود درویش کی شاعری اس کی اپنی ذات کی ڈائری ہے۔ بچپنے سے لے کر جوانی پھر موت تک کے دوران پیش آنے والے ہر واقعہ اور داستان کا بیان محمود درویش نے اپنی شاعری میں محفوظ کیا ہے۔ محمود درویش اپنی ماضی میں پناہ لیتا ہے۔ اور اسی میں سکون پاتا ہے "بقول روبینہ الماس" جلاطنی صرف تجربہ نہیں ایک احساس بھی ہے جس میں ناسٹلجیا اپنی پوری قوت سے اثر پذیر ہوتا ہے "(۱۲۲) اپنی ایک نظم "وہ میری انتہا تک اور اس کی انتہا تک" میں محمود درویش لکھتے ہیں:

یہ گلیلی کے شمال کا علاقہ ہے
اور لبنان ہمارے عقب میں ہے
آسمان سارے کا سارا ہمارا ہے
دمشق سے لے کر عکا کی خوبصورت دیوار تک
تب کیا ہو گا؟
ہم گھر واپس لوٹ جائیں گے
کیا تمہیں گھر کا راستہ معلوم ہے میرے بیٹے؟
جی ابا جان۔۔۔
ایک گھر میں گھستا ہے
تم گھر کا پتا جانتے ہو، بیٹا
جی ابا، اسی طرح جیسے راستے کا پتا جانتا ہوں (۱۲۳)

وطن کو یاد کرتے کرتے محمود درویش پر ناسٹلجیائی کیفیات بھی طاری ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنے بچپنے کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ جہاں انہیں ماں کے ہاتھ کی پکی روٹی" "کافی" اور خاص کر ماں کی محبت بھرا لمس میسر تھا ان لمحات میں محمود درویش اپنے آپ کو دوبارہ لے جانے کے خواہاں ہیں۔

اصبحت متشوقة الى خبزامی
وقهوة امی

وملاطفتهاایاه

وکبریوماًبعد یوم الطفولۃ فیَ(۱۲۴)

میری آرزو ہے

ماں کے ہاتھ کی پکی روٹی

ماں کے ہاتھ کی بنی کافی

ماں کے ہاتھ کا لمس

بچپن میرے اندر پلتا ہے(۱۲۵)

محمود درویش کو فلسطینیوں کی سانس کہا جاتا ہے تو وہاں ان کو شاعر انسانیت بھی کہا جاتا ہے جو انسانی نفسیاتی کیفیتوں کو سمجھ کر مقہور و مظلوم عوام کی ذہنی اور نفسیاتی رد عمل کے ساتھ نفسیاتی الجھاؤ اور دماغی خلل یا ذہنی بیگانگیت کا علامتی اور براہ راست ترجمانی بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نفسیاتی کیفیتوں کے بیان میں جلاوطنی کو جس انداز میں محمود درویش نے بیان کیا اس کی نظیر ادبی دنیا میں کم ہی ملتی ہے۔ محمود درویش کی جلاوطنی کی شاعری میں ناسٹلجیائی کیفیتیں بھی دیدنی ہیں:

وطنی لم یعطنی حبی لک

غیراخشاب صلیبی

وطنی یاوطنی مااجملک

فی توابیت احبانی اغنی

لاراجیح احبائی الصغاری

دم جدی عائد لی فانتظرنی(۱۲۶)

ناسٹلجیائی کیفیت میں اپنے آپ کو ڈال کر محمود درویش تقاضا کرتے ہیں مجھے چولہے کا 'ایندھن' کپڑے سکھانے والی رسی بنادے اور میرا بچپن مجھے لوٹا دے تا کہ میں برسوں جنت گم گشتہ کا انتظار کر سکوں۔

اگر میں کبھی لوٹ آؤں

تو مجھے اپنے چولہے کا ایندھن بنالینا

چھت پر کپڑے سکھانے والی رسی بنالینا

کیوں کہ میں نے

تمہاری روزانہ دعاؤں کے بغیر

تمام فیصلے چھوڑ دیتے ہیں

میں بوڑھا ہو گیا ہوں

مجھے میرا بچپن دے دے

تاکہ میں جوان پرندوں کے ساتھ شامل ہو جاؤں

اور تمہارے انتظار کے جال میں پھنس جاؤں (۱۲۷)

محمود درویش فلسطین میں لوٹنے کے خواہاں ہیں وہ ناظم حکمت کی طرح "وطن سے محبت کو" آہ" اور "واہ" جیسے درد آمیز الفاظ سے ظاہر کرتے ہیں۔ لہذا محمود درویش کی جلاوطنی کی وجہ سے ناسٹلجائی کیفیت در آئی ہے جہاں محمود جنت گم گشتہ میں داخل ہونے کی اجازت وطن سے ہی مانگ رہا ہے۔ جیسا کہ محمود دریش کا کہنا ہے:

ادخلونی الی الجنة

ساطلق صرخہ ناظم حکمت

آہ۔۔۔یاوطنی۔۔ (۱۲۸)

vi۔ محمود درویش کی شاعری میں گھر بدری:

گھر آرام و سکون کی علامت ہے 'جس کا گھر کوئی نہ ہو وہ بے چینی کی زندگی گزارتا ہے' محمود درویش کی بد قسمتی دیکھئے بچپنے ہی میں گھر بلڈوز ہو جاتا ہے 'گھر کیا پورا آنگن اور گاؤں تک مسمار کئے گئے اور اپنے گاؤں سے ہی بے دخل کیا گیا۔ تو محمود درویش گاؤں کو سلام اس انداز میں پیش کر رہے ہیں:

اس کی نگاہیں چیر رہی ہیں مرا وجود

اس نے مرے بدن کی زمین کھرچ کھرچ کر

ہر ایک مُو پہ نقش لکھا "الجلیل" کا

سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام (۱۲۹)

نتیجے میں اپنے گاؤں اور گھر سے بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ محمود دویش کی شاعری میں بھی گھر بدری کا عذاب اور دکھ توانا کیفیت میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر آصف چٹھہ کا کہنا ہے کہ

> اگر محمود درویش کو کم سنی میں دربدری اور غریب الوطنی کے تلخ اور ناگوار تجربے سے دوچار ہونا پڑا تو بے گھر ہونے کی اداسی اور ہجرت کے شدید احساس محرومی نے بھی عمر بھر اس کے اندر گھر کیے رکھا۔ اپنا گھر اور اپنی سرزمین محض رہنے کے لیے ایک جگہ نہیں ہوتی بلکہ

آرزؤں، جذبوں اور رشتوں کا ایک رنگارنگ گلشن کے اجڑنے سے خوابوں کا تاج محل
چکنا چور ہو جاتا ہے (۱۳۰)

ظالموں کا اپنا ظلم نظر نہیں آتے وہ ظلم میں بہت آگے نکل جاتے ہیں صیہونی بھی اپنے مظالم کو شمارش میں نہیں لاتے وہ کشتوں کے قتل کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں درحالانکہ جس کے گھر سے شہید کا جنازہ نکلتا ہے ان سے جا کر پوچھے تو معلوم ہو گا کہ ایک بوڑھی ماں کے لیے جوان بیٹے کا لاشہ دیکھنا کس قدر کٹھن مرحلہ ہے۔ محمود درویش' صیہونیت کی عارفانہ تجاہل کی قلعی ان الفاظ میں ان کی اپنی زبانی سنا کر کھولتے ہیں۔

میرے شکار کا اصرار ہے
کچھ بھی نہیں بدلا ہے
سوائے میرے گھر
اور میرے استعمال شدہ فرنیچر (۱۳۱)

محمود درویش کی شاعری میں بے گھری کا مرثیہ بھی دیدنی ہے۔ بچپنے سے ہی بے گھری کا داغ سینے میں لیا' یوں ساری زندگی گھر کے لیے ترستے رہے' وطن کی خوشبو سونگھنے کو نہیں ملی' دل مسلسل بے چین رہا گھر صرف خواب بنا رہا حقیقت کا روپ دھارنے سے رہ گیا۔ اس کے حوالے سے محمود درویش لکھتے ہیں۔

ہر جگہ کی اپنی مہک ہوتی ہے
جب کبھی میں اپنے گاؤں کا تصور کرتا ہوں
میرے حواس اس کی خوشبو کی روح سے بھر اٹھتے ہیں
اور میرا دل واپس گھر جانے کو دکھنے لگتا ہے (۱۳۲)

محمود درویش کی شاعری سماج سے متعلق ہے۔ محمود درویش کے سماج میں دو طرح کے لوگ ہیں' ایک اسرائیلی اور ایک فلسطینی' ایک طرف ظالم و جابر قسم کے لوگ ہیں تو طرف مظلوم و مقہور لوگ آباد ہیں۔ محمود درویش کی شاعری دونوں کے لیے ہے۔ ان میں سے محمود درویش کی شاعری ظالمین سے مزاحمت کرتی ہے اور مظلومین کے حق کا دفاع کرتی ہے۔ محمود درویش کی شاعری کو فلسطین کے مجاہدین نے آزادی کے لیے ترانہ ضرور بنایا' لیکن برادران یوسف کی طرح (انا یوسف یا ابی اخوتی لا یحبو ننی بینهم (۱۳۳) عرب ممالک نے کما حقہ فلسطینی عوام کا ساتھ نہیں دیا' اس کا گلہ محمود درویش کو بھی رہا۔ اس حوالے سے انیس ناگی کا کہنا ہے:

محمود درویش کی تازہ نظمیں اسی جذباتی حالت کی مظہر ہیں'اس مغلوب کرنے والی صورتحال میں محمود درویش اپنی جذباتی رقت کے ذریعے معاصر رائے عامہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اہل فلسطین بے گھر ہوئے'ان پر بہت ستم ہوئے لیکن سب تماشائی بنے رہے وہ عرب ملک سے بھی شاکی ہے کہ وہ بے حس ہو چکے ہیں اور اپنی خاموشی اسرائیل سے کو تقویت دے رہے ہیں (۱۳۴)

محمود کا آبائی گھر گلیلی کے "البروہ "میں تھا'یہ گھر اس وقت مسمار ہوا جب محمود درویش چھ برس کے تھے'محمود درویش اسی گھر کے لیے ترستے رہے'اسی پر آہ زاری جاری رکھی'اب محمود درویش کا جہاں گھر تھا وہ زمین بھی محمود درویش کی نہیں رہی'گھر سے'زمین سے اور اپنے وطن سے دوری سے اسے عاشق بنا دیا'یوں گھر'وطن اور زمین کی چاہت دل میں لیے زندگی کے دن گزارتے رہے۔اس بارے میں محمود درویش اپنی ایک نظم "اس عظیم ہجرت میں "میں لکھتے ہیں:

میرے دل کو اپنے گھر کے ارد گرد نالہ وزاری کرنے دو
بے عیب وقت کے لیے کراہنے دو
سنہری وقت کے لیے جو گزر چکا
میری اپنی کوئی زمین نہیں لیکن
ہجرت میں مَیں تمہیں زیادہ چاہنے لگا ہوں (۱۳۵)

اپنی ایک نظم "تھوہر کی حیات جاودانی "میں لکھتے ہیں:

ابا تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟
ہمارے بعد ہمارے گھر میں کون رہے گا؟ (۱۳۶)

گھوڑا'گاڑی گھر کی زینت ہوتی ہے'اور یہ کہ انسان کے سفری سہولت کی خاطر بھی ان کی ضرورت ہمیشہ درپیش رہتی ہے۔فلسطین ایسا گھوڑا جس پر صیہونی سوار ہیں 'جس کی لگام اور مہار صیہونیوں کے قبضے میں ہے'ان کی ظلم اور بربریت کی وجہ سے اصل گھوڑے کے مالک فلسطینی جان کو خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسرائیلی آبادکاری سے کہیں دور نکل گئے ہیں محمود درویش آخر میں نتیجہ دیتے ہیں کہ جب مکین گھر کو چھوڑ جائے تو وہ گھر اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

تم نے گھوڑے کو اکیلے کیوں چھوڑا؟

گھر سے تعلق قائم رکھنے کی خاطر

مکینوں کے چلے جانے سے گھر مرنے لگتے ہیں (۱۳۷)

محمود درویش کی شاعری میں سوزو گداز بھی ہے'جوش بھی ہے'شعلہ بھی ہے'اور نفرت بھی ہے اور عشق بھی۔اپنی بے خانماں زندگی کا مرثیہ'انقلاب کے نعرے'وطن سے اظہار محبت کے سوتے'اور صیہونیت سے بغض وعناداورانسانیت سے پیار محمود درویش کی شاعری کا خلاصہ ہے۔محمود درویش کی شاعری میں قنوطیت سے زیادہ رجائیت پائی جاتی ہے'ایک نہ ایک دن ظلم کے بادل چھٹ جانے کی امید بہر حال محمود درویش کو ہے کہ ایک نہ ایک دن گھر میسر آجائے گا'امن 'چین اور سکون بھی ہماری ڈیوڑھی پر دستک دے گا'لیکن پھر بھی سوالیہ نشان اٹھا کر خود کلامی پر مائل ہو جاتے ہیں کہ آزادی ملے گی کیسے ؟جیسا کہ اپنی ایک نظم "زیتون کے جھنڈ سے ایک آواز "میں محمود درویش کا کہنا ہے:

ہو سکتا ہے کہ

میں اپنے گھر واپس جا سکوں

ہو سکتا ہے کہ آسماں سے بارش اترے

جو اس حریص جنگل کی آگ بجھا دے

ہو سکتا ہے

کیا پتہ

میں کسی روز اپنی صلیب سے نیچے اتر آؤں

مگر

واپس کیسے جاؤں گا

ننگے پاؤں ؟

ننگے بدن ؟(۱۳۸)

v۔ محمود درویش کی جلاوطنی کی شاعری میں علامتی اظہاریہ:

محمود درویش کی جلاوطنی سے متعلق نظمیں ایک طرح کی نہیں ہیں۔کچھ تو سادہ اور بیانیہ ہیں،جن میں فلسطین سے عربوں کی بے دخلی،ان کی ماؤں کی بے حرمتی،ان کے گھروں،ان کے بچوں اور جوانوں کا خون کرنے جیسے واقعات

پر دکھ کا اظہار کیا گیا ہے، مگر بعض نظمیں 'علامتی' بھی ہیں، اور اسی مفہوم میں علامتی ہیں جس مفہوم میں جدید عالمی نظم علامتی سمجھی جاتی ہیں، یعنی نئی اور نامانوس لفظیات کو علامت بنانا اور اساطیری حوالے لانا(۱۳۹) ابو الکلام قاسمی کا کہنا ہے:

فلسطینی شاعری میں علامات و اساطیر کا بکثرت استعمال ملتا ہے۔ تشویش، تکلیف، اور گردش زندگی کے لیے سندباد اور Odysseys جیسی علاقوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ وہیں عرب کے احیاء نشاۃ ثانیہ کے لیے ادونیس، ققس، اور زیزیس، لازاروس، مسیح حسین جیسی علامات ملتی ہیں، ان کے علاوہ پرومیتھیوس اور سسی فس جیسے یونانی اساطیر بھی مستعمل ہیں۔۔۔۔ محمود کے ہاں گیہوں، خواب، چٹان، نغمہ، بادل، اور کرب جیسی علامتوں کا استعمال ملتا ہے۔ اور جابجا یونانی اساطیر کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ کچھ نظموں میں وہ اپنے والد کو Ulysses فلسطین کو Penelope اور خود کو Falemaches کے طور پر متعارف کراتے ہیں(۱۴۰)

مسیحی علامتوں میں صلیب کا استعمال ملتا ہے شہادت اور کرب کی امیجری بھی ان کے ہاں کثرت سے مستعمل ہے۔ "ان کی شاعری میں عصری سیاسی کرب کا دردناک اظہار ہے اور نئی عصری آگہی سے بھرپور تخلیقی انکشاف ہے۔ ان کے ہاں شخصی تجربات و مشاہدات، علائم بھی بکثرت ملتے ہیں"(۱۴۱)

محمود درویش پہلے تو اپنے وطن سے جلاوطن ہو جاتے ہیں پھر اس کی زندگی جلاوطن کی ہوگئی اس سے آگے بڑھ کر وہ اپنی دنیا سے جلاوطن ہوئے صرف یہی نہیں بلکہ وہ موت کو بھی زندگی سے جلاوطنی کی ایک صورت قرار دیتے ہیں اس تجربے سے بھی محمود درویش کو گزرنا پڑا۔

جب ایک انسان کا وطن آنکھوں کے سامنے اغیار کا ہو جائے تو اس انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے اس کی عکاسی محمود درویش نے اپنی ایک نظم "تمہارے لب شہد ہیں اور تمہارے ہاتھ" میں کی ہے محمود درویش اپنے وطن کو محبوب سمجھتے ہوئے وطن کا مرثیہ ان الفاظ میں پڑھ رہے ہیں کہ اے میرے محبوب وطن! صہبا کے جام، چھوٹی کنگھی، مخمل، ڈیزی کے پھول، فرش ملائم تو نے کس کے لیے فراہم کیے درحالانکہ تیرا چاہنے والا اندھیری راتوں میں سرگرداں گھوم رہا ہے۔

صہبا کے دو جام ہیں
دوسروں کے لیے!
گھنا درخت بادکش 'شاہ بلوط کا سوکھا جھاڑ

چھوٹی کنگھی ہے
دوسروں کے لیے
تمہارے سینے کا مخمل اور شبنم اور ڈیزی کے گرے پھول
ایک فرش ملائم ہے
دوسروں کے لیے
مجھے تمہارے شہد کی چاہ رہے گی
کیا ہوا اگر اب یہ شہد اغیار کے پیالوں میں ٹپکتا ہے
اے مدد ماکھی
جس نے سوائے لب یاسمین اور کسی شے کا رس نہیں چوسا(۱۴۲)

محمود درویش فلسطین کو کبھی 'ماں' کبھی بہن ' کبھی والد تو کبھی فلسطین کو زوجہ بنانے کے درپے نظر آتے ہیں' یعنی فلسطین سے انہیں گہری وابستگی ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح سے فلسطین میں مدغم ہونا چاہتے ہیں۔ محمود درویش اپنی ایک نظم "فلسطین کے لیے آٹھویں مناجات" میں لکھتے ہیں:

نابود ہو جاؤ کہ میں تمہارا ماتم
کر سکوں
یا میرے ساتھ عقد کر لو کہ میں
بے وفائی کو جان لوں
ایک بار ہی سہی(۱۴۳)

عربی شاعری کا دامن قصیدہ گوئی یا مرثیوں سے بھرا ہے۔ امراؤ القیس سے لیکر محمود درویش تک مرثیے کا رنگ بہر طور عربی شاعری میں بہت زیادہ میسر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اِس کی صورت بدلتی رہی ہے کبھی یہ عزیزوں کے لئے تو کبھی وطن سے جدائی پر۔ دوسرا پہلُو درویش کی شاعری میں بدرجہ اتم دکھائی دیتا ہے۔

محمود درویش کی محبت اپنے وطن سے حد درجے کی ہے 'وطن پر رونا' وطن پر کراہنا محمود درویش کی نشاۃ ثانیہ بن چکا ہے۔ لیکن وہ کس زمین پر روئے جسے وہ اپنا بھی نہیں کہہ سکتے' لاچاری کی حد کر دی' لیکن باوجود اس کے محمود درویش

نے وطن کو یقیناً چھوڑا لیکن جسمانی اعتبار سے تو وطن سے دور ہوئے لیکن ذہنی طور پر محمود درویش فلسطین میں رہے اور وطن کی محبت اور وطن سے عشق دل و نگاہ میں بسا کر وطن کی اور بھی بڑھ کر چاہت کرنے لگے۔

فلسطینی جو صدیوں سے فلسطین میں رہائش پذیر تھے' پھر ایک استعماری سازش کے تحت امریکہ اور یورپ کی پشت پناہی میں فلسطین کو صیہونیوں کے حوالے کر دیا۔ فلسطینیوں کو اپنے وطن سے بے دخل کر دیا۔ فلسطینیوں نے نقل مکانی شروع کر دی نتیجے میں ان کی اکثریت بعض علاقوں میں اقلیت میں تبدیل ہو گئی اور اسرائیل کی ناجائز اولاد غالب آتی گئی نتیجے میں ایک کسمپرسی کے عالم میں فلسطینی وطن سے بے وطن ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

محمود درویش نے اپنی شاعری میں جلاوطنی کو بیان کرنے کے لیے اظہار کے ان اسالیب کو استعمال کیے ہیں: براہ راست جلاوطنی کا اظہاریہ، علامتی اظہاریہ اور ناسٹلجیائی اظہاریہ۔ محمود درویش کی شاعری میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جب انہوں نے ۱۹۷۱ء میں فلسطین چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی تو یہی سننے میں آیا کہ محمود درویش نے فراریت کی راہ اپنائی ہے۔ اس رد عمل پر محمود درویش نے ان الفاظ میں وضاحت دی کہ میں نے اپنے کم گشتہ وطن سے قریب تر ہونے کے لیے اپنے وطن سے خیر آباد کہہ دیا۔

محمود درویش کی شاعری کی خوبی یہ ہے کہ اس کی شاعری میں اجتماعیت جھلکتی ہے' صرف ایک شخص کی جلاوطنی کی عکاسی ان کی شاعری میں نہیں ملتی بلکہ ان کی شاعری میں اہل فلسطین کے ملک بدر ہونے کی باتیں پورے سلیقہ مندی سے ملتی ہیں۔

محمود درویش نے جلاوطنی کے دوران اپنے گزرنے والے ہر کرب کی جزئیات میں جا کر شاعری کی ہے۔ عام طور پر جب کوئی اپنے عزیزوں سے کہیں دور کہیں چلا جاتا ہے تو فطری طور پر اپنے عزیز و اقارب کی بڑی یاد آ رہی ہوتی ہے' ان یادوں کو کوئی نہیں روک سکتا' شاعر پھر اپنی قلبی تسکین کے لیے اپنے دکھ' درد اور غم کو الفاظ کے قالب میں ڈال دیتا ہے۔ محمود درویش نے بھی اپنی دھرتی کو ماں کے لقب سے نوازا اور ماں کے نام جلاوطن کا خط شعری قالب میں تحریر کیا' جس کو پڑھتے ہوئے ہر جلاوطن شخص اپنا ذاتی تجربہ محسوس کرتا ہے' یہی چیز محمود درویش کی شاعری کو آفاقیت سے نوازتی ہے۔

جس شخص کو اپنی جائیداد سے محروم رکھا جسے ابتدا میں شناختی کارڈ سے بھی محروم رکھا گیا ہو' جس کی زندگی پناہ گزینی سے عبارت ہو' اس شخص کے پاس محرومی کے سوا کچھ اور چیز کہاں سے برآمد ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھار محمود درویش پر اداسی چھا جاتی ہے اور محرومی کی کتاب کھولنے بیٹھ جاتے ہیں۔

محمود درویش فلسطین کے عاشق ہیں' ایک محبوب کی طرح فلسطین کو چاہا ہے' فلسطین کو بنانے میں کی دھن میں لگے رہے' فلسطین سے فرقت کے داغ سینے میں اٹھائے رکھے' فلسطین کے حصول کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھائیں' فلسطین کو تلاشتے رہے۔ فلسطین کو صیہونی ہنکائے لے جارہے ہیں' محمود درویش فلسطین کو تھامے رکھنے کی کوشش میں نظر آتے ہیں' لیکن اسرائیلی ہتھکنڈوں کے پیچھے دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں کارفرما ہونے کی وجہ سے فلسطین ' محمود درویش سمیت فلسطینیوں سے کہیں دور جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے' فلسطینیوں کو فلسطین اجنبی محسوس ہونے لگے' اس سے بڑھ کر عذاب کیا ہو سکتا ہے جو اپنی زمین کو اپنی نہ کہہ سکے۔ جس کے وطن کو دھکیلا جارہا ہو' جس کے وطن کو زندان میں ڈالا جارہا ہو' جس کے وطن کو جلاوطن کیا جارہا ہو اس وطن کے باسیوں پر کیا گزرتا ہو گا۔ انہیں تجربات کو مشاہدات کے بہترین عکاسی کرنے کا ہنر محمود درویش ہی جانتے ہیں۔

محمود درویش کی جلاوطنی سے متعلق نظمیں ایک طرح کی نہیں ہیں۔ کچھ تو سادہ اور بیانیہ ہیں، جن میں فلسطین سے عربوں کی بے دخلی، ان کی ماؤں کی بے حرمتی، ان کے گھروں، ان کے بچوں اور جوانوں کا خون کرنے جیسے واقعات پر دکھ کا اظہار کیا گیا ہے، مگر بعض نظمیں 'علامتی' بھی ہیں۔

وطن کو یاد کرتے کرتے محمود درویش پر ناسٹلجیائی کیفیات بھی طاری ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنے بچپنے کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ جہاں انہیں ماں کے ہاتھ کی پکی روٹی'' کافی '' اور خاص کر ماں کی محبت بھرا لمس میسر تھا ان لمحات میں محمود درویش اپنے آپ کو دوبارہ لے جانے کے خواہاں ہیں۔

محمود درویش کی شاعری میں بے گھری کا مرثیہ بھی دیدنی ہے۔ بچپنے سے ہی بے گھری کا داغ سینے میں لیا' یوں ساری زندگی گھر کے لیے ترستے رہے' وطن کی خوشبو سونگھنے کو نہیں ملی' دل مسلسل بے چین رہا گھر صرف خواب بنا رہا حقیقت کا روپ دھارنے سے رہ گیا۔

ہ۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی کا تقابل:

فیض احمد فیض کا شمار اردو کے نمایاں شعراء میں ہوتا ہے۔ فیض احمد فیض کی ابتدائی شاعری رومانویت سے مملو تھی بعد ازاں ان کی شاعری میں غم روزگار بھی غم جاناں کی طرح نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ عصری اور سیاسی وسماجی شعور کی وجہ سے ان کی شاعری صرف اپنے تک محدود نہیں رہی بلکہ ان کی شاعری ہر مزدور' محنت کش اور استحصال زدہ لوگوں کی حمایت اور سرمایہ داریت اور آمریت کی مزاحمت میں پیش پیش نظر آتی ہے۔ فیض احمد فیض

کو مارکسیزم سے وابستگی اور ممکنہ انقلاب کے سدباب کی وجہ سے راولپنڈی کیس میں پھنسایا گیا۔ اور فیض احمد فیض کو سیاسی سطح پر جلاوطن نہیں قرار دیا بلکہ فیض نے اپنے اوپر پہرے بٹھائے رکھنے کو گنوارا نہیں کیا۔ بالآخر فیض کا جینا جب دوبھر ہو گیا تو بہ امر مجبوری فیض نے جلاوطنی کی راہ اپنانے کا سوچا اس طرح فیض اپنے وطن سے اور قریب ہونے کے لیے جلاوطن ہو گئے۔ فیض احمد فیض نے ایوب خان اور ضیاء الحق دونوں کے دور آمریت میں جلاوطنی اختیار کی۔ جب زبان پہ پابندی ہو' اور جہاں مطلق العنانیت ہو اور جس پر پہرے بٹھائے گئے ہوں آخر وہ انسان جلاوطنی اختیار نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ سر وادی سینا' شام شہر یاراں اور مرے دل میرے مسافر کے کئ اشعار انہوں نے جلاوطنی کے دوران کہے اس لیے ان شعری مجموعوں میں جلاوطنی کا کرب نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

ہر نیا تجربہ ایک نئ تخلیق کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ فیض کا پہلے کسی افغان لڑکی کو دیکھ لینا سبب بنا کہ فیض رومانویت کی دنیا میں چلے گئے جب لینن' کارل مارکس وغیرہ کا مطالعہ کیا اور پھر اپنے سماج کو دیکھا تو کہنا پڑا " تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے " جب فیض جیل جا پہنچے تو " متاع لوح و قلم چھن گئ تو کیا غم ہے " کا نعرہ لگایا لیکن جب یہی فیض جلاوطنی کے تلخ اور کربناک تجربے کو سہہ لیتا ہے تو نتیجے میں فیض شاعری کی ایک اور دنیا بسانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں

فیض نے اپنی جلاوطنی کے دوران وطن کو جہاں یاد کیا اور لیلائے وطن کہہ گئے اسی طرح فیض کو اپنے وطن کی گلیاں بھی یاد آنے لگیں۔ انہیں اپنا گھر، اپنے بچے، اپنے دوستوں کی محفلیں، شہر کی گلیاں اور بازار یاد آتے تھے تو ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ ملک سے آنے والی ہر خبر ان کے لیے دکھ اور تکلیف کے پیغام کے سوا کچھ نہیں لاتی تھی۔

بیروت قیام کے دوران فیض نے مزاحمت میں مجاہدین کا ساتھ دیا۔ اور بیروت میں قیام کے دوران ان کے ذہن و فکر پر فلسطین سوار رہا۔ فلسطین کے لیے اپنے ذہن و فکر میں احترام کا جذبہ پیدا کیا اور پھر فلسطین سے اپنے آپ کو ایسا وابستہ کیا کہ وہ خود فلسطینی جیسے بن گیا اور فلسطین ان کا وطن ٹھہرا یہی وجہ ہے کہ ان کا موضوع سخن بھی فلسطین ہی رہا۔

فیض کی شاعری میں جلاوطنی کے ساتھ ساتھ اس سے ملتے جلتے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع بے گھری ہے۔ گھر آرام و سکون اور چین سے زندگی کرنے کا نام ہے محمود درویش کے مطابق گھر ماں کے ہاتھ کی بنی روٹی کھانے' کافی پینے اور جب مر جائے تو پاؤں پھیلا کے سونے کا نام ہے۔ فیض کی زندگی بے گھری سے عبارت رہی یہی وجہ ہے ان شاعری میں بے گھری کے موضوع بڑے جاذب انداز میں در آیا ہے۔

فیض نے گھر "اور غربت" کے روایتی موضوع کو تازہ کیا اور اس طرح انہوں نے وطن سے دوری اور سیاسی جلاوطنی کا نیا موضوع پیدا کیا۔ غربت "کی جگہ یہی بے گھری" کبھی کبھی سیاسی جلاوطنی کی علامت بن جاتی ہے۔ اس غربت "میں شاعر کی اجنبیت اور تنہائی کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے لیے گھر اور وطن کی یاد دل کے درد کا مرہم بن جاتی ہے

شاعر انسانی جذبات' احساسات اور تاثرات کو معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کے ساتھ بیان کر سکتا ہے' جس شاعر کا جتنا بڑا تجربہ ہوتا ہے اسی اعتبار سے بڑی شاعری منظر عام پر آتی ہے۔ شاعری جہاں خارجیت کا بیان دے سکتی ہے وہاں داخلیت جیسے درد' دکھ' ہجر اور جلاوطنی جیسے ذہنی اور نفساتی کیفیات کا بیان بھی فصیح و بلیغ پیرائے میں دے سکتی ہے۔ دنیا کے دیگر شعرا کی طرح عرب شاعری میں بھی مرثیہ کا چلن رہا۔ لیکن جلاوطنی کی شاعری رثائی رنگ میں فلسطینی شعرا سے پہلے ایک رجحان کی صورت میں نظر نہیں آتی۔ جلاوطنی کا بڑا تجربہ اہل فلسطین کو ہوا یہی وجہ ہے کہ فلسطین کے شعرا پابلو نرودا کی پیروی میں جلاوطنی پر مشتمل اشعار کہہ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک معتبر نام محمود درویش کا آتا ہے۔

محمود درویش کی محبت اپنے وطن سے حد درجے کی ہے' وطن پر رونا' وطن پر کراہنا محمود درویش کی نشاۃ ثانیہ بن چکا ہے۔ لیکن وہ کس زمین پر روئے جسے وہ اپنا بھی نہیں کہہ سکتے' لاچاری کی حد کر دی' لیکن باوجود اس کے محمود درویش نے وطن کو یقیناً چھوڑا لیکن جسمانی اعتبار سے تو وطن سے دور ہوئے لیکن ذہنی طور پر محمود درویش فلسطین میں رہے اور وطن کی محبت اور وطن سے عشق دل و نگاہ میں بسا کر وطن کی اور بھی بڑھ کر چاہت کرنے لگے۔

فلسطینی جو صدیوں سے فلسطین میں رہائش پذیر تھے' پھر ایک استعماری سازش کے تحت امریکہ اور یورپ کی پشت پناہی میں فلسطین کو صیہونیوں کے حوالے کر دیا۔ فلسطینیوں کو اپنے وطن سے بے دخل کر دیا۔ فلسطینیوں نے نقل مکانی شروع کر دی نتیجے میں ان کی اکثریت بعض علاقوں میں اقلیت میں تبدیل ہو گئی اور اسرائیل کی ناجائز اولاد غالب آتی گئی نتیجے میں ایک کسمپرسی کے عالم میں فلسطینی وطن سے بے وطن ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ محمود درویش نے اپنی شاعری میں جلاوطنی کو بیان کرنے کے لیے اظہار کے ان اسالیب کو استعمال کیے ہیں۔ ا۔ براہ راست جلاوطنی کا اظہاریہ ۲۔ علامتی اظہاریہ۔ ۴۔ ناسٹلجیائی اظہاریہ۔

محمود درویش کی شاعری میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جب انہوں نے ۱۹۷۱ء میں فلسطین چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی تو یہی سننے میں آیا کہ محمود درویش نے فراریت کی راہ اپنائی ہے۔ اس

رد عمل پر محمود درویش نے ان الفاظ میں وضاحت دی کہ میں نے اپنے گم گشتہ وطن سے قریب تر ہونے کے لیے اپنے وطن سے خیر آباد کہہ دیا۔

محمود درویش کی شاعری کی خوبی یہ ہے کہ اس کی شاعری میں اجتماعیت چھلکتی ہے'صرف ایک شخص کی جلاوطنی کی عکاسی ان کی شاعری میں نہیں ملتی بلکہ ان کی شاعری میں اہل فلسطین کے ملک بدر ہونے کی باتیں پورے سلیقہ مندی سے ملتی ہیں۔

محمود درویش نے جلاوطنی کے دوران اپنے گزرنے والے ہر کرب کی جزئیات میں جاکر شاعری کی ہے۔عام طور پر جب کوئی اپنے عزیزوں سے کہیں دور کہیں چلاجاتا ہے تو فطری طور پر اپنے عزیزو اقارب کی بڑی یاد آرہی ہوتی ہے'ان یادوں کو کوئی نہیں روک سکتا'شاعر پھر اپنی قلبی تسکین کے لیے اپنے دکھ'درد اور غم کو الفاظ کے قالب میں ڈال دیتا ہے۔ محمود درویش نے بھی اپنی دھرتی کوماں کے لقب سے نوازا اور ماں کے نام جلاوطن کا خط شعری قالب میں تحریر کیا'جس کو پڑھتے ہوئے ہر جلاوطن شخص اپنا ذاتی تجربہ محسوس کرتا ہے'یہی چیز محمود درویش کی شاعری کو آفاقیت سے نوازتی ہے۔

جس شخص کو اپنی جائیداد سے محروم رکھا جسے ابتدا میں شناختی کارڈ سے بھی محروم رکھا گیا ہو'جس کی زندگی پناہ گزینی سے عبارت ہو'اس شخص کے پاس محرومی کے سوا کچھ اور چیز کہاں سے برآمد ہوگی۔یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھار محمود درویش پر اداسی چھاجاتی ہے اور محرومی کی کتاب کھولنے بیٹھ جاتے ہیں۔

محمود درویش فلسطین کے عاشق ہیں'ایک محبوب کی طرح فلسطین کا چاہاہے'فلسطین کو بنانے میں کی دھن میں لگے رہے'فلسطین سے فرقت کے داغ سینے میں اٹھائے رکھے'فلسطین کے حصول کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھائی'فلسطین کو تلاشتے رہے۔ فلسطین کو صیہونی ہنکائے لے جارہے ہیں'محمود درویش فلسطین کو تھامے رکھنے کی کوشش میں نظر آتے ہیں'لیکن اسرائیلی ہتھکنڈوں کے پیچھے دنیاکی بڑی بڑی طاقتیں کار فرماہونے کی وجہ سے فلسطین 'محمود درویش سمیت فلسطینیوں سے کہیں دور جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے'فلسطینیوں کو فلسطین اجنبی محسوس ہونے لگے'اس سے بڑھ کر عذاب کیا ہو سکتا ہے جو اپنی زمین کو اپنی نہ کہہ سکے۔ جس کے وطن کو دھکیلا جارہا ہو'جس کے وطن کو زندان میں ڈالا جارہا ہو'جس کے وطن کو جلاوطن کیا جارہا ہو اس وطن کے باسیوں پر کیا گزرتا ہوگا۔انہیں تجربات کو مشاہدات کے بہترین عکاسی کرنے کا ہنر محمود درویش ہی جانتے ہیں۔

محمود درویش کی جلاوطنی سے متعلق نظمیں ایک طرح کی نہیں ہیں۔ کچھ تو سادہ اور بیانیہ ہیں، جن میں فلسطین سے عربوں کی بے دخلی، ان کی ماؤں کی بے حرمتی، ان کے گھروں، ان کے بچوں اور جوانوں کا خون کرنے جیسے واقعات پر دکھ کا اظہار کیا گیا ہے، مگر بعض نظمیں 'علامتی' بھی ہیں۔

وطن کو یاد کرتے کرتے محمود درویش پر ناسٹلجیائی کیفیات بھی طاری ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنے بچپنے کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ جہاں انہیں ماں کے ہاتھ کی پکی روٹی'' کافی'' اوا خاص کر ماں کی محبت بھرا لمس میسر تھا ان لمحات میں محمود درویش اپنے آپ کو دوبارہ لے جانے کے خواہاں ہیں۔

محمود درویش کی شاعری میں بے گھری کا مرثیہ بھی دیدنی ہے۔ بچپنے سے ہی بے گھری کا داغ سینے میں لیا'یوں ساری زندگی گھر کے لیے ترستے رہے' وطن کی خوشبو سونگھنے کو نہیں ملی' دل مسلسل بے چین رہا گھر صرف خواب بنا رہا حقیقت کا روپ دھارنے سے رہ گیا۔

فیض احمد فیض کی شاعری میں جلاوطنی کی کیفیات "مرے دل مرے مسافر" میں نمایاں طور پر سامنے آئی ہیں۔ فیض احمد فیض عشق مجازی کو لے کر اپنی شاعری کا آغاز کرتے ہیں بعد ازاں فیض غم جاناں کی بہ نسبت غم روزگار کو دلفیب پاتے ہیں تو مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ "کا مثردہ سناتے ہیں بالآخر فیض کا محبوب وطن ٹھہرتا ہے یوں فیض وطن کو "لیلائے وطن" کے گن گانا شروع کرتے ہیں

فیض احمد فیض کی زندگی کے کئی سال مارشل لاء کے زیر اثر قید و بند کی صعوبتوں میں گزرے۔ جب فیض پر عرصہ حیات کو مزید تنگ کیا گیا تو فیض تاب نہ لاتے ہوئے جلاوطن ہونے پر مجبور ہوا۔ یوں کئی سال جلاوطنی میں گزار دیئے۔

فیض کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فیض کی جلاوطنی کی شاعری ان دو جہات کو متضمن ہے ا۔ اپنے ملک میں جلاوطنی ۲۔ خود ساختہ جلاوطنی

آمریت کا اتنا پہرہ تھا کہ فیض اپنے ملک میں ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتے تھے۔ فیض کو آزادی سے آزاد فضا میں سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔ یوں ایک اضطراب کی کیفیت برقرار رہی۔ گویا فیض اپنے وطن میں بے وطن ٹھہرے۔ فیض جلاوطنی کی شاعری کا ایک معتدبہ حصہ خود ساختہ جلاوطنی پر مشتمل ہے۔ فیض نے دو دفعہ جلاوطنی اختیار کی، اور ہر بار ہر دم وطن کی یاد میں مگن رہے۔ اور وطن میں تبدیلی کو ترستے رہے۔ امید کا دامن پکڑتے رہے۔

فیض احمد فیض کے مقابلے میں محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی کی کیفیات واضح ترین اسلوب میں درآئی ہیں۔ کیونکہ فیض کے مقابلے میں محمود درویش کو بچپنے میں ہی جلاوطن ہونا پڑا۔ اور یہ جلاوطنی کی کیفیات ساری عمر جاری وساری رہی۔ کبھی جیل میں بند رکھا تو کبھی نظر بند 'تو کبھی جلاوطن الغرض محمود درویش کی ساری زندگی جلاوطنی میں گزر گئی اپنی زندگی کے چھ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد دوبارہ آبائی گاؤں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ جلاوطنی اور پناہ گزینی میں زندگی کا اختتام ہوا۔ یوں دو گز زمین بھی نے ملی کوئے یار میں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا ہر دوسرا مصرعہ جلاوطنی کا مرثیہ نظر آتا ہے۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی جلاوطنی کے دوران کی گئی شاعری میں ناسٹلجیائی کیفیات بھی ملتی ہیں۔

ان دونوں کی شاعری میں وطن کو بہتر دیکھنے کی خواہش اور امنگ ملتی ہے۔ فیض احمد فیض آمریت کا خاتمہ چاہتے ہیں جبکہ محمود درویش جلاوطنی کی وجہ بار بار آنے والی حالت نزع سے امان کے طالب ہیں۔ الغرض وطن سے محبت دونوں کے ہاں آب وتاب کے ساتھ چھلکتی ہے۔ البتہ محمود کو وہ وطن میسر نہیں آیا ادھر فیض کا وطن بھی آمریت کے آہنی ہاتھوں میں یرغمال بنا رہا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد سفیر اعوان، ڈاکٹر، فیض، انقلاب اور مابعد نو آبادیاتی مطالعہ، مشمولہ: معیار، جنوری تا جون ۲۰۱۳ء، اسلامک انٹر نیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد، شعبہ اردو ص ۵۰۷

۲۔ فتح محمد ملک، فیض شاعری اور سیاست، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۲، ۱۵۳

۳۔ فتح محمد ملک، فیض سیاست اور شاعری، ص ۱۵۴

۴۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے، جنگ پبلشرز، لاہور، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۶۱

۵۔ Lib.bazmeurdu.net ۷ مارچ ۲۰۱۹ء، 5:30am

۶۔ فتح محمد ملک، فیض سیاست اور شاعری، ص ۱۵۲، ۱۵۳

۷۔ محولہ بالا ص ۱۵۴

۸۔ فیض احمد فیض، دست تہہ سنگ، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۶۹

۹۔ محولہ بالا، ص ۹۳

۱۰۔ ذاکر حسین، ڈاکٹر، طاہر تونسوی، ڈاکٹر، مرتبین، اردو شاعری کا صدر دروازہ: فیض احمد فیض، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، ص ۱۰۸، ۱۰۹

۱۱۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۰

۱۲۔ محولہ بالا، ص ۱۲۰

۱۳۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص ۳۴

۱۴۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے، ص ۱۶۱

۱۵۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، فیض کی تخلیقی شخصیت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۸۳

۱۶۔ Awadhnama جولائی ۲۰۱۹ء، 2:30pm

۱۷۔ محمد فتح ملک، فیض سیاست اور شاعری، ص ۱۴۸

۱۹۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، بیاد صحبت نازک خیالاں، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۳۷

۲۰۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، غبار ایام، ص ۳۲

۲۱۔ محولہ بالا، ص ۲۳

۲۲۔ قمر رئیس، فیض کی غزل، مشمولہ فیض فہمی، دی ریکونز پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۵۰۲

۲۳۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے، ص۱۶۱

۲۴۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، فیض کی تخلیقی شخصیت، ص۲۸۳

۲۵۔ اشفاق حسین، حبیب عنبر دست، ص۱۶۵

۲۶۔ قمر رئیس، فیض کی غزل، مشمولہ فیض فہمی، ص۵۰۲

۲۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا

۲۸۔ محمد سفیر اعوان، ڈاکٹر، فیض، انقلاب اور نو آبادیاتی نظریہ، مشمولہ: معیار، ص۵۰۷

۲۹۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، فیض کی تخلیقی شخصیت، ص۲۸۴

۳۰۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا

۳۱۔ محوالہ بالا

۳۲۔ محوالہ بالا

۳۳۔ محوالہ بالا

۳۴۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے، ص۱۵۰

۳۵۔ فتح محمد ملک، فیض سیاست اور شاعری، ۱۴۸، ۱۴۹

۳۶ Lib.bazmeurdu.net۔ ۹ مارچ, ۲۰۱۹ء، 5:30am

۳۷۔ فتح محمد ملک، فیض سیاست اور شاعری، ص۱۴۸

۳۸۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، ص۸۲

۳۹۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا

۴۰۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے،، ص،، ۱۶۳

۴۱۔ محولہ بالا ص ۱۶۲، ۱۶۳

۴۲۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا،

۴۳۔ زبان و ادب، شمارہ ۹۔ دسمبر ۲۰۱۱، ص۴۴

۴۴۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص۳۴

۴۵۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے،، ص۹۱

۴۶۔ محوالہ بالا، ص۴۹۴

۴۷۔ نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص۸

۴۸۔ محولہ بالا

۵۰۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، بیادِ صحبت نازک خیالاں، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص۳۷

۵۱۔ فیض بنام افتخار عارف، ڈاکٹر راشد حمید، (تحقیق و ترتیب)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۲۰۷

۵۲۔ فتح محمد ملک، فیض سیاست اور شاعری، ص۷۸

۵۳۔ فیض احمد فیض، دست تہہ سنگ، ص۷۷

۵۴۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، نظم: فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے، ص۶۳۵

۵۵۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے،، ص۱۷۲

۵۶۔ محولہ بالا، ص۱۶۱

۵۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص۴۱۸

۵۸۔ محولہ بالا

۵۹۔ محولہ بالا، ص۴۸

۶۰۔ محولہ بالا، غبار ایام، ص۱۰

۶۱۔ محوالہ بالا، مرے دل مرے مسافر، ص۵۹

۶۲۔ محوالہ بالا غبار ایام، ص۲۳

۶۳۔ طاہر تونسوی، فیض کی تخلیقی شخصیت، ص۲۸۹

۶۴۔ فیض احمد فیض، شام شہریاراں، مکتبہ کارواں، لاہور، س ن، ص۱۲۶

۶۵۔ طاہر تونسوی، فیض کی تخلیقی شخصیت، ص۲۸۸

۶۶۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، غبار ایام، ص۳۳

۶۷۔ محولہ بالا

۶۸۔ محولہ بالا، ص۴۶

۶۹۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے، ص۳۵۷

۷۰۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص۸

۷۱۔ سحر انصاری، فیض کے آس پاس، پاکستان سٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، اگست ۲۰۱۱ء ص۱۳۶

۷۲۔ محولہ بالا، ص۱۳۶

۷۳۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے، ص۷۵۳

۷۴۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص

۷۵۔ اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے، ص۷۵۳، ۷۵۴

۷۶۔ محوالہ بالا، ص۷۵۳، ۷۵۴

۷۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص۳۶۶

۷۸۔ حسن مجیدی، الخصائص الفنی فی شعر درویش، ۲۰۱۱ء، ص۸

۷۹۔ فلسطین کے چار ممتاز شعراء، ص۱۳۰

۸۰۔ حسن مجیدی، الخصائص الفنیہ فی شعر درویش، ص۱۱

5:30am،،ء۲۰۱۹، جنوری۲۰۱۹۲www.dw.com

۸۲۔ . محمود درویش، سریر الغریبۃ، مؤسہ محمود درویش، دارالناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ، ص۶۱

۸۳۔ منو بھائی، مترجم: فلسطین فلسطین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۴ء، ص۱۵

۸۴۔ محولہ بالا، ص۱۴

۸۵۔ دنیازاد، کتاب ۲۳، شہرزاد، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۸، ص۲۵۸

۸۶۔ ایڈورڈ سعید، میں اور میرا فلسطین، مترجم: محمد یحیٰ خان، نگارشات، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۱۴۱

۸۷,۲۵۶, pp. ۱, No. ۴, Vol. ۲۰۱۶International Journal of Language and Literature June

۸۸۔ محمود درویش، آخر اللیل، مؤسہ محمود درویش، دارالناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ، ص۷۷

۸۹۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین ص۷۸، ۸۱

۹۰۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، قوسین، لاہور، طبع اول، ۲۰۱۵، ص۱۰۴

۹۱۔ محولہ بالا، ص۳۲

۹۲۔ آصف فرخی، مترجم: نظم (عدو) مشمولہ: دنیازاد، کراچی، کتاب ۷، ستمبر، ۲۰۰۲ء

۹۳۔ محولہ بالا، ص۲۶۶

۹۴۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش میں، ۱۰۵

۹۵۔ انور زاہدی، مترجم، مشمولہ: دستاویز، جلد اول، شمارہ ۱، اکتوبر، دسمبر، ۱۹۸۹ء

۹۶۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین، ص۱۸۸

۹۷۔ فتح محمد ملک، فلسطین اردو ادب میں، مشمولہ: مقبوضہ فلسطین کا ادب المقاومۃ: ڈاکٹر اسماء رشید، سنگ میل لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۲۲

۹۸۔ ۱۹۸۸Pdfاوراق الزیتون، https://foulabook،۹مارچ ۲۰۱۹ء، 5:30am

۹۹۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین، ص۴۶

۱۰۰۔ رسول بلاوی، دکتر، جایگاہ آوار گان فلسطینی در شعر محمود درویش، دانشگاہ کردستان، ۱۳۹۲ھ، ص۸

۱۰۱۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین ص۴۳

۱۰۲۔ حسن مجیدی، الخصائص الفنیہ فی شعر درویش، ص۱۶

۱۰۳۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین، ص۴۷

۱۰۴۔ htt//weekly.ahram.org ۴جون ۲۰۱۹ء، 4:29pm

۱۰۵۔ محمود درویش، اورا الزیتون، ص۲۴

۱۰۶۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص۳۶

۱۰۷۔ محولہ بالا، ص۱۶۵

۱۰۸۔ سید سجاد، مترجم، مشمولہ: دانشور، ص۴۷، ۴۸

۱۰۹۔ محمود درویش، الاعمال الاولی، اوراق الزیتون، رباعیات، ص۷۱

۱۱۰۔ روبینہ الماس، اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۱۲ء ص۱۲۰

۱۱۰۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص۳۶

۱۱۱۔ محولہ بالا، ص۵۴

۱۱۲۔ محولہ بالا، ص۲۰۵

۱۱۳۔ عبداللہ الازہری، مترجم، سعادت سعید، مشمولہ: محمود درویش: ایک تعارف مشمولہ: دانشور، شمارہ۶، ۱۹۹۰ء، ص۲۴

۱۱۴۔ محولہ بالا

۱۱۵۔ دنیازاد، اکتوبر، ۲۰۰۸، ص۲۷۳

۱۱۶۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین ص۴۳

۱۱۷۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین، ص۲۶۲

۱۱۸۔ آصف فرخی، محمود درویش، "لمبے سائے کی مدح میں" مشمولہ دنیازاد (عاشق من فلسطین)، ص ۱۲۳

۱۱۹۔ آصف فرخی، شہزاد، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵۰

۱۱۹۔ غزالہ شفیق، اردوناول میں ناسٹلجیا: قیام پاکستان کے بعد، مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، شعبہ اردو، ۲۰۱۳ء، ص ۵

۱۲۰۔ احمد رضا، دراسات المعاصر الادب، مشمولہ دراسۃ النوستالوجیہ وتجلیاتہ فی اشعار محمود درویش، ۱۳۹۵ء ص ۱۲۵

۱۲۱۔ انیس ناگی، ریت اور دوسری نظمیں، دانشور، شمارہ ۶، ص ۲۹

۱۲۲۔ روبینہ الماس، اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۷

۱۲۳۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۱۴۶

۱۲۴۔ محمود درویش، عاشق من فلسطین، ۱۹۶۶، ص ۱۶

۱۲۵۔ منوبھائی، فلسطین فلسطین، ص ۶۷

۱۲۶۔ محمود درویش، اوراق الزیتون، رباعیات، ص ۴۱

۱۲۷۔ منوبھائی، فلسطین فلسطین

۱۲۸۔ محمود درویش، محاولہ رقم ۷، مؤسسہ محمود درویش، دارالناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ،

۱۲۹۔ امجد اسلام امجد، عکس، ص ۴۹

pu.edu.pk۷ ۱۳۰ مارچ ۲۰۱۹ء 4:30pm

۱۳۱۔ اجمل کمال، مترجم: محاصرہ (محمود درویش کی ایک طویل نظم)، آج، ادبی کتابی سلسلہ، شمارہ ۴۷، کراچی، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۵۶

۱۳۲۔ محولہ بالا

۱۳۳۔ محمود درویش، اعمال الکاملہ، ۳۳۵

۱۳۴۔ انیس ناگی، ریت اور دوسری نظمیں مشمولہ: دانشور، سہ ماہی ادبی رسالہ: محمود درویش، ص ۳۰، ۳۱

۱۳۵۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۱۳۳

۱۳۶۔ محولہ بالا، ص ۱۴۴

۱۳۷۔ منوبھائی، فلسطین فلسطین، ص ۸۲، ۸۳

۱۳۸۔ www.aikrozan.com ۱ جولائی ۲۰۱۸، 2:30pm

۱۴۰۔ عبد الحق حقانی القاسمی، فلسطین کے چار ممتاز شعراء، تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی ۱۹۹۵ء، ص ۲۰

۱۴۱۔ محمد کاظم، عربی ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۴۸۷

۱۴۲۔ محمد کاظم، عربی ادب کی تاریخ، ص ۴۸۷

۱۴۳۔ فارق احسن، مترجم محمود درویش اپنی زمین کی تلاش میں، ص ۱۰۴

باب چہارم

فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت کا تقابل:

الف: فیض کی شاعری میں بیگانگیت اوراس کی جہات:

ترقی پسند تحریک کے لکھاریوں کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل ہواوریوں ہر فرد کوانفرادی اوراجتماعی سطح پر آزادی ملےلیکن جب انگریزوں سے توآزادی مل گئی مگر استحصال'جبر اور طبقاتی نظام کا نہ ختم ہونے والاسلسلہ برابر چلتا رہافیض احمد فیض بھی آزادی کو"داغ داغ اجالا"اور"شب گزیدہ سحر"جیسے تراکیب سے یاد کرتے رہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر شاہین مفتی کا کہنا ہے کہ: نقش فریادی'زنداں نامہ'دست تہہ سنگ'شام شہریاراں اور مرے دل مرے مسافر کے عنوانات غم ناکی'قیدوبند کے جبر'انسانوں کے بنتے بگڑتے رشتوں اوران کی معدوم ہوتی توقعات اور شاعر کی ازلی وابدی تنہائی کے آئینہ دار ہیں [۱]

فیض کا سلسلہ وجودیت انسان دوستی سے جڑا ہوا ہے۔بحیثیت فرد وہ زندگی اورزمانے کے جبر سے علیحدہ نہیں ہوسکے۔اسی لیے ان کے ہاں اہل درد'درد شب ہجراں'کڑادرد'درد کا شجر'دامن درد'اہل درد'شعلہ درد'ووفوردرد کے ساتھ ساتھ سیہ رات'تاریک راہ'قلب ہجراں'تاریک شگاف'رات کا گرم لہو'شب تارکارنگ'نیم تاریک راہیں جیسی تراکیب بھی ملتی ہیں۔جن سے اندازہ ہوتا ہے کی زندگی کی تنہائی اور محرومی کے باوجود شاعر زندہ رہنے کے عمل سے دست کش نہیں ہوناچاہتا محروم انسان کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

نہ کوئی جادہ'نہ کوئی منزل
کسی مسافر کواب دماغ سفر نہیں ہے
یہ وقت زنجیر روزوشب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے [۲]

فیض کے فرد اوراجتماع کے تصورات سے پاکستان کے ابتدائی دنوں کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔یہاں ہم ایک ایسی صداقت دیکھتے ہیں جوزندگی کی لایعنیت کواجتماع کے پس منظر میں دیکھ کر یہ تسکین پاتی ہے کہ ڈوبنے

والے'تباہ ہونے والے بہت سے ہیں۔ ان میں اگر ایک "میں" بھی ہوں تو کیا ہے۔ بس یہی لمحہ ہے جہاں ایک الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش شاعر کا ہاتھ پکڑتی ہے چنانچہ فیض کا کہنا ہے:

عرصہ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے (۳)

ان کی کئی نظموں میں بھی مختلف کیفیات مثلاً درد' محرومی' اجنبیت' بر گشتگی اور تنہائی کا اظہار ملتا ہے۔ ان میں یاس' تنہائی' ہم لوگ' شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں' ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' قابل ذکر ہیں۔

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو (۴)

یہ نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" اس پسے ہوئے انسان کی استعاراتی انداز میں سر گذشت ہے۔ جو زمانے کے ظلم وجور کے سیل رواں اور تھپیڑوں کی زد میں ہے۔ یہاں فیض نے اس تھکے ہارے اور مظلوم اانسان کو کانچ کے مانند کر دیا ہے۔ جس پر چاروں طرف سے استحصال اور جبر کے پتھروں کی بارش ہو رہی ہے۔

فیض کی ایک غزل بہت مشہور ہو گئی جسے انہوں نے ڈھاکہ سے واپسی پر لکھی۔ اس غزل کا آغاز ہی بیگانگیت سے ہوتا ہے۔ فیض ان الفاظ میں غزل سنا رہے ہیں:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختم دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
اُن سے جو کہنے گئے تھے 'فیض جاں صدقہ کیے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد (۵)

کلیات میں اس غزل کا عنوان "ڈھاکہ سے واپسی پر" ہے۔ ڈھاکہ ۷۴ء سے پہلے والا ڈھاکہ نہیں اور ۷۲ء سے پہلے والا بھی نہیں، یہ ڈھاکہ بنگلا دیش کا ڈھاکہ ہے۔ اس غزل کا پس منظر کچھ اس طرح سے ہے کہ فیض سن چوہتر میں ذوالفقار کی بھٹو کی قیادت میں سرکاری وفد کے ہمراہ ڈھاکہ گئے۔ جہاں ایک ملک کے رہنے والے ایک دوسرے اجنبی کی طرح ملاقات کر رہے تھے' یہ پہلا موقع تھا جہاں ایک پاکستانی وزیر اعظم کا استقبال کیا جا رہا تھا۔ گو کہ اب ملک دو حصوں میں بٹ چکا تھا' بنگلہ دیش کی صورت میں نیا ملک دنیا کے نقشہ پر آ چکا تھا' ان تمام صورتحال کو فیض نے ایک اجنبی کی طرح ملاحظہ کیا۔ وہ فیض جس نے پاکستان بنتے بھی دیکھا اور ٹوٹتے بھی دیکھا جہاں امید بھر نہیں کی کیفیت پیدا ہوئی' کچھ بات بنائے نہ بنی تو فیض نے اسی تجربے کو الفاظ کے قالب میں ڈالا تو ایک غزل کشید ہوئی۔ جو ڈھاکہ کے پس منظر اور پیش منظر کی معمولی سی جھلک دکھاتی ہے۔

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

یہ غزل کا دوسرا شعر ہے' اس شعر میں ملٹری آپریشن کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ ملاقات میں یہ بحث بھی چھڑ گئی ہو' اور دوران گفتگو یہ سوالات بھی اٹھے ہوں گے کہ بے داغ سبزے کی بہار کب ممکن ہے؟ خون کی ہولی جو کھیلی گئی ان کے دھبے آخر کب دھلیں گے۔ عجب نہیں ان سوالات کے جوابات نہ بن پائے ہوں تو ایک دوسرے سے اجنبیت' ملاقات کے باوجود بھی بڑھ گئی ہو۔

تیسرے شعر میں ناکامی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ جہاں فیض نے اسے مہرباں راتوں کے بعد بے سبب صبحوں کے نزول سے تشبیہ دی۔ چوتھے میں فیض شکست دل کا اعلان کر بیٹھتے ہیں جہاں راز و نیاز کی باتیں کرنے کی توفیق نہیں ہوئی' مقطع میں فیض کھل کر یہ اظہار کر رہے ہیں کہ جو بات ہم کہنے گئے تھے وہ ہم کرنے میں قاصر رہے وہ بات ہم نہیں کر سکے

تیسرے شعر میں مہربان راتوں کے بعد بے جہ صبحوں کا نزول اسی ناکامی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جوتھے شعر میں یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ جس کے پہلے مصرع ہی میں شکست دل کا اعلان کیا گیا ہے، اور مقطع میں تو بالکل کھل کر فیض نے یہ بتادیا کہ جو باتیں کہنی تھی وہی ان کہی رہ گئیں۔ گلے شکوے 'تلخ کلامیاں اور لفظی جنگ تو بہت ہوئی لیکن سب باتوں کے بعد جو کہنے گئے تھے وہ اَن کہی رہ گئی۔ اس غزل میں ایک تسلسل ہے جس کے پہلے شعر پر دوسرے تمام اشعار کی عمارت کھڑی ہے۔ لہذا یہ غزل اجنبیت کے ایک پہلو کو بیان کر رہی ہے۔ یعنی پاکستان بننے کے بعد ڈھاکہ بھی پاکستان کا حصہ تھا' دشمنوں کی سازش اور اپنوں کی نالائقی کی وجہ سے پاکستان کا دایاں بازو جدا ہو گیا۔ جس کی طرف پہلے ہی سفر سے فیض نے اجنبیت محسوس کیا اور اسی اجنبیت کو فیض نے بیان کیا' البتہ واضح رہے یہ اجنبیت 'بیگانگی کی اصطلاحی معنوں میں نہیں' بلکہ یہ اجنبیت اپنے لغوی اعتبار سے در آئی ہے۔ لہذا اس اجنبیت کو سارتر اور کرکیگارڈ کے نظریہ وجودیت سے رشتہ نہیں جوڑ سکتے۔

غزل کے پہلے مصرعے میں جو بیان دیا گیا تھا کہ ہم اجنبی ہیں اس پر اس غزل کی پوری عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ بعد کا ہر شعر، ہر مصرعہ اور لفظ اسی کی وضاحت کرتے ہوئے نظر آتا ہے "فیض کی شاعری کا یہی سب سے بڑا وصف ہے کہ اس میں سیاسی وابستگیوں کو رومانوی وادیوں کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ یعنی اگر اس غزل کے سیاسی تناظرات کو پس پُشت ڈال دیا جائے تو بھی غزل فیض کی کامیاب غزلوں میں شمار کی جائے گی "[۶] فاطمہ حسن لکھتی ہیں:

> "شاعری میں ایک بڑی جہت شاعر کے اپنے وجود کی ہوتی ہے۔ کسی سہ جہتی تصویر کی طرح جس کینوس پر ابھرتی ہے وہ کینوس شاعر کا اپنا باطن ہوتا ہے۔ فیض کی شاعری بڑی شاعری ہے۔ کیونکہ اس میں ان کے وجود کے کینوس پر وہ تمام رنگ ابھر رہے ہیں جو بیک وقت دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ اور کیفیت بھی جگاتے ہیں۔ کیفیت خواہ سرشاری کی ہو، دکھوں کی ہو، رجائیت کی ہو، مایوسی کی ہو اپنے قاری کو حصار میں رکھتی ہے، کیفیت کے اس حصار میں شاعر اس وقت بالکل تنہاء ہوتا ہے۔ جب اسے جھیلتا اور لکھتا ہے "[۷]

فیض کی تنہائی پر ان کی ایک نظم "تنہائی" کے نام سے بڑی جانی پہچانی ہے۔ جہاں فیض کو کوئی دلی محبت ورفاقت رکھنے والا میسر نہیں آتا' ہر ایک کو راہ رو فرض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کہیں دور چلا جائے گا' راتیں بھی ختم ہو جائیں گی' رہگزر بھی خواب غفلت سو جائیں گے' اپنے کواڑوں کو مقفل کر اب انتظار بے فائدہ ہے' اب اجنبیت کی گھٹا چھائی ہے' اب تنہائی کا عالم ہو گا' اور سنو کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا' اس حوالے سے فیض اپنی نظم "تنہائی" میں لکھتے ہیں:

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات 'بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک رہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں 'بڑھادو مے و مینہ و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں 'کوئی نہیں آئے گا(۸)

یہ فیض احمد فیض مشہور نظم "تنہائی" کے کچھ اشعار ہیں۔فیض احمد فیض جب آمریت کو عروج پر دیکھتے ہیں تو ایک بیگانگی کی کیفیت ان کے ذہن وفکر پر غالب آجاتی ہے۔اور فیض کہہ اٹھتے ہیں کہ اب کوئی خضرراہ نہیں آئے گا'اب سحر نہیں آئے گی شام کا سماں رہے گا'اب تاریکی یقینی ہے لہذا کواڑوں کو مقفل رکھو۔اپنی ایک نظم "ہم لوگ" میں لکھتے ہیں۔

دل کے ایواں میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہتے ہوئے اکتائے ہوئے
حسن محبوب کے سیال تصور کی طرح
اپنی تاریک کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے(۹)
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی رات چلے
جس گھڑی ماتمی سنساں سیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل میرے دلدار میرے پاس رہو(۱۰)

ان اشعار میں فیض فرمارہے ہیں کہ اب خضر راہ کا انتظار بے سود ہے'جو ہونا تھا وہ ہو چکا'اب مارشل لاء اپنی جوانی کے دن گزار رہے ہیں'اب کسی میں ہمت نہیں ہو گی کہ جو مارشل لاء کے حصار کو توڑ سکے اب امیدیں خاک میں دفن ہو چکی ہیں۔اب ہر جگہ ماتمی سنگت ہو گی جو گریہ کناں رہے گی'کوئی کچھ کرنے کمربستہ بھی ہو جائے تو اب بات نہیں بنے گی اب پانی سر سے جا چکا ہے۔لہذا فیض تنہائی کی پناہ میں جانے میں اپنی بھلائی سمجھتے ہیں۔

فیض کی مشہور نظموں میں سے ایک نظم "بول" ہے۔اس نظم میں فیض کسی حد تک باغیانہ انداز اپناتے ہوئے دھیمے لہجے سے انحراف کیا ہے۔فیض عالمی استعمار' معاشرتی جبر اور پاکستان کی ابتر صورتحال سے بیگانگی کے حصار میں آجاتے ہیں تو مقامی اور بین الاقوامی محکوم و مقہور عوام کو ظلم و جبر کے خلاف آواز اُٹھانے کی تلقین کر رہے ہیں یعنی جب تک مقامی اور عالمی سطح پر اپنی ذات کا اثبات کرتے ہوئے محکوم طبقہ اپنے وجود کا احساس نہیں دلائیں گے'سرمایہ داری کی وجہ سے بیگانگیت کا بھیانک سایہ مزید طول پکڑے گا اس ضمن میں افتخار بیگ کا کہنا ہے کہ "فیض اپنی نظم "بول" میں ہندوستان کے محکوم عوام سے مخاطب ہیں اس نظم میں "بول کا لفظ اپنی ذات کے اثبات کے اظہار کا مظہر ہے۔یہ نظم فرد کی موضوعی جہد حریت کی غماز ہے(۱۱)

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے(۱۲)

ان کی نظم "دل من مسافر من" کے بہت سے پہلو ہیں لیکن روسی مصنفہ لدمیلا نے اسے ایک اور ہی زاویہ سے پرکھا ہے۔انہوں نے لکھا"اس نظم میں ایک اور اہم موضوع تنہائی کا بھی ہے۔اس سلسلہ میں فیض کی ساری نظمیں اور اشعار یاد آتے ہیں۔سب سے پہلے نقش فریادی کی تنہائی، پھر کوئی آیا دل زار۔اس میں بھی گفتگو کی شکل میں خود کلامی پیش کی گئی ہے لیکن اس بار تنہائی کی قطعی دوسری کیفیت ہے۔یہ گھر کی چاردیواری میں بند انتظار کرنے والے کردار کی تنہائی نہیں بلکہ ہجوم میں اور آباد شہروں میں بھٹکنے والے انسان کی جان لیوا تنہائی ہے(۱۳)" دل من مسافر من" کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر

کہ وطن بدر رہوں ہم تم۔۔
ہر ایک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سر کوئے ناشناسیاں۔۔
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا!(۱۴)

فیض احمد فیض نے کہنے کو تو بعد میں رومانویت سے انقلاب کی طرف رخ پھیرا ہے لیکن ان کی شاعری کا گہرا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فیض نے رومانویت کی نغمگی اور جمال سے ہی انقلاب کے نعرے الاپے ہیں۔ لیکن مقامی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ نہ دینے اور ترقی پسند تحریک پر پابندیوں کی وجہ سے فیض بیگانگی کی پناہ میں چلے گئے اور ماضی بھی انہیں تاریک نظر آئی تو مستقبل کی بھی انہیں امید افزا شکل دکھائی نہیں دی' تو فیض کہیں اور سے دل لگی کا سوچتے نظر آتے ہیں۔ فیض احمد فیض اپنی ایک نظم "ہم لوگ" میں لکھتے ہیں:

دل کے ایوان میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار
نور خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حسن محبوب کے سیال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے
غایت سود وزیاں' صورت آغاز و مآل
وہی بے سود تجسس' وہی بے کار سوال
چلو فیض پھر سے کہیں دل لگائیں
سنا ہے ٹھکانے کے دن آ رہے ہیں(۱۵)

فیض احمد فیض آمریت'طبقاتی استحصال اور سماجی عدل وانصاف کے قتل عام کامشاہدہ کرتے ہیں تو ان کے دل میں بیگانگیت کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے'نتیجے میں انہیں ہر جگہ 'انتظار' غم روز گار'طوق داراور جبر کے موسم نظر آتے ہیں اگر نہیں ہے تو بہار، اختیاراور چمن کے نکھار کے موسم نہیں۔جیسا کہ اپنی ایک نظم "طوق ودار کا موسم" میں فیض کا کہنا ہے کہ

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم'بہار کا موسم
گراں ہے دل پہ غم روز گار کا موسم
ہے آزمائش حسن نگار کا موسم۔۔
یہی جنوں کا'یہی طوق ودار کا موسم
یہی ہے جبر'یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے'تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم (١٦)

فیض احمد فیض بڑے اشتراکی فکر کے مالک انسان تھے انہوں نے اپنے نظریے سے انحراف نہیں کیااوراپنے نظریے پر ڈٹے رہے'لیکن ذاتی مفادات رکھنے والے ٹولے کی بدنیتی سے فیض کے خواب پورے نہیں ہوئے'پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو شہید کئے گئے'اور سیاست ایک خاندان کی جھولی میں گھومنے لگی تو آگے جا کر مارشل لاؤں کا نہ تھمنے والی کالی گھٹاؤں سلسلہ چلتا رہا'تو پاکستان سے وابستہ امیدیں خاک میں مل گئیں۔اس سے پہل تقسیم کے نتیجے میں دوران ہجرت لاکھوں لوگ لقمہ اجل ہو گئے'عصمتیں لوٹی گئیں'ایک خزاں اوراجنبیت کا موسم پورے ملک پر چھایا رہا" ایک استفسار پر فیض نے بتایا پہلے دور میں'میں نے "صبح آزادی" کے نام سے جو نظم لکھی اس میں دو کیفیتوں کی ترجمانی مقصود تھی۔یعنی ایک طرف امید اور عزم اور دوسری طرف جو واقعات تھے ان سے بے اطمینانی"(١٧) اپنی ایک نظم "یاس" میں فیض کا کہنا ہے کہ:

بربط دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصہ ہائے فکر وعمل!

بزم ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیف کوثر و تسنیم
زحمت گریہ و بکا بے سود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے باب قبول[۱۸]

فیض احمد فیض ابتدا میں رومانویت کی طرف مائل تھے' لیکن جب انہوں نے شعور کے مدارج طے کیا تو محبوب مجازی سے یکسر بیگانہ ہوئے اور اسے ایک طرح سے بھلا دیئے اور یوں پہلی سی ملاقات نہ مانگنے کا تقاضا بھی کیا اور غم روز گار کو غم جاناں پر جب ترجیح دی تو لا محالہ محبوب مجازی کی نسبت ایک مغائرت آڑے آگئی اور اس سے کسی حد تک بیگانہ قرار پائے۔ جیسا کہ فیض کا کہنا ہے کہ

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روز گار کے[۱۹]

فیض احمد فیض کی شاعری میں ذاتی بیگانگیت کم اور اجتماعی بیگانگیت کچھ زیادہ نظر آتی ہے کیونکہ فیض کی شاعری صرف اپنی ذات تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ فیض ایک عوامی اور انسانی درد رکھنے والے شاعر ہیں۔ فیض احمد فیض کی اپنی زندگی بھی غور کیا جائے تو بیگانگیت کی مرقع ہے' کبھی جیل میں تو کبھی دیار غیر میں کبھی عشق مجازی میں اجنبیت کا احساس تو کبھی سقوط ڈھاکہ کی وجہ سے اجنیت کا کربناک احساس' گو کہ فیض کی ذات' اجتماعی فضا اور پھر اس کی ترجمانی میں فیض کی شاعری کا معتدبہ حصہ بیگانگی پر مشتمل ہے۔ اپنی ایک نظم "سوچ" میں لکھتے ہیں:

کیوں میرا دل شاد نہیں ہے
کیوں خاموش رہا کرتا ہوں
چھوڑو میری رام کہانی
میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں
میرا دل غمگیں ہے تو کیا
غمگیں یہ دنیا ہے ساری
یہ دکھ تیرا ہے نہ میرا

ہم سب کی جاگیر ہے[۲۰]

فیض اپنے سماج کو بھوک وافلاس کی فراوانی نظر آتی ہے'تو دوسری طرف آہنی دیواریں بھی دکھائی دیتی ہیں'جن میں کئی چراغ گل ہوئے'نتیجے میں اجتماعی بیگانگیت کی فضا نمودار ہو گئی۔فیض ایک اجتماعی بیگانگیت کی عکاسی ان الفاظ میں کر رہے ہیں:

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا!
کس لیے ان میں فقد بھوک اُگا کرتی ہے
یہ ہر اک سمت پراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ[۲۱]

فیض احمد فیض کو مستقبل میں بھی سیاسی ابتری کا خوف لاحق رہا اوران کا یہی خیال تھا کہ پاکستان ایسے ہی آگے بڑھے جس حالت میں فیض کے دور میں گزر رہا تھا۔ان حالات کی وجہ سے فیض اپنی ایک نظم "شام" میں ان الفاظ کے ساتھ گویا ہوئے:

اس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اجڑا ہوا'بے نور پرانا مندر۔۔
اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہو گا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہو گا

فیض احمد فیض نے قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں۔فیض اپنے ملک اور قوم کے لیے اشتراکی نظام چاہتے تھے اوران کا نظریہ بھی سراسر ترقی پسندی پر مشتمل تھا'جس نہج پر فیض سوچ رہے تھے وہ اور جو پاکستان کی اجتماعی سیاسی فضا بالکل الگ زاویہ پر قائم تھی یہی وجہ بنی کہ فیض پر عدم مطابقیت اور بیگانگیت کا احساس غالب آنے لگا۔نتیجہ میں فیض اجتماعی انصاف اور عدالت کی خاطر مزاحمتی شاعری جاری رکھی اوراپنی بیگانگیت سے باہر آنے کے لیے جدوجہد کو جاری رکھا لیکن فیض کچھ کا کچھ سوچتے رہے اور کچھ اور ہوتے گئے'فیض بیگانگی کے اس دور میں اپنی ذات کے اثبات کے حوالے سے اپنی ایک نظم "مرے درد کو جو زباں ملے" میں لکھتے ہیں:

مرا ادرد نغمہ بے صدا

مری ذات ذرہ بے نشاں

مرے درد کو جو زباں ملے

مجھے اپنا نام و نشان ملے

مری ذات کا جو نشاں ملے

مجھے راز نظم جہاں ملے

جو مجھے یہ راز نہاں ملے

مری خامشی کو بیاں ملے

مجھے کائنات کی سروری

مجھے دولت دو جہاں ملے (۲۲)

کوئی بھی شاعر کچھ لکھتا ہے تو وہ سماج کے لیے لکھتا ہے' خاص کر مزاحمتی شعراسماج کی زیادہ توجہ چاہتے ہیں۔اب سماج میں ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی' جابر بھی ہے مجبور بھی' آمر بھی ہے' مامور بھی' لہذا شاعر دونوں کے لیے شاعری کرتا ہے۔اب منافقانہ رویے کے شاعر ظلم و جبر پر مشتمل دربار وایوان کی تعریف و تمجید میں شاعری کرتے ہیں۔جبکہ ایک متعھد شاعر غریبوں اور مفلسوں کے حق میں آمروں اور جابروں کے خلاف سینہ سپر ہو کر مزاحمتی شاعری کی طرح ڈالتے ہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ معاشرے میں استحصال زدہ لوگ کس حد تک شاعر کا ساتھ دیتے ہیں' صرف شاعر بلبل کی طرح بولتا رہے تو اس بات کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آئے گا' ہاں جب عوام ساتھ دیں اور شاعر کے ہمنوا بن جائیں تو انقلاب کے آنے میں دیر نہیں لگتی۔فیض کی اگر بات کی جائے تو فیض نے بھی مزاحمتی شاعری کی لیکن فیض کا کتنوں نے ساتھ دیا' اور تو اور بہت سے شعرا نے بھی فیض کو تسلی تک نہیں دی بلکہ کنارے سے تماشائی بنے رہے۔اور ملحد و مارکسٹ کے طعنے بھی سننے پڑے۔

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک دشنام

چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت

لہذا فیض کو شکوہ ہے کہ ہم وطنوں نے ساتھ نہیں دیا۔آج اگر دیکھ لیں ظلم کرنے والے اور ظلم سہنے والے اور ظلم کے خلاف بولنے والے سب موت کی آغوش میں سو گئے لیکن فیض شاعری اب بھی زندہ ہے۔کیونکہ تحریر زندہ

رہتی ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ لیکن فیض کو اپنی زندگی میں تنہائی نصیب میں ملی' کبھی جیل میں کبھی لیلائے وطن سے دور' اس تنہائی نے فیض کو بڑا شاعر بنایا۔ جس نے دکھ 'درد کا عرفان حاصل کرتے ہوئے انسانیت کے لیے شاعری کی لیکن فیض کو لوگ نہیں سمجھ پائے 'فیض کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوا 'فیض کو میدان میں تنہا چھوڑ دیا' تنگ آ کر فیض ظلم زدہ معاشرے سے ہی کہیں دور نکل گئے۔ اس بارے میں فاطمہ حسن لکھتی ہے:

" جس گوشہ تنہائی میں وہ شاعر و دانشمند اپنے اردگرد بکھرے دکھ لکھ رہا ہے، وہاں کون ہے؟ اس کی تنہائی کے سوا، فیض نے ساری زندگی یہ تنہائی جھیلی ہے، خواہ وہ عین جوانی میں جیل کی صورت ہو، آخری عمر میں جلاوطنی کی صوت میں یا وطن میں رہتے ہوئے بھی ہم وطنوں کی بے آوازی کی صورت میں۔ وہ گفتگو کرتے بھی تو کن سے؟ جو صرف نعرے لگا سکتے ہیں۔ توصیفی جملے کہہ سکتے تھے۔ اور پھر پلٹ کر جبر کی قوتوں کو سہارا دینے والوں میں جا بیٹھے تھے "[۲۳]

فیض احمد فیض بیگانگی کے ادراک کے بعد اجتماعی اثبات کے خواہاں نظر آتے ہیں' اجتماعی اثبات کے لیے فیض مزاحمت و بغاوت کا درس دیتے ہیں۔ لیکن یہاں پر ان کی بیگانگی سارتر کی دہریت پر مشتمل بیگانگی نہیں' بلکہ ایک ذہنی کرب ہے' جس کی وجہ سے وہ اپنی فکر اور معاشرے میں مطابقت نہیں رکھتا تو بیگانگی طاری ہو گئی۔ اسی بیگانگیت سے باہر آنے کے لیے فیض نے شاعری کو مجاہدہ قرار دے کر مزاحمت کرنی شروع کی 'تاکہ استحصال زدہ عوام کا اثبات ہو سکے" "انہیں (فیض) یقین ہے کہ لوح دل مصفا ہوتے ہی اس پر سے ظل الٰہ کی اطاعت کا صدیوں پرانا نقش محو ہو جائے گا[۲۴]

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی "ہم سا" بھی کہاں ہے[۲۵]
ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

فیض نے اپنی شاعری میں "اپنے لیے "میں "کی بجائے "ہم "کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فیض کی شاعری اپنی ذات تک محدود نہیں' ان کی شاعری مظلوم و مقہور اور بے بس و لاچار عوام کی آواز ہے۔ انہوں نے بیگانگیت کی فضا سے باہر آنے کے لیے شاعری کا سہارا لیا اور معاشرے سے بیگانگیت کا مقابلہ

جدوجہد سے کرنے پر زور دیا۔مذکورہ اشعار میں بھی فیض نے اسی کی طرف اشارہ دیا کہ ہم اپنی بقا کے لیے اور ظلم و جبر کی طاقتوں اور حصار کو توڑنے کے لیے لوح و قلم کی پرورش کرتے رہیں گے۔شاہین مفتی کا کہنا ہے کہ:

"ہم" کی اوٹ میں خاصانِ زمین کی حکمت ستم سے انکار اور مفتی دیں کی تائید ستم کی مصلحت سے انکار کی ہر دو صورتیں آسان ہو جاتی ہیں۔اس اجتماعی اوروجودی احساس سے دراصل فرد کے اندر کے خوف سے انکارواثبات کی دوہری صورت لے کر بر آمد ہوا ہے۔فیض نے جس طرح کے مضمون تراشے ہیں"(۲۶)

فیض احمد فیض معاشرے اور سماج میں بیگانگیت کی فضا پر خاموش نہیں رہے۔بلکہ مزاحمت ومقاومت پر مشتمل بلند پایہ کی شاعری کی'اور کہا کہ سزا وجزا کے لئے قیامت کا انتظار نہ کریں'آمریت ایک شاخ نازک پہ آشیانہ کی مانند ہے'جب محکوم و مقہور عوام ذوق شہادت لے آگے بڑھیں گی'تو پھر ان کو کوئی روکنے والا نہیں ہو گا'وہ دن آمروں کے لیے یوم حساب قرار پائے۔اسی بابت فیض ان الفاظ میں گویا ہوئے ہیں۔

ہر ایک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فرد عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جسم سر فروشاں
پڑیں گے دارورسن کے لالے
کوئی نہ ہو گا کہ جو بچالے
جزا وسزا سب یہیں پہ ہو گی
یہیں عذاب وثواب ہو گا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہو گا(۲۷)

فیض کی شاعری کے کئی مقامات پر فرداوراجتماع دونوں مدغم ہوتے ہیں۔جہاں فیض نے "ہم" اور "میں" کا حسین امتزاج کیا۔یعنی ہر ہر فرد اور ہر سماج و معاشرہ اپنی انفرادی اوراجماعی بیگانگیت کو سمجھتے ہوئے میدان عمل میں ظلم و جبر کے ساتھ مبارزت کریں تو اہل صفامسند پر ہوں

گے'ارضِ خدا کے کعبے سے آمریت کے سارے بت اٹھوائے جائیں گے'پھر انا الحق کا نعرہ بلند ہو گا اور بیگانگیت میں پسی ہوئی خلق خدا راج کرے گی۔

ہم اہل صفا'مر دود حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
جب ارض خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
اٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تو بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تو بھی ہے (۲۸)

فیض کی شاعری میں انسانیت کا درد گہرا ہے۔انہوں نے آزادی اظہار اور محروم طبقے کی آزادی کے لیے آواز بلند کی۔اور یہ کہ ایک انقلابی شاعر کو رجائی شاعر بھی ہونا چاہیئے فیض کی شاعری میں رجائی پہلو بھی نمایاں ہے۔فیض نے مایوسی اور قنوطیت کی شاعری نہیں کی البتہ سماج اور ان کے آپس میں مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے بیگانگی در آئی'پھر بھی فیض نے جدوجہد کے جاری رکھے جانے کے لیے مجاہدین کا حوصلہ بڑھایا۔:

"انہوں نے سماج کی محرومی،بیگانگی اور سرمایہ دارانہ استحصال کو انتہائی شائستگی مگر مضبوط اور واضح انداز میں نہ صرف بے نقاب کیا بلکہ طبقاتی نظام کے خلاف انقلابی لڑائی کی ضرورت پر بھی زور دیا۔شروع سے آخر تک ان کی شاعری آج بھی استحصالی نظام کے خلاف بر سرِ پیکار انقلابیوں کو نیا حوصلہ اور ہمت عطا کرتی ہے (۲۹)

فیض خاک نشینوں،چپ رہنے والوں اور ظلم کے ماتوں کو امید اور حوصلہ دلاتے ہیں کہ انشاءاللہ آزادی کی صبح نمودار ہو گی'لہذا فیض بیگانگیت کی فضا میں یاسیت اور قنوطیت میں پڑے بغیر امید افزا شاعری کرتے نظر آتے ہیں:

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو،وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے،جب تاج اچھالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو،چپ رہنے والو چپ کب تک

کچھ حشر تو ان سے اُٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے (۳۰)

فیض احمد فیض کا شمار اردو کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی شاعری کے موضوعات اور اسالیب میں تنوع ہے' کلاسیکیت اور جدیدیت کا حسین امتزاج بھی ہے' ان کی شاعری میں غم جاناں سے لے کر غم روزگار سے آگے انسانیت کی آواز بھی جلوہ گر ہے۔ فیض احمد فیض نے پابلو نرودا' ناظم حکمت سے جہاں کسب فیض حاصل کیا وہاں مارکسزم سے بھی گلے ملایا۔ فیض نے غالب سے فلسفیانہ رنگ لیا تو اقبال سے بلند آہنگ و فکر بھی اخذ کیا' فیض کی شاعری صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ ایڈورڈ سعید کی نو آبادیاتی فکر کی جھلک بھی ملتی ہے وہاں استعماریت کے پھیلاؤ کے جدید اسالیب کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔

فیض کی شاعری میں مزاحمت و انقلاب' جلاوطنی کی طرح ایک اور موضوع بیگانگیت کا ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ فیض کی بیگانگی کی شاعری کے پیچھے پاکستان کے مجموعی سیاسی فضا اور عالمی استعماری کوششیں ہیں۔ جن کی وجہ سے فیض پر بیگانگی طاری ہوگئی ہے۔ فیض کی شاعری میں تصوف کی بیگانگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ ان کی شاعری میں مارکسی بیگانگی اور وجودی بیگانگی اپنی پوری شدت کے ساتھ آئی ہے۔ جس کے نتیجے میں فیض پر تنہائی طاری ہوئی' کرب میں رہے' اضطراب کی کیفیت میں رہے' ایک بات اور قابل غور ہے کہ فیض کی شاعری میں اجتماعی بیگانگیت زیادہ ہے۔ اس بیگانگیت سے نکلنے کے لیے فیض مزاحمت پر اور جدوجہد پر زور دیتا ہے۔ فیض دوسرے وجودیوں کی طرح موت کو خوفناک تصور نہیں کرتے' ایک مذہبی پس منظر اور اقبال سے رہنما کے ہوتے ہوئے فیض نے موت سے فرار نہیں کیا بلکہ فیض کہہ گئے۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے
جس دھج سے مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی کوئی پرواہ نہیں

فیض ایک متعہد شاعر ہونے کے ناتے اپنے اصولوں سے نہیں ہٹے' بیگانگیت کے گہرے بادل کو ہٹانے کے لیے فیض نے شہادت کی راہ دکھائی تاکہ کچھ لوگ آئیں اور ظلم کا خاتمہ ہو تاکہ آنے والی نسلیں اجتماعی عدالت کی حسین فضا میں زندگی گزار سکیں۔

ب: محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت اوراس کی جہات:

محموددرویش کی شاعری میں جہاں مزاحمت کے عناصر ملتے ہیں وہاں جلاوطنی کی کیفیات بھی دیدنی ہیں۔ محمود درویش نے بچپنے میں ہی جلاوطن ہونے کا کربناک تجربہ کیا۔اور یہ بچپنے کے جلاوطنی کا کرب تاحین حیات جاری رہا۔اسی تجربے کی کارفرمائی محموددرویش کی شاعری میں جابجاملتی ہے۔ محموددرویش کی شاعری کاایک اوراہم عنصر بیگانگیت ہے۔ان کی شاعری میں بیگانگیت کے افکاروطن بدری، پناہ گزینی اور ظلم وجبر کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں۔"حرم الشعب الفلسطینی من الامن وحریۃ البیان لیس لہ حق الحیاۃ وھو محکوم بالتشرد والسجن والخوف والاغتیال ،سلب منہ وطنہ" (۳۱) محموددرویش جب شعور کی منزل پر پہنچتاہے تواسے احساس ہوتاہے کہ میں بھی بچہ ہوں اوریہودی بچے بھی بالآخر بچے ہیں الیکن ان کو کھلی فضا میں کھیلنے کی اجازت ہے ہمیں نہیں۔جب شناختی کارڈ کابنانے کامرحلہ آتا ہے توابتدامیں اس چیز سے بھی محروم رہ جاتاہے ان باتوں کی وجہ سے محموددرویش کی شاعری میں بیگانگیت کے عناصر پوری توانائی کے ساتھ درآئے ہیں۔

درویش ۱۹۴۸ء کے بعد اسرائیل میں پلابڑھااورچونکہ اس کاخاندان جنگ کے دنوں میں مختصر مدت کے لیے لبنان چلے جانے کے بعد سرحد پار کرکے واپس آگیا تھا'اس لیے وہ اسرائیل حکومت کے۔۔"موجود غیر حاضر"میں شامل ہوگئے جن کو فلسطین میں نہ صرف اپنی موجودگی کاحق ثابت کرتے رہنے کی ہمہ وقت مشکل درپیش تھی بلکہ اس موجودگی کی حقیقت کو بھی ثابت کرتے رہنا تھا(۳۲)

بچپنے میں پناہ گزین ٹھہرے 'بیروت میں ریڈکراس کے صدقے پرزندگی کے ایام گزارنے پر مجبور ہوئے'واپس وطن لوٹے تونقشہ بدل چکاتھا'یوں ابتدا سے ہی بیگانگی کی فضا قائم ہوئی یہی بیگانگیت زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رہی اوراسی بیگانگیت میں فلسطین کو خیر آباد کہہ کر فلسطین کی سرزمین میں جاآباد ہوئے۔شاید قبر میں بھی محموددرویش کوچین نہ ملاہو گاوطن جواب بھی پناہ گزینی کی کیفیت میں ہے۔

بچپن میں اندھیری رات دیکھی تھی،جوان ہوئے توہر طرف اندھیروں کاراج نظر آیا،بستیاں ویراں نظر آئیں،یاخاکی خوبصورت بستی اجڑی سی نظر آگئی۔۔۔ ظلم وجبر کے خوفناک اندھیرے کے خلاف جنگ کا آغاز کردیااور جس وطن میں وہ اجنبی قرار دیئے گئے تھے اس کے لیے جدوجہد اور مزاحمت کی آوازیں بلند کرنی شروع کردیں۔ ان کی شاعری فلسطینی المیے کی دردناک کہانیاں بیان کرنے لگی۔ محمود درویش کواپنی شناخت نصیب نہیں ہوئی۔شناخت وطن سے ملتی ہے'وطن نہیں رہا،شناخت گھر سے ہے گھر بچانہیں یہاں تک کہ درویش اپنے آپ سے بھی اجنبیت محسوس کرتے ہیں:

نوجوانی میں اسے بارہا جیل جانا پڑا۔۔اس کا جرم اکثر محض اتنا ہوتا تھا کہ وہ سرکاری اجازت کے بغیر ملک کے اندر سفر کرتا رہاہے۔۔۔درویش ۱۹۷۱ء میں ماسکو چلا گیااس کے بعد قاہرہ اورآخر کار لبنان یوں علاقائی اور عالمگیر سطح پر اس کی آوارگی کا سلسلہ شروع ہوا۔۔ مستقل بے یقینی کی فضا ان کی تحریروں کی جذباتی اساس فراہم کرتی ہے۔نہ مکمل نتائج 'نہ آسان فتح مندی بلکہ ایک نامختتم وابستگی کہ اس تنہا اور منتشر تجربے کے ساتھ کاربند رہیں (۳۳)

درویش کی شاعری میں بیگانگیت کے تین حوالے ملتے ہیں:اپنے وطن سے بیگانگیت،اپنے گھر اور علاقے سے بیگانگیت اور اپنے آپ سے بیگانگیت۔گھر امن اور سکون کا دوسرا نام ہے گھر سے انسان کو آرامش اور آسودگی ملتی ہے گھر ہنسی خوشی کے ساتھ جینے کا استعارہ ہے بقول افتخار عارف:

خدا مجھے تو اتنا معتبر کر دے

میں جس مکان میں رہتا ہوں اسی کو گھر کر دے

محمود درویش ماں کے ہاتھ سے بنی کافی پینے اور شام کو بخیر وعافیت واپس آنے کو گھر سے تعبیر کرتے ہیں درحالانکہ یہ چیز ان کو میسر نہیں اس کا اپنے گھر سے ایک طرح کی بیگانگیت کا رشتہ ہے۔ محمود درویش صرف اپنے گھر اور وطن سے بیگانہ نظر نہیں آتے بلکہ وہ تو اپنے آپ سے بھی بیگانہ نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسے اپنا نام بھی جعلی لگتا ہے۔جیسا کہ ان کا کہنا ہے کہ

عربوں کی تمام تاریخ میں کوئی ایسا نام\
باقی نہیں بچا\
جسے میں ادھار لے سکوں، جس کے سہارے میں\
تمہاری چور کھڑکیوں میں سے کھسک جاؤں\
تمام مخفی نام فوجی بھرتی کے ایئر کنڈیشنڈ\
دفتروں میں محفوظ کیے جا چکے ہیں\
سو کیا تم میرا نام قبول کر لو گے\
میرا واحد مخفی نام جو محمود درویش ہے؟\
میرا اصل نام تو پولیس کے کوڑوں اور\
کارمل کے صنوبر کے درختوں نے

میرے گوشت سے ادھیڑ ڈالا ہے (۳۴)

محمود درویش گھر کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ گھر ماں کے ہاتھ کی بنی کافی پینے اور شام کو خیریت سے واپس آنے سے عبارت ہے۔ اور ملک کے بارے کہتے ہیں کہ میں اسے فلسطین کو کیسے ملک کہوں جو مجھے اپنی جھولی میں جگہ نہیں دیتا جہاں اغیار آکر آباد ہوئے اور ہو رہے ہیں' مقامی لوگوں کو جہاں بے دخل کیے گئے۔ ملک کے بارے میں وہ کیا خیال کرے گا جس کے وجود کو صیہونیوں نے مشکوک بنادیا اور جو اپنے ملک کو دکان یا ہوگلی کی مانند سوچنا شروع کر دے تو ظاہر ہے بیگانگیت تو ہو گی۔ اپنی ایک نظم سپاہی (جس نے سفید پھولوں کا خواب دیکھا) میں لکھتے ہیں:

گھر؟ اس نے کہا

"اپنی ماں کے ہاتھ کی بنی کافی پینے کا نام ہے

شام کو خیریت سے واپس آنے کا نام ہے

اور یہ ملک؟ میں نے پوچھا

وہ بولا" میں نہیں جانتا

یہ میری جلد کی طرح مجھے نہیں ڈھانپتا

جیسا کہ شاعر کہتے ہیں

میں نے اسے ایسے ہی دیکھا ہے

جیسے کسی گلی یا کسی دکان کو (۳۵)

محمود جنت گم گشتہ یعنی فلسطین کی تلاش میں اور کیفیت یہ ہے کہ یا تو فلسطین اس کے ہاتھ سے جا چکا یا فلسطین سے اس کی وابستگی ختم کرادی گئیں' فلسطین اور محمود درویش کے درمیاں بلڈوز اور رائفلز و گولی سے فاصلہ بڑھایا گیا۔ اب محمود درویش کسی نہ کسی طریقے سے وطن کی گود میں چین کی نیند سونے کے خواستگار ہیں۔ شاید انہیں نصیب ہو، اور وطن سے تحفہ کی امید بھی لگائے بیٹھے ہیں لیکن یہ صرف خیال کی حد تک تو بجا ہے صیہونی مٹ جائے تو یہ فرمائشات پوری ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ مسئلہ طول پکڑتا گیا تو اسی انداز میں محمود درویش نے بیگانگیت کا پرتو دکھائے ہیں۔ اپنی ایک نظم "فلسطین سے عاشق" میں محمود درویش لکھتے ہیں:

لیکن میں وہ ہوں جسے دیوار اور دروازے سے باہر

جلاوطن کر دیا گیا ہے

تم جہاں بھی ہو میرے پاس آجاؤ

تم جو کچھ بھی بن چکی ہو

میرے چہرے اور جسم کو رنگ بخش دو اور میری ذات کو معانی

دل کو اور آنکھوں کو روشنی

خبز اور نغمگی کا نمک، مٹی اور وطن کا ذائقہ

لوٹ آؤ اور مجھے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو(۳۶)

محمود درویش عالم بیگانگی میں بھی پر امید نظر آتے ہیں وہ بیگانگی کے سیلاب میں اپنی شاعری کو نہیں بہاتے بلکہ اس کربناک کیفیت سے نبرد آزما ہونے کے لیے امید کے دامن کو نہیں چھوڑتے اور یوں بیگانگیت کی وحشت ناک دشت میں امید کے بیج بوتے ہوئے محمود درویش نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ "حالۃ الحصار" میں محمود درویش لکھتے ہیں:

هنا'عند منحدرات التلال امام الغروب

وفوہۃ الوقت

وقرب البساتين مقطوعة الظل

نفعل مايفعل السجناء

ومايفعل العاطلون عن العمل

نربی الامل(۳۷)

ترجمہ: یہاں وقت کے رحم و کرم پر'

ڈوبتے سورج کے سامنے 'ان پہاڑیوں کے قدموں میں'

نوچے ہوئے باغوں کے نزدیک جن سے ان کے سائے چھین لیے گئے ہیں

ہم وہی کچھ کرتے ہیں جو قیدی کرتے ہیں'

جو بے روزگار لوگ کرتے ہیں

ہم امید اگاتے ہیں

محمود درویش بچپنے میں جلاوطن ہوا اور بیروت میں پناہ گزینی اختیار کی۔ اور کس قدر مشکل ہے یہ مرحلہ جہاں صاحب عزت اور شرف کے لوگ صدقہ و خیرات پر پلنے کو مجبور ہو جائے۔ جہاں ریڈ کراس جیسے ادارے کے سہارے لوگ زندگی بسر کریں ان انسانوں کی کیا وقعت ہو گی' محمود درویش اس مرحلے پر آکر اجنبیت کا اظہار اپنے والد سے

مخاطب ہو کر کر رہے ہیں میرے والد بزرگوار ہم ریڈ کراس کی اولاد ہیں یا آپ کی اولاد ہماری شناخت کیا ہے؟ اپنی ایک نظم "ریڈ کراس کے بارے میں ایک سادہ گیت" میں لکھتے ہیں:

میں لاکھوں سوال پوچھتا ہوں
لیکن تمہاری آنکھوں میں پتھر کی سی خاموشی ہے
مجھے جواب دو' ابا کیا تم میرے والد ہو یا
تم سمجھتے ہو میں ریڈ کراس کی اولاد بن گیا ہوں(۳۹)

یہاں پر "میں" کو نابود کیا گیا ہے' لیکن پھر بھی عالم بیگانگی میں فلسطین کے ذکر سے غافل ہوتے ہوئے محمود درویش نظر نہیں آتے۔

هنا بعد اشعارايوب لم ننتظر احداً
هنالا((انا))
هنايتذكرآدم صلصاله(۴۰)

ترجمہ: یہاں شعر ایوب کے بعد
کوئی نہیں ہے جس کا منتظر رہا جائے
یہاں میں کو نیست و نابود کر دیا گیا ہے
ہم آدم اس مٹی کو یاد کرتا ہے
جس سے اسے ڈھالا گیا تھا(۴۱)

محمود درویش کو فلسطین سے بلا کی محبت ہے' عشق ہے' پیار ہے اور خلوص ہے' ایثار ہے۔ فلسطین کی مثال چرواہے سے دیتے ہیں ایسے چرواہے سے جس کے پاس بھیڑیں نہیں' اور جو تلاش میں نکلنے والوں سے راہ فرار ڈھونڈنے کی کوشش میں ہو' فلسطین کو کھنڈروں میں دیکھتا ہے اور آخر میں محمود درویش ارض فلسطین کو محبوب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو یقیناً ایک باغ کی مانند تھی لیکن تم مجھ سے اجنبی تھی۔ اپنی نظم "فلسطین سے عاشق" میں لکھتے ہیں:

میں نے خاردار پہاڑی پر تمہیں دیکھا
تم ایک چرواہا تھیں' اپنی بھیڑوں کے بغیر
اپنا تعاقب کرنے والوں سے فرار پاتے ہوئے
میں تمہیں کھنڈروں میں دیکھا

تم میرا باغ تھیں اور اجنبی تھا

تمہارے دل کے دروازے پر دستک دیتا ہوا[۴۲]

محمود درویش فیض احمد فیض کی طرح انسانیت کے شاعر ہیں۔وہ اسرائیلی سپاہیوں کو بھی بحیثت انسان دیکھتا ہے۔اوروہ اسرائیلی سپاہی کو بھی قہوہ پینے کو بلالیتا ہے تا کہ سپاہی کو محسوس ہو کہ ہم بھی دل رکھتے ہیں اور دل میں احساس بھی رکھتے ہیں:

ایھاالوقفون علی العتبات ادخلوا

واشربو معنا القھوۃ العربیۃ

قدتشعرون بانکم بشر مثلنا[۴۳]

ترجمہ:اے تم جو'دروازے پر کھڑے ہو'اندر آجاؤ

اور ہمارے ساتھ عرب قہوہ پیو

تب شاید تم خود کو انسان محسوس کرنے لگو ہم جیسے انسان

تم'جو دروازے پر کھڑے ہو

مہربانی کر کے ہماری صبحوں سے نکل جاؤ

تب شاید تم ہمیں انسان محسوس کرنے لگو اپنے جیسے انسان[۴۴]

محمود درویش پر فلسطین اوراہل فلسطین پرڈھائے جانے مظالم کی وجہ سے ایک جنون کی کیفیت اور شدت آجاتی ہے جس کی وجہ سے بلند آواز سے تنہائی میں صدائیں بلند کرتا ہے یہ صدا ان لوگوں کے لیے نہیں جو مر چکے ہیں بلکہ یہ جنون کی آواز اپنے آپ کو تنہائی کے پاتال سے نکالنے کے لیے محمود درویش لگارہے ہوتے ہیں۔

میں تنہائی کے مارے پکاراُٹھتا ہوں

انہیں جگانے کے لیے نہیں جو دنیا کے لیے مر چکے ہیں

بلکہ خود کو اپنی قید تنہائی سے باہر نکالنے کے لیے[۴۵]

محمود درویش کو فلسطین سے گہری وابستگی'وارفتگی'اورانسیت ہے۔فلسطین کی تعریف اپنی ایک نظم "اپنی زمین کے نام "میں محمود درویش ان الفاظ کرتے ہیں :کہ وہ زمین جو اللہ کے کلام سے قریب'بادلوں کی چھت'غیر موجودگی کا نقشہ'مال غنیمت'مرنے کی آزادی'جگمگانے والا موتی'دور سے دکھائی دینے والا'اپنے سے باہر

کو منور کرنے والا' لیکن جو ہم ہیں اس کے اندر رہتے ہوئے دم گھٹنے لگتے ہیں۔ ان تعریفی کلمات میں بھی بیگانگیت کے مشروب سر نکالے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

اپنی زمین کے نام:

جو اللہ کے کلام کے قریب ہے'

جو بادلوں کی چھت ہے

اپنی زمین کے نام

جو اسموں کی صفات سے بے حد دور ہے'

جو اپنی غیر موجودگی کا نقشہ ہے (۴۶)

محمود درویش کو فلسطین کی تاریخ سے بھی آشنائی ہے' اسے یہ بھی خبر ہے کہ فلسطین کی بکارت کو ہر عہد میں پھاڑا گیا۔ اور یوں مال غنیمت بن کر گردش میں رہا۔ فلسطین میں ہوتے ہوتے فلسطین سے دوری پہ اپنے آپ کو پاتے ہیں' فلسطین کو جب وہ دور سے دیکھتے ہیں تو خوبصورت دوشیزہ کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے' لیکن جب فلسطین سے ہم آغوش ہوتے ہیں تو دم گھٹنے لگتا ہے' اس کی وجہ یہ ہو کہ شاعر جسے اپنا وطن کہتا ہے وہ اس کا اپنا وطن نہیں رہا' جب اپنی چیز انسان کی اپنی نہیں رہتی اس چیز سے انسان کو اجنبیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح محمود درویش بھی اپنے وطن کو اجنبی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اپنی زمین کے نام

جو جنگ میں جیتا ہوا مال غنیمت ہے

اور خواہش یا سوختگی سے مرنے کی آزادی ہے

اپنی زمین کے نام

جو خونی رات میں جگمگانے والا ہیرا ہے

جو دور ہی دور سے جگمگاتا رہتا ہے

اور اسے منور کرتا ہے جو اس کے باہر ہے

اور ہم، جو اس کے اندر رہیں،

ہمارا دم زیادہ گھٹتا ہے (۴۷)

محمود درویش یوں تو فلسفی نہیں ہے لیکن کہیں کہیں فلسفیانہ انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ جیسا کہ ان کا کہنا ہے کہ غیر موجودگی 'موجودگی کا اعلیٰ درجہ ہے۔

كلما غاب عنك الغياب
تورطت فى عزلة الآلهة
فكن ((ذات))موضوعک التائهة
((وضوع))ذاتک
كن حاضراًفى الغياب(۴۸)

ترجمہ: جب غیر موجودگی تمہیں ترک کر دے
تو تم تنہائی کی نعمت پالینا
غم کا جوہر بن جانا
خود اپنا موضوع ہو جانا
غیر موجودگی 'موجودگی کا اعلیٰ ترین درجہ ہے

محمود درویش کو مستضعفین کی فتح وکامرانی پر کامل یقین ہے۔ اگرچہ اسرائیلی فوجوں نے بلڈوزاور بم بارود سے سرزمین فلسطین کو مسمار کیا لیکن یہ مغائرت ہمیشہ کے لیے باقی نہیں رہے گی ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن حق کا سورج طلوع کر جائے گا۔

زمین پر قائم ہماری حقیقتیں
بل ڈوزر سے مسمار کر دی جاتی ہیں
لیکن ایک دن سچ سارے میں ننگا گھومے گا

محمود درویش کی شاعری اس کی ذات اور تمام فلسطینیوں کا اجتماعی تجربہ ہے۔ محمود درویش اپنے آپ کو بھی دو حصوں میں تقسیم ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک وہ جوان کا اپنا وجود ہے ایک وہ جو صیہونیوں نے کرتوتوں کی وجہ سے محمود درویش کا ہیولیٰ بنا۔ لہٰذا اپنے نام اور ذات کے اعتبار سے بھی محمود درویش عالم بیگانگی میں نظر آتے ہیں' محمود درویش لکھتے ہیں:

میں اپنے آپ کو دو حصوں میں منقسم دیکھتا ہوں
ایک میرا نام 'دوسرا میں خود(۴۹)

محمود درویش کی جلاوطنی تو سمجھ آتی ہے لیکن شاعر نے فلسطین کو بھی جلاوطن کہا'اس بات میں غور کرنے کی ضرورت ہے یعنی فلسطین وہ ملک ہے جسے دربدر پھرایا گیا'اس کو سفری بیگ کی طرح استعمال کیا گیا۔ا محمود درویش اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کررہے ہیں:

الغائبان اناوانت

اناوانت غائبان (۵۰)

محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی کے ساتھ "غیر حاضری کالفظ بھی ملتا ہے۔اس لفظ میں بھی معنویت ہے۔ محمود درویش کے نزدیک انسان جب غیر حاضر ہوتا ہے تو تنہائی کے حصار میں آجاتا ہے جب تنہائی میں آتا ہے تو انسان اپنے وجود کا احساس کرتا ہے۔ لہذا غیر حاضری'حاضر ہونے کی پہچان بن جاتی ہے۔ ناصر عباس نیر کا کہنا ہے کہ:

اصل میں وہ 'باہر' کے سیاسی واقعے کو متن میں تحلیل کرکے، متن کے اندر، متن کے اصولوں کے تحت اسے نیا وجود دے کر، اسے کہیں زیادہ قابل توجہ بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ آپ ان کی علامتی نظمیں پڑھیں تو لگے گا کہ ان نظموں کا متکلم، تصور و تجرید کو حسی وجود کے طور پر محسوس کرتا ہے،عدم موجودگی جیسی تجرید کو موجودگی کی طرح محسوس کرتا ہے (۵۱)

محمود درویش وہ مصیبت کے مارے انسان ہیں'جنھوں نے دیر الاسد میں روپوش زندگی گزاری'لیکن انہوں نے شاعری میں اپنا نام کمایا اور اپنے نغمے سے فلسطینی مجاہدین کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ لیکن انسان جو سوچتا ہے وہ نہیں ہوتا تو اضطراب میں آجاتا ہے'محمود درویش کا ہم و غم فلسطین ہے'جب انہیں فلسطین کے تھنوں سے دودھ میسر نہیں آیا اور فلسطین ایک مال غنیمت کی طرح بٹتا رہا'تو محمود درویش اکتا گئے اور تنہائی میں اپنے وجود کی جانب سفر شروع کیا۔ جب اپنے وجود میں سفر کیا تو ویسے بھی اسرائیل نے انہیں "غیر موجود حاضر"مانا ہوا تھا'اب شاعر نے خود اپنے آپ کو سماج سے غیر حاضر شمار کرکے اپنے وجود میں جا آباد ہوا تو شاعر کو اپنی ذات کا عرفان حاصل ہوا۔ یوں غیر موجودگی میں'موجودگی کو پالیا۔

ایک شاعر سے

جب غیر حاضری تمھیں چھوڑ جائے

تو تنہائی کی نعمت ڈھونڈنا

کھونے کا جوہر بن جانا

بن جانا خود اپنا موضوع

حاضری کی اعلیٰ ترین شکل ہے غیر حاضری (۵۲)

محمود درویش فلسطین سے حد درجہ انسیت رکھتا ہے اوراس قدر فلسطین سے قرب حاصل کرتا ہے کہ جہاں من وتو کا فرق بھی مٹ جاتا ہے جہاں سے من توشدی تو من شدم کی کیفیت جنم لیتی ہے۔یعنی محمود درویش فلسطین بن جاتا ہے اور فلسطین محمود درویش بن جاتا ہے۔یعنی جب تک محمود درویش 'فلسطین میں رہے یا فلسطین محمود درویش میں یہ جلاوطنی نہیں' جلاوطنی یہ ہے جب یہ رشتہ منقطع ہو جائے اور جب رشتہ منقطع ہو جائے تو من وتو کا رشتہ بھی ٹوٹے گا اور نتیجے میں بیگانگیت کی باڑ لگ جائے گی یہی وجہ ہے کہ محمود درویش فلسطین میں اتر کر زندگی کرنے کا سوچ رہے ہیں۔اپنی ایک نظم "ایک مسافر نے دوسرے سے کہا: ہم واپس نہیں لوٹیں گے" میں لکھتے ہیں:

کیا میں میں ہوں؟

میں وہاں ہوں۔۔۔یا یہاں؟

میں ہر ایک "تم" میں ہوں

میں تم ہوں 'تمہارا ہم سخن

تم ہونا میرے لیے جلاوطنی نہیں

تم میں میں ہونا میرے لیے جلاوطنی نہیں (۵۳)

محمود درویش کی شاعری میں زمان ومکان کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے۔فلسطین سے زمانی اور مکانی لحاظ سے محمود درویش اپنے کو بہت دور پاتا ہے۔اوروہ ملک درحالانکہ اس کا اپنا وطن ہے اوراس وطن کو ایسا پیش کیا گیا ہے کہ محمود درو ویش اپنے ملک میں ہی اپنے ملک سے بیگانہ بنتے نظر آتے ہیں۔یہ سب کچھ صیہونیوں کا بنا بنایا ہے درحالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔فلسطین محمود درویش کا وطن تھا وطن ہے اور وطن رہے گا لیکن اسی شناخت اور پہچان کا بھی صیہونیت نے خاتمہ کر دیا۔محمود درویش اپنی ایک نظم "ہم ایک ملک میں جاتے ہیں" میں لکھتے ہیں:

ہمارے اپنے راز

وہ سڑکیں ہمارے پاؤں کا کانٹا بن گئی ہیں

جو ہمیں اپنے گھروں کی بجائے

غیروں کے گھر لے جاتی ہیں

روح اپنی روح میں اپنی روح تلاش کرے گی

یا پھر ہم یہیں مر جائیں گے (۵۴)

محمود درویش نے وطن کو غور سے دیکھا وطن کہیں میسر نہیں آیا' جیل میں' جلاوطنی میں اور وطن میں جلاوطنی کی کیفیت میں' پناہ گزینی میں الغرض خود ساختہ جلاوطنی میں کہیں بھی انہیں وطن دکھائی نہیں دیا۔ وطن ایک خواب رہا 'ہر چیز کی پہچان نشان سے ہوتی ہے صیہونیوں کی سازش اور استعمار سے ساز باز کی وجہ سے فلسطین کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا فلسطین کا چہرہ مسخ کر دیا گیا فلسطین کی تاریخ کو جان بوجھ کر بدل ڈالا، فلسطین بم بارود اور بلڈوز کی نذر ہو گیا۔ تو نتیجے میں فلسطین محمود درویش سمیت دیگر فلسطینیوں سے کوسوں دور چلا گیا اب واپسی ممکن نہیں لگتی۔ لیکن محمود درویش نے اپنی شاعری کی زمین فلسطین کو قرار دیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ فلسطین سے وابستگی اور پیوستگی برقرار رہے لیکن صیہونیت آڑے آجاتی ہے اور بے دخل کرنے سے صیہونیت باز نہیں آتی۔ فلسطین سے ملن کی شدت سے انتظار ہے لیکن یہ عنقا بنتا جارہا ہے تو لامحالہ ایک اجنبیت کا جال بنتا ہوا پایا جس میں محمود دریش الجھ کر رہ گئے۔ اپنی ایک نظم "ایک خانہ بدوش نغمہ" میں لکھتے ہیں:

صاف ستھری اور واضح ایک گلی'

ایک لڑکی

چاند کو روشن کرنے نکلتی ہے

میرا ملک بہت دور ہے

ملک ۔۔ جس کا نشان موجود نہیں (۵۵)

محمود درویش اپنے وطن کو قید خانہ تصور کرتے ہیں جہاں صیہونی پہرے پٹھائے ہوئے ہیں۔ قیدی شخص کا کوئی وطن نہیں ہوتا وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ایک جاں گسل زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ وطن تو اسے کہتے ہیں جس کی چار دیواری ہو' جغرافیہ ہو' جہاں گھر' گاؤں اور شہر آباد ہوں' جہاں تعلیم کا حصول ہو' جہاں لوگوں کو بے دخل نہ کیے ہوں' جہاں اظہار پر پابندی نہ ہوں' جہاں مذہبی آزادی حاصل ہو جب یہ تمام چیزیں ایک قیدی کو میسر نہیں ہوتیں تو نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بے یقینی اور بیگانگی کی فضا قیدی پر چھا جاتی ہے' محمود درویش کا شمار بھی اسطرح کے قیدی میں ہوتا ہے۔ جنہیں اجنبیت نے چاروں طرف سے گھیرے رکھا۔ اپنی ایک نظم "محمدؐ کے ساتھ" میں لکھتے ہیں:

میں اپنی زمین پر قیدی ہوں

وطن کے بغیر
تعلیم کے بغیر، گھر کے بغیر
انہوں نے میرے لوگوں کو بے دخل کر دیا ہے
اور میری آواز خاموش کرا دی ہے
یہ آزادی کی خواہش کے دام تھے
میں کیا کروں
جیل کا سامنا کروں
یا وارڈن کی تردید
حتیٰ کہ مذہب کی میٹھاس
ساری تلخی دھو ڈالیں(۵۶)

محمود درویش کی شاعری میں نغمگی کے ساتھ رثائی رنگ غالب ہے۔اس کی شاعری اس کے روزمرہ کی یادداشت ہے۔اوراس کی شاعری اس کی اپنی زندگی کے کرب کا الفاظ کے قالب میں بیان ہے۔ محمود درویش اپنے آپ کا گھیر اتنگ دیکھتے ہیں اور انبوہ عظیم یا ہجوم عام میں وہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتے ہیں۔اس کی دادرسی کرنے ولا کوئی نہیں ہوتا۔اپنی ایک نظم "المتبنی کا مصر کا بحری سفر" میں محمود درویش لکھے ہیں:

زمین دبلی ہے
تلوار کی تیز گزرتی دھار سے بھی
جو چھریری کمر سے بھی گزر جاتی ہے
زمین وسیع ہے
کسی نبی کے خیمے سے بھی
مجھے کوئی اپنے عقب میں نہیں دکھائی دیتا'
نہ اپنے سامنے
میں انبوہ میں بھی اکیلا محسوس کرتا ہوں(۵۷)

انسانی زندگی میں خاص کر شاعری میں یاد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کبھی محبوب کی یاد، کبھی گزرے ہوئے وقتوں کی یاد، کبھی جلاوطنی میں وطن اور رفتگان کی یاد انسان وشاعر کے دل دماغ پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ محمود درویش اپنے وطن کو ماں کہتے ہیں اور ماں کی یاد اسے بہت آتی ہے آدھی ملاقات (یعنی خط) کی خاطر محمود درویش صفحے کالے کرنے لگتے ہیں تو یہ سوالات دامن گیر ہوتے ہیں کہ خط کس راستے بھیجا جائے، کس پتے کرارسال کیا جائے جہاں مرسل اور مرسل الیہ بھی اپنی شاخت نہ رکھتے ہوں اس ضمن میں محمود درویش اپنی ایک نظم "ماں کے نام (جلاوطنی کا خط)"

پیاری ماں!

نہیں جانتا کہ یہ کاغذ کالے کیوں کر رہا ہوں

کون سی ڈاک ہے جو انہیں لے جائیگی

بری' بحری اور ہوائی راستے بند ہیں

اور ہو سکتا ہے کہ تم سب مر چکے ہو

یا پھر زندہ ہو بغیر کسی پتے کے

کیا کوئی زندہ رہ سکتا ہے

بغیر ملک کے

بغیر گھر کے

بغیر جھنڈے کے

بغیر پتے کے (۵۸)

محمود درویش کی شاعری میں وجودی افکار کے پرتو بھی نظر آتے ہیں۔ محمود درویش اپنے آپ کو تنہا دیکھتا ہے۔ جس پر اداسی نے ڈیرہ جمائی ہوئی ہے۔ کرب اس کی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ خوشی اور فرط وانبساط کہیں سے میسر نہیں۔ ملک بدری، پناہ گزینی اور قسمت میں قید جس کی لکھی ہو اسے خوشی کہاں سے ملتی ہے؟ ان تمام باتوں کے باوجود محمود درویش پر امید ہے' دکھ، درد، تکالیف کے باوجود محمود درویش کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ وہ پر امید ہے کہ کسی نہ کسی دن قسمت کا سکندر چمکے گا ایک نہ ایک دن خوشیوں کا باغ سجے گا اور یوں گل وبلبل کو خوشیاں منانا نصیب ہو گی۔ اپنی ایک نظم وعدہ فردا میں محمود درویش گویا ہیں:

ساحل پر تنہا ہوں

اور میرے ارد گرد

محبت کرنے والے جوڑے مسکراہٹیں بکھیر رہے ہیں

اور میرا یقین ہے

کہ ہم بھی مسکرائیں گے (۵۹)

انسان جب کسی انجان جگہ پر پہنچتا ہے تو اسے ہر چیز نئی 'انوکھی اور اجنبی سی لگتی ہے۔ وہ ہر چیز کو حیرانگی میں گور گور کر دیکھنے لگتا ہے تو مقامی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کوئی اجنبی آدمی ہے۔ محمود درویش کی شاعری بھی اسی قبیل سے ہے جہاں شاعر اپنے ارد گرد کی تمام چیزوں اجنبی کی طرح دیکھتا ہے یہ بیگانگیت کی انتہا ہے' اسے ہر چیز بدلی بدلی سی معلوم ہوتی ہے 'یہاں تک کہ ان کو اپنا پتا، کھانے وقت، تمباکو کی مقدار، کپڑے اور چہرے کے رنگ سے لے کر چاند تک بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ محمود درویش اپنی ایک نظم (السجن) " قید" لکھتے ہیں کہ:" تغیر عنوان بیتی / وموعد اکلی / ومقدار تبغی تغیر / ولون ثیابی، وو جھی، وشکلی / وحتی القمر "(۶۰) ترجمہ: میرا پتہ تبدیل ہو چکا ہے / اور کھانے کا وقت بھی / تمباکو کی مقدار بھی بدل ہے / کپڑوں کا رنگ / چہرہ اور حلیہ بھی / یہاں تک کہ چاند بھی (۶۱)

اپنی ایک نظم "مت سوٗ میرے پیارے" میں محمود درویش امید دلاتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن آزادی ضرور ملے گی اس دن بیگانگیت کی اذیت سے نجات مل پائے گی۔

جب چاند ٹوٹے ہوئے آئینے کی طرح گرتا ہے

ہمارے سائے لمبے ہو جاتے ہیں

اور داستان مر جاتی ہے

مت سوٗ میرے پیارے

ہمارے زخم تمغے بن چکے ہیں

اور انہوں نے چاند پر آگ بھڑکا دی ہے

ہماری کھڑکیوں سے پرے ایک روشن دن ہے (۶۲)

جس طرح الفاظ پیدا ہوتے ہیں جوان ہوتے ہیں پھر فرسودہ ہو کر مر جاتے ہیں۔ ان الفاظ میں نئی روح پھونکنے کے لیے ان الفاظ کو استعارات وعلائم بنا کر اپنے عصر کی ترجمانی کے لیے استعمال میں لائے جائیں تو یہ الفاظ نئی توانائی کے ساتھ اپنا وجود خود ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح زبان بھی وجود میں آتی ہے پھر مر جاتی ہے اگر زبان کو زندہ رکھنا

ہوتواپنے زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ لفظیات میں خاطر خواہ اضافہ ہوتب جاکر نئے لفظیات اور نئے استعارات اور کنایات سے زبان ترقی کرتی ہے۔ محمود درویش نے فرسودہ استعارات وعلائم پر زیادہ بھروسہ نہیں کیاان کی شاعری میں نئے استعارات وعلائم کے ساتھ نئے لفظیات کولاکر عربی زبان وادب کومزید تقویت پہنچائی ہے۔اس بارے میں اپنی ایک نظم "گلاب اور لغت" میں محمود درویش کا کہنا ہے کہ:

کہ لغت کے الفاظ! میری جان بے معنی ہو چکے ہیں
یہ الفاظ زندہ کیسے رہتے ہیں
بڑھتے کیسے ہیں؟
ہم یادوں' استعاروں اور
اپنے اندر کی مٹھاس سے ان کی آبیاری کرتے ہیں
ایسے ہی ہوتا ہوگا
مگر میرے لیے ضروری ہے کہ میں اس گلاب سے انکار کردوں
جو لغت کے گملے اور شعری مجموعہ کے گلدان سے آتا ہے
میرا گلاب تو
مزارعہ کے بازؤں کے پسینے سے
مزدور کے ہاتھ کی گرفت سے
اور مجاہد کے زخم سے
چٹان کے ماتھے پر کھلتا ہے (۶۳)

محمود درویش کی شاعری فلسطینی عوام کی مظلومیت کی داستان ہے۔فلسطین کے باسیوں کو کبھی ظلم وتشدد سے سفاکانہ طریقے سے ماراگیا تو کبھی پھانسی پرلٹکاکر لقمہ اجل بنایا گیا۔صیہونیت نے فلسطینیوں کی شناخت تک کومسمار کیا۔ان کا اصلی نام اور عنوان بھی ان کے وجود سے چھینا گیا ہے۔اس ضمن میں محمود درویش اپنی ایک نظم "مزامیر" میں لکھتے ہیں:

ایھالوطن المتکررفی المذابح والاغانی
فھل تقبل اسمی
اسمی السری الوحید

محمود درویش
اما الاسمی الاصلی
فقد انتزعتہ عن لحمی
سیاط ا لشرطۃ وصنوبر الکرمل(۶۴)

ترجمہ: ترانوں اور قتل عام کی خبروں میں سنائی دینے والے وطن ! / تو کیا تم میرا نام قبول کروگے / میرا ایک ہی جعلی نام ہے / محمود درویش / جہاں تک میرے اصلی نام کا تعلق ہے / وہ میرے وجود سے نوچ لیا گیا ہے / پولیس کے کوڑوں کے ذریعے / اور پھانسی لگانے والے درختوں کے ذریعے (۶۵)

محمود محمود درویش کی زندگی بے خانماں میں گزری۔ انسان کو اپنی شناخت کے لیے ایک وطن درکار ہوتا ہے محمود درویش کا وطن بتانے کو تو فلسطین ہے لیکن قابض صہونیت نے ان کو اپنے وطن سے بھی بیگانہ کر دیا۔ یہی بیگانگی کا تلخ تجربہ ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ وطن کا نقشہ محمود درویش ان الفاظ میں کھینچتے ہیں کہ میرا وطن ایسا وطن ہے جو صرف ترانوں' قتل عام کی خبروں' فائلوں' بموں اور ہوا و خنجر کے بیچ میں معلق ہے۔ وطن سے بیگانگیت کی ایک تصویر (اپنی ایک نظم "مزامیر"(۶۶) میں) محمود درویش ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

ترانوں اور قتل عام کی خبروں میں سنائی دینے والے وطن !
میں تمہارا نقشہ کھینچنا چاہتا ہوں
تم جو فائیلوں اور انکشافات میں بکھرے ہوئے ہو
میں تمہارا نقشہ کھینچنا چاہتا ہوں
تم جو بموں اور گولوں کے ٹکڑوں
اور پرندوں کے پروں سے اٹے پڑے ہو
میں تمہارا نقشہ کھینچنا چاہتا ہوں
مگر آسمان میرا ہاتھ چھین لیتا ہے
میں تمہارا نقشہ کھینچنا چاہتا ہوں
تم جو ہوا اور خنجر دونوں کی زد میں ہو (۶۷)

محمود درویش کبھی قیدی بن کر رہا تو کبھی جلاوطن تو کبھی پناہ گزینی جیسی جگر سوختہ مصائب و آلام پر مبنی زندگی گزارتا رہا یہ صرف محمود درویش کی ذات تک محدود نہیں تھا بلکہ یہ کرب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تمام فلسطینیوں کے

شامل حال رہالہذا محمود درویش صرف اپنی ذات پر گزرنے والے کرب کو بیان نہیں کرتا بلکہ ان کی شاعری فلسطینی عوام کی اجتماعی کرب کو بیان کرتی ہے ان کی شاعری ایک گونا فلسطینیوں کا اجتماعی تجربہ ہے۔ فلسطین جسے انبیاء علیہم السلام کی سرزمین کہاجاتا ہے وہاں فلسطینی اپنے آپ کو اجنبی سمجھتے ہیں کہ جہاں ان سے اپنی "انا" بھی چھن گئی ہے جہاں انہیں اپنے آپ سے بھی اجنبیت محسوس ہوتی ہے اور جہاں زندگی گزار رہے ہیں اس سے بھی اپنے آپ کو بیگانہ تصور کرتے ہی انہیں یہ بھی معلوم نہیں وہ کہاں ہیں؟صلیبوں سے پھسل کر بھی مرا نہیں اور زندہ بھی ایسا جو زندہ نہیں ان تلخ حقائق کا بیان محمود درویش اپنی ایک نظم "قومی ترانے کے خالی ہاتھ" میں ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

میں بے انتہا افق پر
بادلوں سے محروم آسمان سے لے کر
نگاہوں میں آنے والے چھوٹے سے چھوٹے پہاڑ تک
پھیلی ہوئی صلیب سے پھسلتا ہوں
مگر مرتا یا آزاد نہیں ہوتا
کیونکہ میں نہیں جانتا کہ کہاں ہوں
اور مجھے کیا کرنا ہے(۶۸)

محمود درویش کے آباؤ اجداد کاشت کار تھے۔ جب اسرائیلیوں نے الجلیل اور البروہ پر حملہ کیا تو محمود درویش کی آبائی زمینیں بنجر ہو گئیں۔ بلڈوزکی نذر ہو گئیں اور ملبہ کا ڈھیر ہو گئیں' گھر تباہ ہوا' گھر کے رستے تک بھی سالم نہیں رہے تو محمود درویش کہنے لگے میرے اجداد کاشت کار تھے' اب نہ کوئی حسب ہے اور کوئی نسب' دکھانے کو کچھ بچا نہیں ہمارا بغیر لقب کے صرف نام رہ گیا ہے۔ یہ بیگانگیت کی انتہا ہے۔

سجل انا عربی
وجدی کان فلاحا
بلاحسب ولانسب
انااسم بلالقب(۶۸)

محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت کی ایک وسیع و عریض دنیا آباد ہے۔ محمود درویش ایسا کو لمبس ہے جن کی شاعری میں فلسطین کی دریافت دیکھی جاسکتی ہے۔ محمود درویش کی اپنی ذاتی بیگانگی کے ساتھ اجتماعی بیگانگی بھی ان کی شاعری میں در آئی ہے' بلکہ یوں کہوں تو بے جان نہ ہوگا' محمود درویش کی بیگانگی ہر ہر فلسطینی کا کرب ہے' ہر فلسطینی اسی

عذاب سے گزر رہا ہے' محمود درویش کبھی اس بیگانگیت سے چھٹارا پانے کی امید قائم کرتے ہیں لیکن ان کی زمینوں کی طرح امیدیں بھی اسرائیلی ظلم و بربریت سے بلڈوز ہو جاتی ہیں۔

شب رفتہ کے اندیشوں کا سرمایہ
اثاثہ مہلت غم کا
نصیب صبح ہونے لگا ہے
پھر وہی کچھ آشنا لمحوں کے بے حس اجنبیت
سانس میں گھلنے لگی ہے
کہ تازہ سال کی کھڑکی
گزشتہ سال کے بوسیدہ اجڑے لان میں کھلنے لگی ہے
پھر طلوع صبح نو ہے (۶۹)

محمود درویش قنوطیت کے شاعر نہیں ہیں ان کی شاعری میں جہاں دکھ' درد' غم' غصہ' نفرت کا بیان ہے وہاں ان کی شاعری میں رجائی پہلو بھی دیدنی ہے۔ اپنی تنہائی اور وطن سے بے وطن ہو کر اضطرابی کیفیات سے بھی دوچار ہیں لیکن امید کی کرن بھی ان کی شاعری میں چھلکتی ہے ابھی بیگانگیت ہے تو کیا ہوا اگر ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں رہا تو کیا ہوا بالآخر ان سے بھی نجات مل جائے گی فی الحال تنگی ہی سہی۔ محمود اپنی ایک نظم "المتنبی کا سفر" میں لکھتے ہیں"

مجھے دور سے ہنہنانے کی آواز سنائی دے رہی ہے
لیکن نگاہ میں نہ کوئی گھوڑا نہ سوار ہے
ہر سفر مجھے دوسرے سفر کی راہ دکھاتا ہے
مجھے یہاں کوئی وطن نہیں ملا
نہ کسی ہم وطن سے ملاقات ہوئی ہے
یہ زمین ایک تنگ کمر میں سے
گزرتی ہوئی تلوار
سے بھی زیادہ تنگ ہے
یہ زمین ایک پیغمبر کا خیمے سے بھی

زیادہ تنگ ہے (۷۰)

فلسطین پر صیہونیوں نے جو مظالم ڈھائے اس کا دائرہ کار صرف فلسطین تک محدود نہیں رہا بلکہ صیہونیوں نے عالمی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے صابرہ اور شتیلہ کے کیمپوں پر بھی حملے کیے جہاں فلسطینی پناہ گزینی کے عذاب سے دوچار تھے۔ جب ان کیفیات کو محمود درویش اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں تو لامحالہ اجنبیت ہر طرح سے غیر مرئی بوت کے طرح ذہن و فکر پر سوار ہو جاتی ہے۔

اسرائیلی چیرہ دستیاں اور مظالم صرف فلسطین تک ہی محدود نہ رہے بے خانماں اور بے آسرا مہاجرین نے جب لبنان میں پناہ لی تو ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے بیروت پر حملہ کر کے قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ فلسطینی مجاہدوں اور بے بس مہاجرین کا ہفتوں قتل عام جاری رہا۔ صابرہ اور شتیلہ کے کیمپوں میں انسانیت سوز بہیمانہ نسل کشی سے نازی بھی شرما گئے۔ درویش کی نظم "بنام طائر سبز رنگ: بنام بیداری فلسطین" اسی پس منظر میں ہے۔

تو طائر سبز رنگ

اے طائر بہاریں

بے رنگی میں بھی تو چمکتا ہے

ناامیدی اور مایوسی کی ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی تک

تو ایشیا کی امیدوں کی مانند اکیلا اجنبی سا پھدکتا پھرتا ہے

اے طائر سبز رنتک میرے ظائر سبز رنگ میرے اس جسم کو

خنجروں اور چاقوں نے یوں ٹکڑے کر دیا

جس طرح ہجے وقت کوئی بچہ لفظوں میں بھیر دیں (۷۱)

محمود درویش کی شاعری میں فلسفہ وجودیت کی اصطلاح "بیگانگیت" بھی در آئی ہے۔ محمود درویش نے فرانسیسی ادیبوں اور دانشوروں خاص کر سارتر سے فکری رہنمائی لی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں کامیو جیسے ادیبوں کی بیگانگی کا نظریہ بھی در آیا ہے۔ نظریہ بیگانگی آج کے انسان کی تصویر کشی اس انداز میں کرتا ہے کہ انسان آج کے پر ہجوم دور میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اور اس تنہائی میں وہ اپنے آپ کو سب سے الگ تصور کرتا ہے جہاں کوئی بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہوتا تو لامحالہ ایک بے معنویت کی کیفیت انسان پر طاری ہوتی ہے اور اس بے معنویت سے نکلنے کے لیے انسان جدوجہد کا سہارا لیتا تاکہ زندگی کی جنگ جاری رکھ سکے۔ محمود درویش بھی بھرے لوگوں میں 'ہجوم

عام میں اپنے آپ کو تنہائی میں دیکھتا ہے جہاں اس کا پرسان حال نہیں۔اس کی ذات سے جہاں اس کا نام تک ہتھیا لیا ہو وہ اپنا آپ کیسے جی سکتا ہے۔شاعر کی شناخت اور نام اس کے وطن سے ہے جو کہ شاعر سے بیگانہ ہو چکا ہے۔اب محمود درویش وطن کو تخیلاتی فرض کرتے ہوئے ایک ایک جغرافیہ مرتب کرتے ہیں اس میں کھیت بھی ہے اور وہ کھیت نظم ہے۔جس میں وہ اپنے دکھ' درد اور بیگانگیت کے ہل چلاتے ہیں۔محمود درویش اپنی ایک نظم "المتبنی کا سفر" میں لکھتے ہیں:

مجھے میرے نام واپس دے دو
میرے پیچھے کوئی نہیں ہے
میرے آگے کوئی نہیں ہے
میں ہجوم میں تنہا ہوں
میرا وطن میری تازہ ترین نظم ہے
جب میں اپنی طرف قدم اٹھاتا ہوں
تو گاؤں مجھے باہر دھکیلتے ہیں
میں آئینے توڑتا ہوں تو خود ٹوٹ جاتا ہوں
میں دیکھتا ہوں کہ قوموں کو ٹوکنوں کی طرح
تقسیم کیا جا رہا ہے
میرا ملک میری تازہ نظم ہے (۷۲)

ہر انسان کی شناخت اور پہچان چہرہ سے ہوتی ہے' اگر چہرہ ہی سلامت نہ نہ رہے تو پھر انسان کی شناخت ناممکن نہ ہو تو مشکل ضرور ہوتی ہے۔فلسطین محمود درویش کے لیے ایک چہرہ ہے ایک شناخت ہے اور ایک پہچان ہے لیکن محمود درویش ایسی چیز کو اپنے سے نسبت دے رہے ہیں جسے صیہونیوں نے چھینی اور اس چیز کو اپنا کہہ نہ پائے۔محمود درویش اسی وطن کی تلاش میں رہا اور بار بار جلاوطنی کی موت مرتے رہے لیکن جلاوطنی کے نہ تھمنے والا سلسلہ بھی اسے وطن دلانے میں ناکام رہا۔اور یوں بے وطنی کا چہرہ لیے پھرنے پر مجبور ہوا۔گو کہ شناخت اور عدم شناخت کے درمیان اجنبیت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے اس حوالے سے محمود درویش اپنی ایک نظم "چہرہ" میں لکھتے ہیں"

اس نے اپنے لیے ایک چہرہ وضع کر الیا
اس کے پیچھے
وہ جیا، مرا، مر کے دوبارہ زندہ ہوا
کئی بار
آج اس کا چہرہ
اسی چہرے کی جھریوں کا حامل ہے
لیکن اس کی اپنی جھریوں کا کوئی چہرہ نہیں ہے (۷۳)

محمود درویش کی شاعری میں بے چینی اور اضطرابی کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔ محمود درویش کی شاعری فلسطین کی آواز ہے' محمود درویش کی شاعری فلسطین کی زبان بول رہی ہے۔ فلسطین جس کرب سے گزر رہا ہے اسی کرب سے محمود درویش بھی گزر رہے تھے یہاں تک کہ محمود درویش پر گویا خبطی کی کیفیت آئی تھی' اسے خود کے بارے میں فیصلہ نہیں کر پایا کہ میں کہاں ہوں؟ اور میری کیا شناخت اور پہچان ہے۔

انا من هناک 'انا من هنا
ولست هناک،ولست هنا
لی اسمان یلتقیان ویفترقان
ولی لغتان ،نسیت بایهما(۷۴)

فلسطین غم کا استعارہ ہے' فلسطین حریت کا استعارہ ہے اور فلسطین بیگانگیت کی انتہا کا نام ہے۔ جس کا صرف نام رہ گیا ہے' باقی مال غنیمت کی طرح تقسیم ہو چکا۔ صیہونیت نے فلسطین کا پیچھا ابھی تک نہیں چھوڑا۔ اس ضمن میں انیس ناگی کا کہنا ہے:

محمود درویش کی نئی نظمیں بھی کم وبیش اس کے پرانے شعری تجربات کا اعادہ کرتی ہیں، وہی تنہائی وہی بے سروسامانی، بے وطنی وہی بچپن وہی یادیں' اب اسے جلاوطنی کا احساس غالب ہے۔ بلکہ ایک طرح کا انیگزائٹی نیروس نمودار ہوتا ہے کہ صیہونیت ایک موت کی طرح سے فلسطینیوں کا جلاوطنی میں بھی تعاقب کر رہی ہے (۷۵)

فلسطین ہونے کے باوجود محمود درویش اپنے آپ کو فلسطینی کہلوانے میں ناکام رہے۔ "فلسطین کے نام جلاوطنی کا غم نامہ" (رسالۃ الی المنفی) ان ایک مشہور نظم ہے' جس میں ایک جلاوطن اپنی ماں کو خط لکھ رہا ہے۔ جس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ شاعر انیگزائٹی نروس کا شکار ہے' جو اپنی ماں' والد' بھائی' دوست' عزیز واقارب کی خیریت دریافت

کرتے ہیں'اور تردد کرتے ہیں کہ ممکن ہے زندہ ہوں'ممکن ہے کہ انتقال کر گئے ہوں'گویا ایک تذبذب کی کیفیت شاعر پر طاری ہے۔آگے مزید لکھتے ہیں کہ ممکن ہے کہ بغیر پتا کے زندگی کے دن گزار رہے ہوں'کیا کسی کی بغیر شناخت اور عنوان کے کوئی قدر و قیمت بنتی ہے'اس حوالے سے محمود درویش کے یہ یہ اشعار قابل غور ہیں:

وانت یااماہ
ووالدی واخوتی،والاھل والرفاق
لعلکم احیاء
لعلکم اموات
لعلکم مثلی بلاعنوان
ماقیمۃ (۷۶)

محمود درویش کو بچپنے میں ہی جلاوطن ہونا پڑا اور لبنان میں ریڈ کراس کے آسرے پر پناہ گزینی میں قیام پذیر رہے'بعد ازاں وطن واپس لوٹے توخاص کر اپنے گاؤں کا نقشہ ہی مسخ ہو چکا تھا پورا گاؤں ملبہ بن چکا تھا'تو محمود درویش جب ہوش سنبھالتے ہیں تو انہی تجربات کو الفاظ کے قالب میں ڈال کر بیگانگیت کی کیفیات کو بہترین پیرائے میں بیان کیا۔بیگانگیت کیوں نہ طاری ہو'جس کے گھر کا پتا بدل گیا ہو'جس کے کھانے کا وقت مختلف ہو چکا ہو'جس کے تمباکو میں کمی واقع ہوئی'جس کے کپڑے کا رنگ اور شکل وصورت ہی غیر ہو چکی ہو اس پر بیگانگی نہیں آئے گی تو کیا آئے گی۔اپنی ایک نظم "قید خانہ" میں لکھتے ہیں:

میرے گھر کا پتا بدل گیا ہے
اور میرے کھانے کا وقت بھی
اور میرے تمباکو کی مقدار بھی
میرے کپڑوں کا رنگ
میرا چہرہ،میری شکل وشباہت (۷۷)

محمود درویش کو وطن سے دور رکھا گیا اور یہ دوری اس طرح کی تھی کہ محمود درویش وطن کی گود میں ہوتے ہوئے وطن کی قالین کو محمود درویش کے پیروں کے نیچے سے چھین لی گئی۔صرف وطن نہیں چھینا بلکہ سکون چھینا'چین چھینا'خوراک ولباس چھینے حد تو یہ ہے کہ شناخت چھین لی تو لامحالہ محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت در کر گئی۔اپنی ایک نظم "آدمی کے بارے میں" میں محمود درویش لکھتے ہیں:

جسے خوراک،لباس اور شناخت سے

محروم کر دیا گیا
جسے موت کی کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا
انہوں نے اس پر الزام لگایا: تم چور ہو[۷۸]
اماں' تم
اور میرے والد، رشتے دار اور دوست
شاید سب زندہ ہو
یا شاید وفات پا چکے ہو
یا شاید میری طرح تمہارا کوئی پتا موجود نہیں
ایک ملک کے بغیر، ملک کے جھنڈے کے بغیر
ایک آدمی کی حیثیت ہے؟
جس آدمی کا کوئی پتا موجود نہیں
اس آدمی کی دنیا میں کیا وقعت ہے؟[۷۹]

محمود درویش کی شاعری میں اپنے وطن سے دوری کا دکھ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ فلسطین کو بہن' محبوبہ اور کبھی ماں کے القابات سے پکارتے ہیں۔ بقول کشور ناہید " محمود درویش اپنی نظموں میں بیک وقت، زمین، عورت، میں اور تم کے ساتھ نظموں اور نثر کی روئیدگی کو باہم پیوست کرتا اور بیان کرتا ہے "[۸۰]

لیکن اسے اپنی بہن' محبوبہ اور ماں کے ہاتھ کی روٹی اور ماں کے ہاتھ کی بنی کافی پینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اپنی ایک نظم "ماں کے نام جلاوطن کا خط" میں محمود درویش پہلے اپنی شناخت کے نہ ہونے کا سوال اٹھاتا ہے کہ میں خط کو کس پتا پر ارسال کروں کونسی ڈاک اسے لے جائیگی؟ ہوائی اور زمینی راستے مسدود ہیں آخر میں اپنی ماں سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے۔ اماں' آپ' والد اور بہنیں زندہ ہیں یا فوت ہو چکے ہیں؟ اگر زندہ ہیں تو کیا کوئی بغیر پتا اور بغیر کسی ملک یا بغیر جغرافیہ کے زندہ بھی رہ سکتے ہیں جو زمان و مکان سے بالاتر ہو کر زندگی گزار سکے۔ اس مرحلے پر آکر محمود درویش پر بیگانگیت کا مہیب سایہ دراز ہوتا ہے اور یہ سایہ تادم مرگ جاری رہا۔ پس محمود درویش کی شاعری میں مزاحمت' جلاوطنی کے علاوہ بیگانگی کیفیت کا بیان دیدنی جس کی بیگانگیت کو پڑھتے ہوئے ہر معتدل قاری کے آنکھوں میں اختیار آنسو چھلکنے پڑتے ہیں۔

لہذا محمود درویش کی شاعری میں صوفیانہ بیگانگیت نہیں ہے البتہ فلسفہ وجودی کے مطابق جو بیگانگی کا فلسفہ در آیا ہے اس کے اثرات محمود درویش کی شاعری میں ملاحظہ کرسکتے ہیں کہ محمود درویش اپنے آپ کو انبوہ عظیم اور پر ہجوم فضا میں تنہا محسوس کرتے ہیں۔ محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت کے تین حوالے ملتے ہیں: اپنے آپ سے بیگانہ، اپنے گھر سے بیگانہ اور اپنے وطن سے بیگانہ۔

محمود درویش کو شروع میں شناختی کارڈ سے محروم رکھا گیا تو اجنبیت کی دھندلک صورت ذہن و فکر میں سما گئی 'بعد ازاں شعور کے درجے کو پہنچا تو یہ دیکھا کہ میں الگ ہوں اور میری ذات الگ ہے 'میں الگ ہوں اور میرے گھر الگ 'میں الگ ہوں اور میرا وطن الگ 'میرا وطن وہ نہیں جو میں سمجھ رہا ہوں۔ لہذا اسرائیلیوں کی چیرہ دستی کی وجہ سے شاعر پر بیگانگیت کے بادل منڈلاتے رہے۔ اور یہ بادل چھٹے نہیں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اسی بیگانگیت کے آثار کے ساتھ زمین سے رشتہ برقرار رکھنے کے لیے جان آفریں سرزمین فلسطین کے سپرد کرنے کی وصیت کی تاکہ اسرائیلی حکومت کی طرف سے پیدا کردہ بیگانگیت کا کچھ تو ازالہ ہو سکے۔

ج۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت کا تقابل:

فیض احمد فیض کی شاعری میں جہاں عشق و رومان 'سیاست اور سماج کے حوالے ملتے ہیں 'وہاں ان کی شاعری میں بیگانگیت کے افکار بھی ملتے ہیں۔ فیض کی شاعری میں متصوفانہ بیگانگیت نظر نہیں آتی۔ البتہ کارل کارکس کی سماجی بیگانگیت کی جھلکیاں دیدنی ہیں۔ بالخصوص فیض کی شاعری میں وجودی فلسفہ کی بیگانگیت بصورت اتم ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ فیض احمد فیض کے اوپر بیگانگیت غالب آنے کی وجوہات یہ ہیں۔ جنگ عظیم دوم 'تقسیم ہند 'طبقاتی نظام اور خاص کر آمریت کے شکنجے نے فیض پر بیگانگیت کے نقوش کو مستحکم کیے۔

فیض احمد فیض اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ فیض کی تنہائی اس وقت بڑھنی شروع ہوئی جب قام پاکستان کے بعد غیر مستحکم حکومتیں آتی گئیں جو بعد میں آمریت کی شکل اختیار کر گئیں۔ فیض بیگانگیت میں آکر دل کا حال ان الفاظ میں سناتے ہیں:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں (۸۲)

لہذا تقسیم ہند کے بعد امنگوں اور امیدوں کے ٹوٹ جانے پر فیض پر بیگانگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

فیض احمد فیض پر بیگانگی آنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ملک میں مارشل لاء کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا تو اثبات ذات کے لیے فیض نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور اسی جدوجہد کو فیض مجاہدہ کا نام دیتے ہیں۔ جو کہ شاعری کا فرض بھی ہے اور منصب کا تقاضا بھی۔

فیض احمد فیض ترقی پسند شاعر ہیں تو محمود درویش کا تعلق بھی مارکسی شاعروں سے بنتا ہے۔ فیض احمد فیض پر بیگانگیت کی ابتدائی فضا اس وقت طاری ہوئی جب فیض نے غم جاناں سے کسی حد تک کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے غم روز گار میں قدم رکھا۔ جیسا کہ فیض نے کہا

"دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا" یہاں سے فیض کا درد مزدوروں میں بٹ جاتا ہے۔ فیض مزدوروں کو طبقاتی کشمکش میں مبتلا دیکھا تو فیض کو کہنا پڑا "جب کبھی بکتا ہے بازاروں میں غریبوں کا لہو تو اپنے دل پر قابو ہی نہیں رہتا۔ یعنی محنت مزدور کرے اور عیاشی سرمایہ دار اٹھادے' یوں مزدور اور اس کی محنت میں مغائرت اور اجنبیت طاری ہوتی ہے۔ فیض نے انہی لوگوں کی بیگانگی کیفیت کو بیان کیا۔

اس کے مقابلے میں جب محمود درویش کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی بیگانگیت کا آغاز وہاں سے شروع ہوا جب وہ چھ سال کے تھے' پناہ گزینی اختیار کی' بعد ازاں سکول میں ایک نظم سنائی جو بیگانگیت کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ جبکہ محمود درویش ابھی بچہ تھا۔

فیض احمد فیض پر بیگانگیت کی ایک اور لہر تب آئی جب فیض نے پاکستان کو دیکھا' صرف پاکستان کو نہیں' قتل و غارت گری دیکھی' ہجرتیں دیکھیں' عصمتیں لٹتی دیکھیں' جغرافیہ کو تقسیم ہوتے دیکھا' تو "داغ داغ اجالا" اور "شب گزیدہ سحر" جیسے تراکیب سے اپنے اوپر چھائی ہوئی بیگانگی کا اظہار کیا۔ ترقی پسند تحریک کے لکھاریوں کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل ہو اور یوں ہر فرد کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر آزادی ملے لیکن جب انگریزوں سے تو آزادی مل گئی مگر استحصال' جبر اور طبقاتی نظام کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ برابر چلتا رہا فیض احمد فیض بھی آزادی کو "داغ داغ اجالا" اور "شب گزیدہ سحر" جیسے تراکیب سے یاد کرتے رہے. ڈاکٹر شاہین مفتی کا کہنا ہے کہ: نقش فریادی' زنداں نامہ' دست تہہ سنگ' شام شہریاراں اور مرے دل مرے سافر کے عنوانات غم نا کی' قید و بند کے کے جبر' انسانوں کے بنتے بگڑتے رشتوں اور ان کی معدوم ہوتی توقعات اور شاعر کی ازلی و ابدی تنہائی کے آئینہ دار ہیں (۸۳) فیض کی کئی نظموں میں بھی مختلف کیفیات مثلاً درد' محرومی' اجنبیت' برگشتگی اور تنہائی کا اظہار ملتا ہے۔ ان میں یاس' تنہائی' ہم لوگ' شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں' ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' قابل ذکر ہیں۔

فیض کی مشہور نظموں میں سے ایک نظم "بول" ہے۔اس نظم میں فیض کسی حد تک باغیانہ انداز اپناتے ہوئے دھیمے لہجے سے انحراف کیا ہے۔ فیض عالمی استعمار' معاشرتی جبر اور پاکستان کی ابتر صورتحال سے بیگانگی کے حصار میں آجاتے ہیں تو مقامی اور بین الاقوامی محکوم و مقہور عوام کو ظلم و جبر کے خلاف آواز اُٹھانے کی تلقین کر رہے ہیں یعنی جب تک مقامی اور عالمی سطح پر اپنی ذات کا اثبات کرتے ہوئے محکوم طبقہ اپنے وجود کا احساس نہیں دلائیں گے' سرمایہ داری کی وجہ سے بیگانگیت کا بھیانک سایہ مزید طول پکڑے گا

محمود درویش کے اصلی مخاطب اسرائیل ہے' لیکن اس نظم شناختی کارڈ (بطاقة هوية) میں محمود درویش ایک اسرائیلی سے مخاطب ہیں۔ جو اسرائیلی سپاہی کو بغیر کسی خوف اور ڈر کے اپنی شناخت کروا رہے ہیں کہ لکھو! میں عرب سے اپنا رشتہ رکھتا ہوں'

محمود درویش جب اپنے آپ کو بیگانگی میں دیکھتے ہیں تو بیگانگی کی فضا کو ختم کرنے کے لیے مزاحمتی رویہ اپناتے ہیں 'اور اس مزاحمت میں محمود اپنے وجود وشناخت کا عرفان رکھتے ہوئے اپنے وجود کے اثبات کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ اب محمود درویش ظلم برداشت کرنے پر آمادہ نہیں' نفرت اور غصہ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں' نتیجے میں دھمکی آمیز لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔

ہاں تو پہلے ہی صفحے پر سب سے اوپر یہ لکھو
مجھ کو انسانوں سے کوئی بغض یا نفرت نہیں
لیکن اتنا ہے کہ اگر میرا رزق اگر چھن جائے گا
غاصبوں کا گوشت بھی کچا چباؤں گا میں
بس ڈرو تم بھوک سے میری ڈرو
اور میرے غیض و غضب سے ڈرو (۸۴)

فیض احمد فیض آمریت' طبقاتی استحصال اور سماجی عدل و انصاف کے قتل عام کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کے دل میں بیگانگیت کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے' نتیجے میں انہیں ہر جگہ 'انتظار' غم روزگار' طوق دار اور جبر کے موسم نظر آتے ہیں اگر نہیں ہے تو بہار، اختیار اور چمن کے نکھار کے موسم نہیں۔ جیسا کہ اپنی ایک نظم "طوق و دار کا موسم" میں فیض کا کہنا ہے کہ

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم

نہیں ہے کوئی بھی موسم' بہار کا موسم (۸۵)

اس کے مقابلے میں محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت بڑے شد و مد کے ساتھ آئی ہیں۔ محمود درویش اپنے وطن سے بیگانہ رہے' کم از کم اتنا تجربہ فیض کو نہیں ہوا' فیض کے پاس کہنے کو تو وطن تھا' محمود اس سے بھی محروم تھا۔ محمود درویش کو اپنی شناخت نصیب نہیں ہوئی۔ شناخت وطن سے ملتی ہے' وطن نہیں رہا، شناخت گھر سے ہے گھر بچا نہیں یہاں تک کہ درویش اپنے آپ سے بھی اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ درویش کی شاعری میں بیگانگیت کے تین حوالے ملتے ہیں ایک یہ کہ انہیں اپنے وطن سے بیگانگیت ہے' دوسرے درجے پر اپنے گھر اور علاقے سے بیگانگیت آخری مرحلے میں اسے پنے آپ سے بیگانگیت حاصل ہے۔

فیض احمد فیض نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ فیض اپنے ملک اور قوم کے لیے اشتراکی نظام چاہتا تھے اور ان کا نظریہ بھی سراسر ترقی پسندی پر مشتمل تھا' جس نہج پر فیض سوچ رہے تھے وہ اور جو پاکستان کی اجتماعی سیاسی فضا بالکل الگ زاویہ پر قائم تھی تو فیض پر عدم مطابقیت اور بیگانگیت کا احساس غالب آنے لگا۔ نتیجہ میں فیض اجتماعی انصاف اور عدالت کی خاطر مزاحمتی شاعری جاری رکھی اور اپنی بیگانگیت سے باہر آنے کے لیے جدوجہد کو جاری رکھا لیکن فیض کچھ کا کچھ سوچتے رہے اور کچھ اور ہوتے گئے' فیض بیگانگی کے اس دور میں اپنی ذات کے اثبات کے حوالے سے اپنی ایک نظم "مرے درد کو جو زبان ملے" میں لکھتے ہیں:

مرا دردِ نغمہ بے صدا
مری ذات ذرہ بے نشاں
مرے درد کو جو زبان ملے
مجھے اپنا نام و نشان ملے
مری ذات کا جو نشان ملے
مجھے راز نظم جہاں ملے (۸۶)

محمود درویش نے وطن کو غور سے دیکھا وطن کہیں میسر نہیں آیا' جیل میں' جلاوطنی میں اور وطن میں جلاوطنی کی کیفیت میں' پناہ گزینی میں الغرض خود ساختہ جلاوطنی میں کہیں بھی انہیں وطن دکھائی نہیں دیا۔ وطن ایک خواب رہا' ہر چیز کی پہچان نشان سے ہوتی ہے صیہونیوں کی سازش اور استعمار سے ساز باز کی وجہ سے فلسطین کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا فلسطین کا چہرہ مسخ کر دیا گیا فلسطین کی تاریخ کو جان بوجھ کر بدل ڈالا، فلسطین بم بارود اور بلڈوز کی نذر ہو گیا۔ تو نتیجے

میں فلسطین محمود درویش سمیت دیگر فلسطینیوں سے کوسوں دور چلا گیا اب واپسی ممکن نہیں لگتی۔ لیکن محمود درویش نے اپنی شاعری کی زمین فلسطین کو قرار دیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ فلسطین سے وابستگی اور پیوستگی بر قرار رہے لیکن صیہونیت آڑے آجاتی ہے اور بے دخل کرنے سے صیہونیت باز نہیں آتی۔ فلسطین سے ملن کی شدت سے انتظار ہے لیکن یہ عنقا بنتا جارہا ہے تو لا محالہ ایک اجنبیت کا جال بنتا ہوا پایا جس میں محمود دریش الجھ کر رہ گئے۔

محمود درویش کو اپنے گھر کی نسبت سے بھی بیگانگیت محسوس ہوئی' ان کے مطابق گھر شام کو بخیر و عافیت لوٹنے کا نام ہے لیکن محمود درویش جب چھ سال کے تھے تو گھر چھوڑ کر بیروت میں پناہ گزین ہوئے' پھر زندگی میں کبھی گھر نہیں لوٹے۔ لہذا گھر کی نسبت سے بھی بیگانگیت ان کی شاعری میں بھی در آئی ہے۔

محمود درویش کو فلسطین سے بلا کی محبت ہے' عشق ہے' پیار ہے اور خلوص ہے' ایثار ہے۔ فلسطین کی مثال چرواہے سے دیتے ہیں ایسے چرواہے سے جس کے پاس بھیڑیں نہیں' اور جو تلاش میں نکلنے والوں سے راہ فرار ڈھونڈنے کی کوشش میں ہو' فلسطین کو کھنڈروں میں دیکھتا ہے اور آخر میں محمود درویش فلسطین کو محبوب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو یقیناً ایک باغ کی مانند تھی لیکن تم مجھ سے اجنبی تھی۔ اپنی نظم "فلسطین سے عاشق" میں لکھتے ہیں:

میں نے خار دار پہاڑی پر تمہیں دیکھا
تم ایک چرواہا تھیں' اپنی بھیڑوں کے بغیر
اپنا تعاقب کرنے والوں سے فرار پاتے ہوئے
میں تمہیں کھنڈروں میں دیکھا
تم میرا باغ تھیں اور اجنبی تھا
تمہارے دل کے دروازے پر دستک دیتا ہوا (۸۷)

فیض احمد فیض کی شاعری میں ذاتی بیگانگیت کم اور اجتماعی بیگانگیت کچھ زیادہ نظر آتی ہے کیونکہ فیض کی شاعری صرف اپنی ذات تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ فیض ایک عوامی اور انسانی درد رکھنے والے شاعر ہیں۔ فیض احمد فیض کی اپنی زندگی بھی غور کیا جائے تو بیگانگیت کی مرقع ہے' کبھی جیل میں تو کبھی دیار غیر میں کبھی عشق مجازی میں اجنبیت کا احساس تو کبھی سقوط ڈھاکہ کی وجہ سے اجنیت کا کربناک احساس' گو کہ فیض کی ذات' اجتماعی فضا اور پھر اس کی ترجمانی میں فیض کی شاعری کا معتدبہ حصہ بیگانگی پر مشتمل ہے۔ اپنی ایک نظم "سوچ" میں لکھتے ہیں:

میرا دل غمگیں ہے تو کیا

غمگیں یہ دنیا ہے ساری
یہ دکھ تیرا ہے نہ میرا
ہم سب کی جاگیر ہے پیاری (۸۸)

فیض نے اپنی شاعری میں "اپنے لیے "میں "کی بجائے "ہم "کا لفظ استعمال کیا ہے۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فیض کی شاعری اپنی ذات تک محدود نہیں'ان کی شاعری مظلوم ومقہوراور بے بس ولاچار عوام کی آواز ہے۔انہوں نے بیگانگیت کی فضا سے باہر آنے کے لیے شاعری کا سہارا لیااور معاشرے سے بیگانگیت کا مقابلہ جدوجہد سے کرنے پر زور دیا۔مذکورہ اشعار میں بھی فیض نے اسی کی طرف اشارہ دیا کہ ہم اپنی بقاکے لیے اور ظلم وجبر کی طاقتوں اور حصار کو توڑنے کے لیے لوح وقلم کی پرورش کرتے رہیں گے۔

محمود درویش کی شاعری بھی اس کی ذات اور تمام فلسطینیوں کا اجتماعی تجربہ ہے۔لہذا جب محمود درویش اپنا نام لے کر شاعری کرتے ہیں تو اس سے مراد فلسطین کا ہر ہر فرد ہے۔ محمود درویش اپنے آپ کو بھی دو حصوں میں تقسیم ہوئے دیکھتے ہیں۔ایک وہ جوان کا اپنا وجود ہے ایک وہ جو صیہونیوں نے کرتوتوں کی وجہ سے محمود درویش کا ہیولی بنا۔لہذا اپنے نام اور ذات کے اعتبار سے بھی محمود درویش عالم بیگانگی میں نظر آتے ہیں'محمود درویش لکھتے ہیں:

میں اپنے آپ کو دو حصوں میں منقسم دیکھتا ہوں
ایک میرا نام'دوسرا میں خود (۸۹)

محمود درویش کی شاعری میں فلسفہ وجودیت کی اصطلاح "بیگانگیت" بھی درآئی ہے۔ محمود درویش نے فرانسیسی ادیبوں اور دانشوروں خاص کر سارتر سے فکری رہنمائی لی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں کامیو جیسے ادیبوں کی بیگانگی کا نظریہ بھی درآیا ہے۔ نظریہ بیگانگی آج کے انسان کی تصویر کشی اس انداز میں کرتا ہے کہ انسان آج کے پر ہجوم دور میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔اوراس تنہائی میں وہ اپنے آپ کو سب سے الگ تصور کرتا ہے جہاں کوئی بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہوتا تولا محالہ ایک بے معنویت کی کیفیت انسان پر طاری ہوتی ہے اوراس بے معنویت سے نکلنے کے لیے انسان جدوجہد کا سہارا لیتا تاکہ زندگی کی جنگ جاری رکھ سکے۔ محمود درویش بھی بھرے لوگوں میں'ہجوم عام میں اپنے آپ کو تنہائی میں دیکھتا ہے جہاں اس کا پرسان حال نہیں۔اس کی ذات سے جہاں اس کا نام تک ہتھیالیا ہو وہ اپنا آپ کیسے جی سکتا ہے۔شاعر کا نام اور شناخت اس کے وطن سے ہے جو کہ شاعر سے بیگانہ ہوچکا ہے۔اب

محمود درویش وطن کو تخیلاتی فرض کرتے ہوئے ایک ایک جغرافیہ مرتب کرتے ہیں اس میں کھیت بھی ہے اور وہ کھیت نظم ہے۔ جس میں وہ اپنے دکھ' درد اور بیگانگیت کے ہل چلاتے ہیں۔

مجھے کوئی اپنے عقب میں نہیں دکھائی دیتا'

نہ اپنے سامنے

میں انبوہ میں بھی اکیلا محسوس کرتا(۹۰)

لہذا محمود درویش کی شاعری میں صوفیانہ بیگانگیت نہیں ہے البتہ فلسفہ وجودی کے مطابق جو بیگانگی کا فلسفہ معرض وجود میں آیا اس کے اثرات محمود درویش کی شاعری میں ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ محمود درویش اپنے آپ کو انبوہ عظیم اور پر ہجوم فضا میں تنہا محسوس کرتے ہیں۔

فیض احمد فیض کا شمار اردو کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات اور اسالیب میں تنوع ہے 'کلاسیکیت اور جدیدیت کا حسین امتزاج بھی ہے' ان کی شاعری میں غم جاناں سے لے کر غم روز گار سے آگے انسانیت کی آواز بھی جلوہ گر ہے۔ فیض احمد فیض نے پابلو نرودا' ناظم حکمت سے جہاں کسب فیض حاصل کیا وہاں مارکسزم سے بھی گلے ملایا۔ فیض نے غالب سے فلسفیانہ رنگ لیا تو اقبال سے بلند آہنگ و فکر بھی اخذ کیا' فیض کی شاعری صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ ایڈورڈ سعید کی نو آبادیاتی فکر کی جھلک بھی ملتی ہے وہاں استعماریت کے پھیلاؤ کے جدید اسالیب کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔

فیض کی شاعری میں مزاحمت و انقلاب' جلاوطنی کی طرح ایک اور موضوع بیگانگیت کا ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ فیض کی بیگانگی کی شاعری کے پیچھے پاکستان کے مجموعی سیاسی فضا اور عالمی استعماری کوششیں ہیں۔ جن کی وجہ سے فیض پر بیگانگی طاری ہو گئی ہے۔ فیض کی شاعری میں تصوف کی بیگانگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ ان کی شاعری میں مارکسی بیگانگی اور وجودی بیگانگی اپنی پوری شدت کے ساتھ آئی ہے۔ جس کے نتیجے میں فیض پر تنہائی طاری ہوئی' کرب میں رہے' اضطراب کی کیفیت میں رہے' ایک بات اور قابل غور ہے کہ فیض کی شاعری میں اجتماعی بیگانگیت زیادہ ہے۔ اس بیگانگیت سے نکلنے کے لیے فیض مزاحمت پر اور جدوجہد پر زور دیتا ہے۔ فیض دوسرے وجودیوں کی طرح موت کو خوفناک تصور نہیں کرتے' ایک مذہبی پس منظر اور اقبال سے رہنما کے ہوتے ہوئے فیض نے موت سے فرار نہیں کیا بلکہ فیض کہہ گئے۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

محمود درویش بچپنے میں جلاوطن ہوا اور بیروت میں پناہ گزینی اختیار کی۔ اور کس قدر مشکل ہے یہ مرحلہ جہاں صاحب عزت اور شرف کے لوگ صدقہ وخیرات پر پلنے کو مجبور ہو جائے۔ جہاں ریڈ کراس جیسے ادارے کے سہارے لوگ زندگی بسر کریں ان انسانوں کی وقعت ہو گی' محمود درویش اس مرحلے پر آکر اجنبیت کا اظہار اپنے والد سے مخاطب ہو کر کر رہے ہیں میرے والد بزرگوار ہم ریڈ کراس کی اولاد ہیں یا آپ کی اولاد ہماری شناخت کیا ہے ؟ یہاں پر "میں" کو نابود کیا گیا ہے' لیکن پھر بھی عالم بیگانگی میں فلسطین کے ذکر سے غافل ہوتے ہوئے محمود درویش نظر نہیں آتے

محمود درویش کی شاعری میں جہاں مزاحمت کے عناصر ملتے ہیں وہاں جلاوطنی کی کیفیات بھی دیدنی ہیں۔ محمود درویش نے بچپنے میں ہی جلاوطن ہونے کا کربناک تجربہ کیا۔ اور یہ بچپنے کے جلاوطنی کا کرب تاحین حیات جاری رہا۔ اسی تجربے کی کارفرمائی محمود درویش کی شاعری میں جابجا ملتی ہے۔ محمود درویش کی شاعری کا ایک اور اہم عنصر بیگانگیت ہے۔ ان کی شاعری میں بیگانگیت کے افکار وطن بدری، پناہ گزینی اور ظلم وجبر کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں۔

فیض کی شاعری میں انسانیت کا درد گہرا ہے۔ انہوں نے آزادی اظہار اور محروم طبقے کی آزادی کے لیے آواز بلند کی۔ اور یہ کہ ایک انقلابی شاعر کو رجائی شاعر بھی ہونا چاہیئے فیض کی شاعری میں رجائی پہلو بھی نمایاں ہے۔ فیض نے مایوسی اور قنوطیت کی شاعری نہیں کی البتہ سماج اور ان کے آپس میں مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے بیگانگی در آئی' پھر بھی فیض نے جدوجہد کے جاری رکھے جانے کے لیے مجاہدین کا حوصلہ بڑھایا۔

محمود درویش عالم بیگانگی میں بھی پر امید نظر آتے ہیں وہ بیگانگی کے سیلاب میں اپنی شاعری کو نہیں بہاتے بلکہ اس کربناک کیفیت سے نبرد آزما ہونے کے لیے امید کے دامن کو نہیں چھوڑتے اور یوں بیگانگیت کی وحشت ناک دشت میں امید کے بیج بوتے ہوئے محمود درویش نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شاہین مفتی، جدید اردو نظم میں وجودیت، مقالہ پی ایچ ڈی اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲۵

۲۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص ۳۴

۳۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، نقش فریادی، ص ۶۸

۴۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، دست صبا، ص ۷۰

۵۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، شام شہر یاراں، ص ۵۳

۶۔ اشفاق حسین، حبیب عنبر دست، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۹

۷۔ فاطمہ حسن، فیض اور تنہائی، مشمولہ: ارتقاء، مطبوعات، کراچی، شمارہ ۵۳، جون ۲۰۱۲، ص ۱۹۵

۸۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، نقش فریادی، ص ۶۲

۹۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص ۹۲

۱۰۔ محولہ بالا ص ۱۵۵

۱۱۔ اردو شاعری پر وجودیت کے اثرات، ص ۳۳۳

۱۲۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، نقش فریادی، ص ۴۷

۱۳۔ آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۸۷

۱۴۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص ۸

۱۵۔ نسخہ ہائے وفا، نقش فریادی، ص ۸۴

۱۶۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، دست صبا، ص ۳۱

۱۷۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، فیض نامہ، ص ۴۰۱

۱۸۔ نسخہ ہائے وفا، نقش فریادی، ص ۴۶

۱۹۔ فیض احمد فیض نسخہ ہائے وفا، نقش فریادی، ص ۵۵

۲۰۔ محولہ بالا، ص ۵۶

۲۱۔ محولہ بالا، نقش فریادی، ص ۸۲، ۸۳

۲۲۔ محولہ بالا، ص

۲۳۔ منصور احمد قریشی، ڈاکٹر، فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری، مشمولہ: ارتقاء، ص ۱۹۵

۲۴۔ فتح محمد ملک، فیض شاعری اور سیاست، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۱
۲۵۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، سر وادی سینا، ص ۴۱
۲۶۔ شاہین مفتی، جدید اردو نظم میں وجودیت، ص ۲۲۴
۲۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مرے دل مرے مسافر، ص ۳۱
۲۸. محولہ بالا، ص ۶۸
۲۹۔ www.urdulinks.com ۲۰۱۹ جولائی، 5:30am
۳۰۔ نسخہ ہائے وفا، دست صبا، ص ۴۲
۳۱۔ حسن مجیدی، الخصائص الفنی فی شعر درویش، ۲۰۱۱ء، ص ۸
۳۲۔ دنیازاد، کتاب ۲۳، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۴
۳۳۔ محولہ بالا
۳۴۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، قوسین، لاہور، طبع اول، ۲۰۱۵ء، ص ۹۸
۳۵۔ منو بھائی، فلسطین فلسطین (محمود درویش کی انقلابی شاعری) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء
۳۶۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۶۸
۳۷۔ محمود درویش، الاعمال الکاملۃ ا، حالۃ الحصار، ریاد الرئیس بکس، بیروت، ۲۰۰۹، ص ۱۷۸
۳۸۔ اجمل کمال، مترجم: محاصرہ (محمود درویش کی ایک طویل نظم)، آج، ادبی کتابی سلسلہ، کراچی، شمارہ ۴۷، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۲۳
۳۹۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۶۷
۴۰۔ محمود درویش، الاعمال الکاملۃ ا، ص ۱۷۹
۴۱۔ اجمل کمال، مترجم: محاصرہ (محمود درویش کی ایک طویل نظم)، شمارہ ۴۷، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۲۴
۴۲۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۶۶
۴۳۔ محمود درویش، الاعمال الکاملۃ ا، حالۃ الحصار، ص ۱۸۷
۴۴۔ اجمل کمال، مترجم: محاصرہ (محمود درویش کی ایک طویل نظم)، شمارہ ۴۷،، ص ۳۴
۴۵۔ محولہ بالا، ص ۳۵
۴۶۔ محمود درویش، الاعمال الکاملۃ ا، حالۃ الحصار، ص ۲۲۴

۴۷۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۲۲۳

۴۸۔ محمود درویش، لاتعتذر عما فعلت، مؤسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ، ص ۱۲

۴۹۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۲۱۶

۵۰۔ الاعمال الکاملہ، محمود درویش، ص ۳۱۲

۵۱ www.aikrozan.com ۳ مئی ۲۰۱۸ء، 2:30pm

۵۲۔ محولہ بالا

۵۳۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۲۱۲

۵۴۔ منو بھائی، مترجم: فلسطین فلسطین (محمود درویش کی انقلابی شاعری)، ص ۱۸۲

۵۵۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۱۵۶

۵۶۔ محولہ بالا، ص ۸۷

۵۷۔ محولہ بالا، ص ۱۶۱

۵۸۔ منو بھائی، مترجم: فلسطین فلسطین (محمود درویش کی انقلابی شاعری)، ص ۴۶

۵۹۔ محولہ بالا، ص ۲۰

۶۰۔ محمود درویش، عاشق من فلسطین، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵

۶۱۔ منو بھائی، مترجم: فلسطین فلسطین (محمود درویش کی انقلابی شاعری)، ص ۲۶

۶۲۔ محولہ بالا، ص ۸۹

۶۳۔ محولہ بالا، ص ۱۱۲

۶۴۔ محمود درویش، احبک اولا احبک، مؤسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ، ص ۱۶

۶۵۔ منو بھائی، مترجم: فلسطین فلسطین (محمود درویش کی انقلابی شاعری)، ص ۱۴۰

۶۶۔ محمود درویش، احبک اولا احبک، مؤسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ، ص ۱۶، ص ۱۵

۶۷۔ منو بھائی، مترجم: فلسطین فلسطین (محمود درویش کی انقلابی شاعری)، ص ۱۳۸، ۱۳۹

۶۸۔ محولہ بالا، ص ۱۵۰، ۱۵۱

۶۹۔ محمود درویش، اوراق الزیتون، بطاقۃ ھویہ، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ، ص ۴۸

۷۰۔ حامد یزدانی، مترجم: محمود درویش: سال کی پہلی نظم، مشمولہ: دانشور، شمارہ ۶، ۱۹۹۰ء، ص ۶۸

۷۱۔ سعادت سعید، محمود درویش: ایک تعارف، مشمولہ: دانشور، ۲۳ص
۷۲۔ انیس ناگی، مترجم المتنبیٰ کا سفر (محمود درویش کی ایک نظم)، دانشور، سہ ماہی ادبی رسالہ، ص ۳۷
۷۳۔ سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر، مترجم محمود درویش از نظم: چہرہ، مشمولہ: دانشور، ص ۶۳
۷۴۔ محمود درویش، کزھر اللوزاوابعد، مؤسہ محمود درویش، دارالناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ،
۷۵۔ انیس ناگی: ریت اور دوسری نظمیں، دانشور، سہ ماہی ادبی رسالہ، ء ص ۳۰
۷۶۔ محمود درویش، الاعمال الاولیٰ، اوراق الزیتون، رسالۃ المنفی، ص ۴۷
۷۷۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۵۵
۷۸۔ محولہ بالا، ص ۴۶
۷۹۔ محولہ بالا، ص ۳۷
۸۰۔ کشور ناہید، تتلی کا بوجھ اٹھانے والا شاعر، مشمولہ: ماہانہ اخبار اردو، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۷۸
۸۲۔ فیض احمد فیض، دست صبا، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۲۶
۸۳۔ جدید اردو نظم میں وجودیت، ص ۲۲۵
۸۴۔ محمود درویش اوراق لزیتون، ص 82
۸۵۔ فیض احمد فیض، دست صبا، ص ۴۰
۸۶۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، شام شہر یاراں، ص ۴۰
۸۷۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۶۶
۸۸۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۴
۸۹۔ فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، ص ۲۱۶
۹۰۔ محولہ بالا، ص ۶۴

باب پنجم

مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات

الف: مجموعی جائزہ

ادب پر دنیاکے دیگر علوم وفنون اورافکارو نظریات اثرات ہیں'یہی وجہ ہے کہ فلسفہ'سماجیات'نفسیات 'سائنس اشتراکیت وسرمایہ داریت'نوآبادیاتی نظام'اوروجودیت کی مختلف شمعیں ادب میں جلتی نظر آتی ہیں۔ادب زندگی کاترجمان ہے'جب تک انسان میں جذبات واحساسات کی دنیا آباد رہے گی'ادب کاچشمہ فیض بھی برابر جاری رہے گا''ادب برائے ادب"یاادب برائے زندگی اس بحث میں پڑے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ادب ہر دور کی ضرورت رہی ہے'البتہ ادب میں اظہار کے اسالیب مختلف رہے ہیں۔ادب ایک طبیب کی مانند معاشرہ کو دیکھتا ہے تاکہ معاشرہ سے ناسور کے خاتمہ کے لیے راہیں ہموار ہوسکے۔

ادب ایک وسیع وعریض دریاہے جس میں کئی رجحانات اوررویوں کی ندیاں بہتی چلی آئی ہیں۔ادب ایک ایسافن ہے جس میں کافی وسعت پائی جاتی ہے'اس میں عالمگیریت اورآفاقیت کی صفت بھی پائی جاتی ہے۔بہت سے ادیب اور شاعر ایسے گزرے جن کے فن پارے تاریخ سے ماوراہو کر کلاسیک کی شکل اختیار کرچکے ہیں۔ادب میں وسعت کے ساتھ ساتھ وسعت ظرفی اور قلبی بھی کمال درجے کی ہے'یہی وجہ ہے کہ ادب نے ہر دوراورزمانے کے حالات کواپنے اندررچ بس لیا۔یوں نئے رویوں'رجحانات اور تحریکوں کوخوش آمدید کہا'انہی رویوں اور تحریکوں کے جذب وانجذاب سے ادب کاقد کاٹھ بڑھا'ادب میں چاشنی آئی'ہرچند کہ ادب پھلتااور پھولتارہا۔ادب میں فروغ پانے والے جدیدرویوں اوررجحانات میں سے تین اہم رویے اوررجحانات مزاحمت'جلاوطنی اوربیگانگیت ہے۔مقالہ نگارکاموضوع بھی فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں مذکورہ افکارکاتقابلی جائزہ کو متضمن ہے۔

مزاحمت یعنی مدافعت'تاریخ بشریت کااہم عنصر رہاہے۔ہرعہد میں اور ہر دور میں مزاحمت کاسلسلہ برابر جاری رہاہے۔دوسرے لفظوں مزاحمت ایک سماجی عمل ہے'جوسماج کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ چلتی آئی ہے۔پدرسری نظام سے جاگیرداریت تک'جاگیرداریت سے بادشاہت تک'بادشاہت سے سرمایہ داریت تک اورآج کے استعماری نوآبادیات کے پھیلاؤتک ہر دور میں مزاحمت کئی رویے اوررجحانات سامنے آئے'بیشتراوقات یہ تحریک کی صورت بھی اختیار کرگئی۔

تاریخ میں جہاں جاگیرداریت وملوکیت کے خلاف مظلوموں مقہوروں اور محروموں کی مزاحمت جاری رہی وہاں شاعرو ادیب بھی اپنی تحریروں 'اپنی تقریروں اوراپنی شاعری میں مزاحمت کافریضہ سرانجام دیتے رہے۔اگر دیکھاجائے توہر نیاادب اپنی جگہ ایک مزاحمت کادرجہ رکھتاہے'اگراس بات سے اتفاق نہ کرے تو یہ بات توواضح ہے کہ ہر اچھاادب مزاحمت کی دین ہے'یعنی ادیب نے پرانی روایت سے انحراف کرکے نیارجحان سامنے لانے کی جب طرح ڈالی تب سے مزاحمتی ادب کی کونپلیں نکل آتی ہیں۔مزاحمتی ادب'انکار کافلسفہ ہے۔یعنی معاشرے میں پیداشدہ صورتحال کونہ مانانااوراپنے لیے بہتر مستقبل کاتعین کرکے جدوجہد جاری رکھنامزاحمت ہے۔اگر یہی اظہارادب میں ہوجائے تومزاحمتی ادب کی تشکیل ہوجاتی ہے۔مزاحمتی ادب کاچلن ادب میں ہمیشہ سے چلتا آیاہے'لیکن اسے ایک رجحان کی حیثیت فلسطینی شعرانے دی۔جب اسرائیل کی آبادکاری کاسلسلہ شروع ہوااوراس کے پیچھے استعمار کی بڑی سازشیں کارفرماتھیں توجہاں اسرائیلی چنگل سے نکلنے کے لیے فلسطینی مجاہدین مقاومت دکھاتے رہے اور جام شہادت نوش کرتے رہے'وہاں فلسطینی ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنی ذمہ داریوں کااحساس کیااوریوں ایک رجحان کے طورپر مزاحمتی شاعری کوبام عروج تک پہنچایا۔کیونکہ فلسطینیوں کاتجربہ بڑاتھاتواس وجہ سے مزاحمتی شاعری اپنی جوانی کے ساتھ نمودار ہوئی۔

وطن انسان کے لیے چین اورامن کی علامت ہے۔انسان کے لیے پناہ گاہ اس کاملک ہے۔جس وطن کی نعمت حاصل نہ رہے اسے احساس ہوتاہے کہ وطن کیاچیز ہے۔ہر انسان کوفطری طورپراپنے وطن سے پیار ہوتاہے۔حدیث کی روشنی میں بھی وطن سے محبت رکھناایمان کاحصہ ہے۔جس انسان کووطن کی آغوش میسر نہ رہے'جسے وطن کی چھتری ڈھانپ نہ سکے'جسے وطن کادامن تھامنانصیب نہ ہواس بدنصیب کوجلاوطن (شخص) کہاجاتاہے۔تاریخ میں جلاوطنی کئی طرح سے وجود میں آتی رہی ہے'اگر کسی کی معیشت گرتی رہے توبہتر معاشی حالات کے لیے وطن سے کہیں دور چلاجاتاہے'اس سفر کوہجرت بھی کہہ سکتے ہیں۔اسی طرح کوئی بھی مقصد وطن کوخیرباد کہہ گھر سے نکلتاہے تو یہ بھی سفر کی قسم ہے۔کبھی کبھار حاکم اور بادشاہ کسی کواپنی حکومت اوراقتدار کے لیے خطرہ سمجھتا ہے تواسے جلاوطن کردیاجاتاہے۔جلاوطن کی ایک اور صورت یہ ہے کہ جہاں انسان پرملک کی ایجنسیوں کے پہرے اتنے سخت ہوتے ہیں کہ جہاں اسے جینامشکل ہوجائے توایسا شخص بھی وطن سے باہر زندگی گزارتا ہے'اس جلاوطنی کوخوداختیار کردہ جلاوطنی یاخودساختہ جلاوطنی کی کہاجاسکتاہے۔جلاوطنی کی ایک کیفیت یہ ہوتی ہے جہاں انسان یوں تواپنے وطن میں زندگی گزاررہاہے لیکن وہ ایک بے چینی اوراضطرابی کیفیت میں ہوتاہے'جلاوطنی کی اس کربناک کیفیت کوملک بدیسی

بھی کہا سکتا ہے۔ جلاوطنی کی ایک اور قسم علامتی ہے۔ اسے پناہ گزینی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جلاوطنی جب ملک میں انارکی اور جنگی حالات پیدا ہوتے ہیں تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد کچھ مدت کے لیے پناہ گزینی اختیار کر لیتی ہے۔

جدید ادب میں جگہ بنانے والے افکار میں سے ایک جلاوطنی ہے۔ جلاوطنی اور ادب کا رشتہ بھی کوئی نیا رشتہ نہیں ہے۔ ادب کا نقطہ آغاز اگر یونان کے ادب کو قرار دیا جاتا ہے تو یونان میں دو ادب پارے ہومر کے مشہور ہوئے 'ایلیڈ اور اوڈیسی' مؤخر الذکر کی پوری کہانی اوڈیسیس کے وطن واپسی کے گرد گھومتی ہے۔ اسی طرح جدید ادب کی بات کی جائے تو سدھارتھ بھی اسی جلاوطنی کی کیفیات کا عکاس ہے۔ عربی ادب کا اگر مطالعہ کیا جائے تو "اجڑے دیار" پر رونے کی روایت دور جاہلی کے نامور شاعر امر القیس سے ہی ملتی ہے 'لیکن ایک رجحان کے طور پر جلاوطنی کی شاعری 'نو آبادیات سے جلاوطن ہونے والے ادیبوں کے ہاں بھرپور انداز میں نظر آتی ہے۔

عہد جدید کے افکار میں سے ایک وجودیت ہے۔ وجودیت' مذہب، سائنس اور فلسفہ کی کلیت سے انکار پر مشتمل نظریہ ہے۔ اس کی رو سے انسان اس کائنات میں تنہا ہے۔ انسان کا کوئی ساتھ دینے والا کوئی نہیں' اس مشینی دور میں انسان کی شناخت سوالیہ نشان بن گئی' اشیاء کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے' انسان اپنے آپ کو بے وقعت دیکھتا ہے۔ تو نتیجے میں انسان میں مغائرت یا بیگانگی کے حصار میں محبوس ہو جاتا ہے۔ اس مغائرت اور بیگانگی کا ازالہ کرنے والا انسان کسی کو نہیں پاتا تو وہ اپنی ذات کی تلاش میں اپنے ہی پاتال میں آباد ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے ہر چیز لایعنی نظر آتی ہے۔ یہاں جب اس کی زندگی مشکل میں پڑ جاتی ہے تو وہ جدوجہد کا راستہ اپناتا ہے' اپنا راستہ خود تلاشنے کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر انسان اقدار و روایات کا انکار کرتا ہے' اس پر کرب کی فضا طاری ہو جاتی ہے' اسے ہمیشہ خوف لاحق رہتا ہے' خوف کی ایک مثال موت ہے۔ زیادہ تر وجودی موت کے بعد خوشی کے طلبگار نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ تصوف کے مطابق موت کے بعد جزو' کل میں ضم ہو گا تو سکون پائے گا۔

مقالہ نگار کا مقالہ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں مزاحمت' جلاوطنی اور بیگانگیت کے افکار کے تقابل پر مشتمل ہے۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش دونوں ہم عصر شاعر ہیں۔ دونوں مارکسزم سے متاثر ہیں اور دونوں کی شاعری کی عمارت مارکسزم پر استوار ہے۔ دونوں کو لینن امن ایوارڈ ملا۔ دونوں نے "لوٹس" کی ادارت کی' دونوں نے اپنی زندگی میں ہی بڑی شہرت پائی' دونوں جیل میں رہے البتہ جگہ کا فرق تھا' ایک اسرائیلی جیلوں میں رہے تو دوسرا آمریت کے اشارے پر پاکستانی جیلوں میں' دونوں انسانیت کے شاعر ہیں' دونوں امن کے شاعر ہیں' البتہ فیض

پاکستانی اور اردو کے شاعر ہیں' جبکہ محمود درویش فلسطینی اور عربی زبان کے شاعر ہیں' علمی حلقوں میں غالب واقبال کے بعد فیض کا نام آتا ہے' جبکہ محمود درویش فلسطین کے قومی شاعر ہیں۔ دونوں کی شاعری میں مزاحمت پائی جاتی ہے۔ دونوں نے جلاوطنی کاٹیں' البتہ فیض کی جلاوطنی خود اختیار کردہ جلاوطنی تھی' جبکہ محمود درویش کی جلاوطنی جبری جلاوطنی تھی۔ البتہ محمود درویش نے خود ساختہ جلاوطنی بھی اختیار کی' اور پناہ گزینی بھی اختیار کی۔ اس حوالے سے وہ فیض سے زیادہ کرب میں نظر آتے ہیں۔ فیض احمد فیض نے پاکستان کو بنتے دیکھا وہاں پاکستان کی زبوں حالی کا بھی مشاہدہ کیا' پھر پاکستان سے وابستہ توقعات پوری ہوتی ہوئی نظر نہ آئی تو بیگانگیت فیض کی شاعری میں درآئی۔ اس کے علاوہ عالمی منظرنامے کی وجہ سے بھی خاص کر آمریت کی وجہ سے وہ نہیں ہوا جو فیض چاہتے تھے' نتیجے میں شاعر پر بیگانگی کی فضا چھا جاتی ہے۔ اسی طرح محمود درویش کو اپنا گھر' گاؤں اور وطن کی نعمت میسر نہیں آئی' وہ فلسطین میں تھے' لیکن فلسطین اس سے کہیں دور تھا' فلسطین کو وہ اپنا کہتے تھے' لیکن وہ اس کا نہیں ہوا' نتیجے میں بیگانگیت کی فضا ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو بن کر سامنے آتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فیض احمد فیض سراسر مزاحمتی شاعر ہیں؟ کیا فیض کی شاعری مزاحمت کے گرد گھومتی ہے؟ یا فیض کی شاعری کی اور جہات ہیں؟ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ فیض احمد فیض کی شاعری کے کئی زاویے اور جہات ہیں۔ انہوں نے رومان سے ترقی پسندیت تک کا سفر کیا' وطن سے لے کر فلسطین اور افریقا تک سے بھی راہ رسم رکھی' گویا ان کا سفر انسانیت تک جا پہنچی۔ ان حوالوں سے دیکھا جائے تو فیض کو صرف مزاحمت یا صرف مارکسزم' یا صرف سیاسی یا صرف رومان کے شاعر کی حیثیت سے اجاگر کرنا فیض کی ہمہ جہتی کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا فیض کی شاعری میں سے ایک جہت مزاحمت ہے۔

فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری کو ان زمروں اور جہات میں بیان کرسکتے ہیں: آمریت کی مخالفت میں مزاحمتی شاعری، استعماری طاقتوں کے خلاف مزاحمتی شاعری، مذہبی ظاہر داری اور جاگیرداری کے خلاف مزاحمت اور سماجی وطبقاتی استحصال کے خلاف مزاحمت۔

فیض احمد فیض کا شمار بنیادی طور پر ترقی پسند تحریک کے ادیبوں میں ہوتا ہے' جو مارکسزم کے نظریے کا پرچار کر رہے تھے۔ فیض احمد فیض نے جب پاکستان کو دیکھا تو پاکستان کی حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی' پہلے پہل روزگار کے مسائل' مہاجرین کے مسائل' دفاعی نظام کی کمزوری الغرض پاکستان مشکلوں میں گھرا ہوا دیکھا' دوسری جانب اسلامی نظریہ کے بل بوتے پر حاصل کیا ہوا پاکستان میں جاگیرداری اور طبقاتی نظام کی جڑیں مضبوط ہونے

لگی'فیض نے تاریخی اور سماجی اور مستقبل کا شعور رکھتے ہوئے ایک نظم آزادی پر لکھی۔فیض کی یہ نظم ان کی قیام پاکستان کے بعد کی شاعری میں مزاحمتی شاعری کے لیے مسالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔اس نظم میں فیض نے "یہ داغ داغ اجالا" اور "شب گزیدہ سحر" کی تراکیب لاکر قیام پاکستان کے فوری بعد کے حالات کو بیان کیا۔اس نظم میں مزاحمت ادبی چاشنی کے ساتھ ابھرتی نظر آتی ہے۔اس نظم کی روشنی میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ فیض کی شاعری میں صرف گھن گرج نہیں'بلکہ اس کی شاعری فکر کو بھی مہمیز دیتی ہے۔

فیض نے قیام پاکستان کے بعد "پاکستان ٹائمز کی ادارت سنبھال لی'فیض پاکستان مخالف شاعر نہیں ہیں'وہ ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے زندگی گزارتے رہے۔پاکستان ٹائمز میں فیض کے لکھے ہوئے اداریے میں بھی طن دوستی کے کئی حوالے دیکھے جاسکتے ہیں'البتہ فیض پاکستان میں جو نظام رائج رہا اس سے خائف تھے'ان کا اختلاف بھی اپنی جگہ درست معلوم ہوتا ہے'وہ وطن جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا'وہ وطن جسے لا الہ الا اللہ کے نعرے سے حاصل کیا گیا'اس وطن میں خاص نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے جاگیرداری بڑھتی جارہی تھی'سماجی استحصال عروج پر تھا'مزدوروں کا پرسان حال کوئی نہ تھا'فیض ایک مستقبل شناس شخص تھا جنہوں نے پاکستان مخالف نعرہ نہیں لگایا بلکہ سماجی مساوات پر مبنی نظام کے نہ ہونے پر احتجاج کیا'پاکستان جب بنا تو پاکستان کے پس منظر میں عربی'فارسی اور ہندی تینوں تہذیبیں کارفرما تھیں'اب ان میں سے کس کے ساتھ منضم ہو جائے؟ایک تشکیک کی کیفیت میں پاکستان کا نظام قائم رہا'جس کا فیض مخالف رہے'وقت آنے پر یہ عقدہ کھلا کہ فیض کا اختلاف اپنی جگہ درست تھا'کہ اس نظام کے بطن سے آمریت کو راہ ملی'اور یوں پاکستان بننے کے بارہ تیرہ سال کے بعد سے ہی آمریت سیاہ گھٹائیں ایسی چھا جاتی ہیں کہ ہر طرف بے چینی اور اضطراب کی کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری کے پس منظر میں آمریت مضمر ہے۔یعنی فیض کی شاعری میں اگر مزاحمت کے پہلو نظر آتے ہیں تو اس کی وجوہات میں سے بنیادی وجہ مارشل لائی نظام ہے۔فیض احمد فیض جیسا کہ پہلے بھی بتایا کہ ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شعرا میں سے ہیں'فیض احمد فیض ایک مارکسی شاعر ہونے کے ناتے فیض احمد فیض کو حکومتی افراد نے مشکوک نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا'اور یوں حکومت کی طرف سے راولپنڈی کیس میں فیض کو جیل سزا سنادی'فیض جھکنے اور ہارنے والے نہیں تھے'فیض کو فیض احمد فیض بنانے میں جیل کا کلیدی کردار رہا ہے۔فیض اگر جیل نہ پہنچتے تو اتنے بڑے شاعر شاید نہ بن پاتے۔فیض احمد فیض جب حکومت اور ایجنسیوں کی آنکھوں میں ایک دفعہ کھٹک گئے تو پھر فیض سختیوں اور مشکلات سے باہر نہیں آسکے۔یہاں تک کہ ۱۹۵۸ء میں جب پہلی بار مارشل

لاءنافذ ہو جاتا ہے'تو زبان پر مہریں لگ گئیں'لوح و قلم چھن گئے'اظہار کی آزادی عنقا بن گئی تو فیض نے جیل کی کوٹھڑی میں خون دل میں انگلیاں ڈبو کر پرورش لوح و قلم کی طرح ڈالی۔یوں فیض نے مزاحمتی شاعری کا بیڑا اٹھایا اور آمریت کے ساتھ مفاہمانہ پالیسی کو یکسر رد کرتے ہوئے انکار کے فلسفہ کو ترجیح دی'آج آمریت دم توڑ چکی ہے'لیکن فیض کی شاعری آج بھی زندہ ہے۔اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مزاحمتی شاعری ہنگامی شاعری نہیں ہے'شاعر اپنا تجربہ اس میں شامل کر کے قوت تخیل اسے حیات جاودانی دیتی ہے۔

فیض کی شاعری میں جنرل ایوب اور ضیاء الحق دونوں کے مارشل لاء کے بارے میں مزاحمتی پیرایہ اظہار ملتا ہے۔فیض نے آمریت کی مخالفت میں جہاں مزاحمتی شاعری کی'وہاں فیض نے آمریت کے زیر سایہ زندگی گزارنے والے غریب اور نادار لوگوں کی حمایت میں بھی شاعری کی ہے'یہی وجہ ہے کہ جب طبقاتی استحصال کے زیر اثر جب بازار میں غریبوں کا لہو بہتا ہے تو فیض کو اپنے سینے میں آگ کے ابلنے کا احساس ہوتا ہے اور فیض یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ "میرے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے"فیض نے آمریت کی جہاں کھل مخالفت کی وہاں فیض نے علامتی پیرائے میں مزاحمتی رویہ اپنائے رکھا۔اسب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فیض نے علامتی شاعری کیوں کی؟مزاحمتی اور انقلابی شاعری عوام کے لیے ہوتی ہے تو عوام کیسے سمجھ پائے گی؟جواب یہی دیا جائے گا کہ فیض احمد فیض نے اگر علامتی پیرایہ اظہار کو بروئے کار لایا ہے تو یہ وقت کی ضرورت تھی'سنسر شپ کا موسم تھا'اظہار پر تعزیریں تھیں'قلم پر پابندیاں تھیں'اس وجہ سے فیض احمد فیض نے علامت کا سہارا لیا۔فیض کی علامتیں غیر مانوس اور انفرادی نہیں ہیں'فیض نے کلاسیکی علامتوں کا سہارا لیا ہے۔اگر معمولی سی فکر کے ساتھ فیض کے عہد کو دیکھتے ہوئے فیض کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو فیض کی علامتوں پر مشتمل شاعری کی بہ آسانی تفہیم ہو سکتی ہے۔

فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری کا ایک اور اہم پہلو استعمار مخالف شاعری ہے۔فیض احمد فیض سیاسی اور سماجی شعور رکھنے والے شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں جہاں غم جاناں کا برملا اظہار ہے وہاں فیض کی شاعری میں " تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے "کی کیفیتیں بھی پائی جاتی ہیں۔اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فیض کی شاعری میں ایک ارتقاء پایا جاتا ہے پہلے فیض رومان کی طرف راغب رہے'پھر "مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ "جیسے تقاضے کر کے مارکسی فکر کا ابلاغ کرتے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔جب جلاوطنی اختیار کر جاتے ہیں تو فیض ذہنی اور فکری ارتقاء حاصل کر کے تیسری دنیا کی حمایت میں اور استعماری طاقتوں کی مخالفت میں مزاحمتی شاعری کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔فیض کی شاعری خاص کر نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی کئی نظمیں استعمار کی مخالفت میں نظر آتی ہیں۔اس

حوالے سے ایک ان کی آجاؤافریقا'ویتنام'وجہ ربک'ایرانی طلبہ کے نام'اور بول جیسی نظمیں قابل ذکر ہیں۔فیض کی شاعری کا ایک اوراہم محور فلسطین رہاہے۔بیروت میں قیام کے دوران فیض نے عملی میدان میں بھی فلسطینیوں کا ساتھ دیا۔ان کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔فلسطین کو فیض اپنادوسرا گھر سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ فیض نے "میرے زخموں نے کئیے کتنے فلسطین آباد" جیسے مصرعے استعمال کر کے فلسطین سے گہری وابستگی کا اظہار کیااور بحیثیت مسلمان و بحیثیت ظلم کے مخالف ہونے کے ناتے اسرائیل کی مخالفت کی اور فلسطینیوں کا ساتھ دیا۔

فیض احمد فیض نے کلاسیکی شاعری سے استفادہ کرتے ہوئے مذہبی جاگیرداری اور ظاہرداری کے حوالے سے مزاحمتی شاعری بھی کی ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فیض مذہب مخالف شاعر ہو'بلکہ فیض نے مذہب کالبادہ اوڑھ کرلوگوں کا استحصال کرنے والے مذہبی کرداروں کی مخالفت کی ہے۔فیض کی شاعری میں شیخ'مفتی'ناصح'فقیہہ'واعظ جیسے الفاظ آئے ہیں تو ان سے مراد ہر عالم اور مولوی نہیں ہے بلکہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو یاتو استعمار ہیں'یا استعمار کے آلہ کار ہیں یاوہ لوگ مراد ہیں جو مذہب کا نام لے ریاکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے عوام کے مال کو آمریت کی ہمرہی میں ہتھیالیتے ہیں یاوہ لوگ ہیں جو چند سکوں کے عوض اپناایمان بیچ کا یک طرفہ فتویٰ صادر کرتے ہوئے آمر کا ساتھ دیتے ہوئے بے گناہوں کا خون کرجاتے ہیں۔لہذاان کرداروں کی بھی فیض نے خوب خبرلی ہے۔

فیض احمد فیض سماجی شعور کے حامل شاعر تھے'انہوں نے غریبوں'ناداروں کے بارے میں بھی بہت سوچا'ان کے حقوق کے لیے آوازیں اٹھائیں'یہی باتیں آمر حکمرانوں کو اچھی نہیں لگیں تو فیض کو جیل کی سلاخوں میں بند کردیا گیا۔فیض کی خوبی ہے کہ فیض اپنی بات نہیں کرتے بلکہ فیض اجتماع کی بات کرتے ہیں'فیض انسانیت کی بات کرتے ہیں'یہی وجہ ہے کہ فیض نے "میں" کالفظ کم ہی استعمال کیاہے'ان کی شاعری میں اکثر "ہم" کالفظ اکثر طور پر دکھائی دیتا ہے۔لہذا فیض انسانیت کے شاعر ہیں'فیض عدل ومساوات کے علمبردار ہیں'فیض امن عالم کے خواہاں ہیں'جس کے لیے انہوں نے آمریت'سماجی استحصال'مذہبی ظاہرداری'استعماری عناصر کا بیباکانہ انداز میں مزاحمتی شاعری کی۔ان کی مزاحمتی شاعری میں رومانوی کسک بھی موجود ہے'اس حوالے یہ کہاجاسکتا ہے کہ فیض بنیادی طور پر رومانوی سیاسی شاعر تھے ان کی شاعری میں رومان وانقلاب کا حسین امتزاج پایاجاتاہے۔

محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کا جائزہ لیاجائے تو محمود درویش اور فیض احمد فیض میں کئی اشتراکات دیکھے جاسکتے ہیں۔فیض احمد فیض کی ابتدائی شاعری کلاسیکی شاعری کی ہی روایت کا حصہ ہے'اسی طرح محمودودرویش کی ابتدائی

شاعری بھی کلاسیکی عرب شاعری کی تقلید ہے۔ محمود درویش بھی فیض کی طرح مارکسی شاعر تھے' وہ اسرائیل میں مارکسی پارٹی راکھا کے رکن بھی رہے۔ فیض پاکستان میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے' بعد میں جب پابندی لگی تو پاکستان ٹائمز میں ادارت کے فرائض سرانجام دیے۔ محمود درویش نے بھی کئی رسالوں جیسے الکرمل' الاہرام' کی ادارت کی' اور فیض طرح انہوں نے بھی "لوٹس" کی بھی ادرات کی۔ محمود درویش فیض کی طرح سیاسی شاعر تھے۔ انہوں نے باقاعدہ طور پر سیاست میں حصہ لیا اور یاسر عرفات کا دایاں بازو بنے رہے بعد ازاں اوسلو معاہدہ پر اختلاف کی وجہ سے علحدگی کا اعلان کیا۔ فیض پاکستان بننے کے بعد میں مروجہ نظام خائف رہے' اسی طرح محمود درویش بھی اسرائیلی قیام کے حق میں نہیں تھے۔ جب پاکستان میں آمریت آئی تو فیض نے آمریت کی مخالفت کی تو فلسطین کی آبادکاری بڑھتی گئی یہاں تک کہ محمود درویش کے گاؤں 'البروہ" کا نقشہ تک تبدیل کیا گیا تو محمود درویش بچپنے میں ہی پناہ گزین بنے' فیض کے مقابلہ میں محمود درویش کو یہ تلخ تجربہ پیش آیا اس کی وجہ سے محمود درویش بچپنے میں ہی مزاحمتی شاعری کے راستے پر گامزن ہوئے۔ فیض کرکٹر یا حافظ قرآن بننا چاہتے تھے' دونوں نہیں بنے البتہ شاعر بن گئے اسی طرح محمود درویش مصور بننا چاہتے تھے' معیشت کچھ بہتر نہ ہونے کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہ ہو سکی البتہ انہوں نے شاعری میں خوب تصویر کشی کی ہے۔

فیض احمد فیض پاکستان میں مارکسی نظریات کے فروغ نہ پانے کی وجہ سے خائف رہے تو انہوں نے مزاحمتی شاعری کا رخ کیا اسی طرح محمود درویش آزادی کے ساتھ اپنے ملک میں رہنے کا موقع میسر نہیں آیا تو زمانہ طالب علمی میں مزاحمتی شاعری میں پناہ لی۔ محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کا بنیادی محور فلسطین ہے وہ فلسطین کی آزادی اور فلسطین میں قیام امن کے لیے انقلابی نغمے گاتے رہے۔ محمود درویش کو کبھی جلاوطن کیے' تو کبھی قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا رکھا لیکن ایک متعھد شاعر ہونے کے ناتے فلسطین سے وابستگی کو دشمن طاقتیں ختم نہ سکیں۔ محمود درویش لفظ کی حرمت کے قائل تھے' ان کی شاعری گویا محاذ جنگ ہے۔ جس سے دشمن کو کافی خطرہ لاحق رہا۔ محمود درویش نے اپنی شاعری کے ذریعے دنیا والوں پر واضح کیا کہ فلسطین میں انسانیت کا قتل ہو اجا رہا ہے' بنیادی انسانی حقوق بھی غریب اور نادار عوام کو نہیں مل رہے' روزانہ کئی جوان شہادت کا درجہ حاصل کر جاتے ہیں' ان گھمبیر صورتحال کو دنیا والے دیکھتے ہیں تو ایک ہمدردی سی پیدا ہو جاتی ہے' نتیجے میں صیہونیت کا سیاہ چہرہ دنیا والوں پر آشکار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمود درویش کو فلسطین کی سانس کہا گیا' محمود درویش نے فلسطین سے عشق کیا اور اپنے معشوق کے حصول کے لیے انقلابی نغمے گائے جو آج تک ہر فلسطینیوں میں زبان زد عام ہیں۔

محمود رویش کی شاعری میں فلسطینی عوام کے دکھ درد کے بیان کے ساتھ دنیا کے دیگر غریب اور نادار لوگوں کے حق میں بھی مزاحمتی شاعری ملتی ہے۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ محمود درویش ایک آفاقی اور عالمگیر سوچ رکھنے والے شاعر ہیں جو فیض کی طرح انسانیت کے لیے شاعری کرتے نظر آتے ہیں'ہر مزاحمت کار میں محمود درویش کی مزاحمتی شاعری دشمن کی صفوں میں جاکر لڑنے کا حوصلہ دیتی ہے۔

محمود درویش کی شاعری میں استعمار مخالف شاعری بھی نظر آتی ہے۔ان کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ استعماری طاقتیں کئی عرصے سے منڈی کی تلاش میں رہی ہیں اور منڈی کو تلاشنے کے بعد نو آبادیات مملکتیں وجود میں لائی گئیں۔وہاں کے ذخائر اور وسائل کو اپنے قبضے میں لیے'یہ سلسلہ اب بھی توسیعی شکلوں میں قائم ودائم ہے۔البتہ اس کا اسلوب اور طریقہ کار ہر دور میں مختلف رہا ہے۔نو آبادیات کے نتیجے میں تیسری دنیا وجود میں آئی'جو استعمار کے شکنجے میں محبوس ہوتی گئی اور استحصال کا شکار رہی۔ محمود درویش نے اسی تیسری دنیا کے لوگوں کو جگانے کے لیے فیض کی نظم "بول" کے اسلوب میں نظمیں کہی ہیں۔لہذا استعمار مخالف شاعری فیض اور محمود درویش دونوں کے ہاں نظر آتی ہے۔

محمود درویش کی شاعری میں براہ راست مزاحمتی شاعری ملتی ہیں وہاں فیض کی طرح علامتی شاعری بھی ملتی ہے۔انہوں نے زیتون'صلیب'پینے لوپیا اور اوڈیسیس جیسے علائم کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہیں۔فیض کی طرح علامتی شاعری کرنا محمود درویش کی مجبوری تھی'سر عام براہ راست مزاحمتی لب ولہجہ اختیار کر لیتے تو اسرائیلی حکام کی طرف سے خطرہ تھا اس لیے محمود درویش نے مزاحمتی شاعری کی۔عوام اس حد تک ان کی شاعری سے مانوس ہو چکی تھی کہ ان کی شاعری کو اجنبی کی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیا اور گلی کوچوں میں ان کی نظمیں انقلابی نغمے کے طور پر گائی جانے لگیں۔

فیض احمد فیض کی شاعری میں ایک اور اہم جہت جلاوطنی ہے۔فیض کی جلاوطنی کی شاعری کا بغور مطالعہ کی اجائے تو فیض کی اس شاعری کو تین زمروں میں بیان کر سکتے ہیں۔ایک یہ کہ جب فیض جیل گئے تو وہاں جیل فیض کو دیار غیر کی طرح لگا۔گویا ایک جلاوطن کی طرح انہوں نے وطن اور وطن کے باسیوں کو یاد کیا۔اس حوالے سے انہوں نے "نثار تیری گلیوں پر" جیسی نظمیں تحریر کیں۔

فیض احمد فیض کو جب جیلوں سے رہائی نصیب ہوئی تو فیض کے ایجنسیوں کی ایک بڑی جماعت فیض احمد فیض کی نگرانی پر مامور ہوئیں۔فیض پر جب اس طرح کے پہرے بٹھائے گئے تو فیض مجبور ہو کر وطن کو خیر باد کہنے

پر مجبور ہوئے۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فیض کی جلاوطنی خود اختیار کردہ تھی؟ یا فیض کو ملک بدر کیا تھا؟ آسان لفظوں میں یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ فیض نے جلاوطنی بہ امر مجبوری اختیار کی 'البتہ کسی آمر نے فیض کو جلاوطن نہیں کیا'اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فیض کی جلاوطنی کے پیچھے آمریت کا ہاتھ نہ ہو'' "ہوا پھر سے حکم صادر" جیسی تراکیب سے یہ سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ فیض کی جلاوطنی کہنے کو تو اختیاری جلاوطنی تھی'لیکن اس جلاوطنی کے پس منظر میں جبر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔یعنی جہاں اظہار پر پابندی ہو'جہاں آزاد فضامیں سانس لینا دشوار ہو'جس کے پیچھے حکومتی مشینری چالو رہے وہ شخص جلاوطنی اختیار نہیں کریں گے تو اور کیا کرے گا۔

فیض احمد فیض نے دو دفعہ جلاوطنی اختیار کی'دونوں جلاوطنی انہوں نے مارشل لاء کے دور میں اختیار کی'ایک جلاوطنی جنرل ایوب خان کے دور میں تو دوسری جلاوطنی ضیاء الحق کے دور میں اختیار کی۔پہلی جلاوطنی میں فیض نے لندن کو بسیرا کیا۔فیض جب جلاوطن ہر کر لندن پہنچتے ہیں تو ان کے محبوب بدل جاتا ہے'اس سے پہلے فیض عشق مجازی کے گن گاتے رہے اور پھر غم جاناں سے بھی آگے چل غم روزگار تک جا پہنچے۔اب لندن میں ان کا محبوب وطن ٹھہرتا ہے۔جس کے لیے فیض "لیلائے وطن" جیسے تراکیب استعمال کیے ہیں۔

فیض نے دوسری جلاوطنی میں بیروت کو اپنا مسکن بنایا۔اس دوران فیض کو عرب کے بڑے نامور ادیبوں کی رفاقت حاصل ہوئی۔ محمود درویش سے دوستی بھی بیروت سے ہی عمل میں آئی۔فیض نے بیروت میں قیام کے عرصے میں فلسطین پر بڑی اچھی شاعری کی۔ان نظموں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ فیض بھی گویا فلسطینی بن چکے تھے اور باقاعدہ اسرائیل کے خلاف نبرد آزما ہو کر میدان میں رجز خوانی کر رہے ہوں۔الغرض فیض بیروت پہنچ کر فیض کا عشق،فلسطین سے ہو گیا۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالات وواقعات اور ذہنی وفکری ارتقاء کے ساتھ فیض کا محبوب بدلتا رہا۔

انہوں نے اپنی جلاوطنی کے دوران جو نظمیں لکھی ہیں ان نظموں میں کئی پیرایے'اظہار کے ملتے ہیں۔ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔سادہ بیانیہ،علامتی بیانیہ اور ناسٹلجیائی بیانیہ۔فیض ایک مقصدی اور پیغام کے شاعر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ فیض نے آسان اسلوب اپنایا ہے۔فیض کے الفاظ وتراکیب کی واضح اکثریت کلاسیکی شاعری سے تعلق رکھتی ہے'اسی وجہ سے ان کی شاعری پڑھتے ہوئے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔اس بھی قابل تعریف یہ بات ہے کہ فیض احمد فیض نے انقلابی اور مزاحمتی شاعری کی طرح جلاوطنی کی شاعری بھی عام فہم بنا کر قارئین کے حوالے کیے ہیں تاکہ بہ آسانی تفہیم ہو سکے۔اس حوالے سے ان کی مشہور زمانہ نظم "میرے دل'مرے مسافر ہے جہاں فیض برملا کہہ رہے ہیں کہ "ہوا پھر سے حکم صادر'کہ وطن بدر ہو کہ تم "فیض احمد فیض کی جلاوطنی کی شاعری میں ایک اور انداز علامتی

شاعری ہے۔ فیض نے علامت کا سہارا لے کر جلاوطنی کی شاعری کی ہے۔ کبھی وہ صبا سے غربت نصیب ذکر وطن کا قصہ چھیڑتے ہیں تو کبھی وطن کو فیض لیلائے وطن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیلائے وطن کے بارے میں دو احتمال دے سکتے ہیں ایک یہ کہ اس مراد قابل رحم وطن ہو' جس کو آمریت کے سیاہ بادل کے گھیرے میں رکھا' یا یہ کہ وطن کے باسی ہیں جو آمریت کی چکی میں پستے رہے' الغرض وطن عوام سے ہے' عوام کو ہی انہوں نے لیلائے وطن کی ترکیب استعمال کی ہے۔ دیار غیر میں بھی فیض اپنے ہم وطنوں کو نہیں بھولے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض پر ناسٹلجیائی کیفیتیں بھی طاری رہیں۔ ناسٹلجیا ایک ادبی اصطلاح ہے۔ اس کے معنی ماضی پرستی' ماضی کی طرف ذہنی میلان' ماضی میں پناہ لینا وغیرہ کے ہیں۔ ناسٹلجیائی کیفیت میں شاعر وطن اور وطن سے وابستہ چیزوں کو بہت یاد کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ناظم حکمت کی ایک نظم بڑی مشہور ہوئی' فیض احمد فیض نے بھی اس نظم کا منظوم ترجمہ کیا یہ نظم "جو آہ میرے وطن سے شروع ہو کر واہ مرے وطن پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس نظم میں وطن سے سلے کپڑے' جوتی' ٹوپی وغیرہ کے بیان سے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شاعر کو وطن سے کس حد تک وابستگی اور عشق ہے۔ جس سے منسوب ہر چیز شاعر کو اچھی لگتی ہے۔ اور اس سے منسوب چیزوں کو یادگار کے طور پر خواب و خیال میں محفوظ رکھتے ہیں' یہی ناسٹلجیا فیض کے ہاں بھی ملتی ہے۔ کہ جو دیار غیر میں ہوتے ہوئے ذہنی سفر کر کے وطن پہنچتے ہیں' وطن کی خبر لیتے ہیں' اور وطن کو مزید خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وطن کو خوبصورت بنانے کے لیے ہی تو فیض نے لیلائے وطن جیسے الفاظ استعمال کیے۔

فیض کی شاعری میں "بے گھری" کا استعمال بھی خوبصورت انداز میں در آیا ہے۔ گھر آرام و سکون اور چین سے زندگی کرنے کا نام ہے محمود درویش کے مطابق گھر ماں کے ہاتھ کی بنی روٹی کھانے 'کافی پینے اور جب مر جائے تو پاؤں پھیلا کے سونے کا نام ہے۔ فیض کی زندگی بے گھری سے عبارت رہی یہی وجہ ہے ان شاعری میں بے گھری کے موضوع بڑے جاذب انداز میں در آیا ہے۔

فیض نے گھر" اور غربت" کے روایتی موضوع کو تازہ کیا اور اس طرح انہوں نے وطن سے دوری اور سیاسی جلاوطنی کا نیا موضوع پیدا کیا۔ غربت "کی جگہ یہی بے گھری" کبھی کبھی سیاسی جلاوطنی کی علامت بن جاتی ہے۔ اس غربت میں شاعر کی اجنبیت اور تنہائی کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے لیے گھر اور وطن کی یاد دل کے درد کا مرہم بن جاتی ہے۔

فیض احمد فیض نے دوسری جلاوطنی ضیاء الحق کے دور میں اختیار کی' یہ دور پہلے سے بھی زیادہ پر آشوب دور تھا' اس دور میں مذہب کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کا استحصال کیا گیا بھٹو جیسے عظیم لیڈر کو ساز باز کر کے حیلے بہانے سے

تختہ دار پر لٹکایا گیا تو فیض نے "مرے دل مرے مسافر" جیسی نظمیں لکھتے ہوئے جلاوطنی کی راہ لی۔ اس دفعہ فیض بیروت میں قیام پذیر ہوئے۔ فیض بیروت جب پہنچے تو عرب شاعروں سے جہاں ملاقاتیں رہیں وہیں پر فیض کی یاسر عرفات جیسے فلسطینی رہنما سے راہ رسم قائم ہوئی۔ بیروت میں قیام کے دوران بیروت جب میدان جنگ بنا تو فیض نے فلسطینیوں کا ساتھ دیا اور ان کے مجاہدین کے حوصلے بڑھاتے رہے جس کے لیے فیض نے "ویبقی وجہ ربک" جیسی نظمیں تحریر کیں۔ فیض فلسطین کو اپنا دوسرا گھر سمجھتے تھے' انہوں نے اس مانوس انداز میں فلسطین پر شاعری کی کہ گویا فیض بھی فلسطینی ہے' جن کی شاعری میں ایک فلسطینی کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ جیسا کہ فیض کا کہنا ہے کہ اگر تمہارے دشمن نے ایک فلسطین جو برباد کیا تو یہ بات ذہن میں بٹھالیں کہ ہم بھی خاموش تماشائی نہیں بنے بیٹھیں گے ہم بھی علم بغاوت بلند کرنے کے ساتھ ساتھ جوش اور ولولے سے اپنی آزادی کے لیے کوششیں جاری رکھیں گے اور اپنے جذبات اور خیالات میں بھی فلسطین کو آباد کرتے رہیں گے "میرے زخموں نے کئے کتنے فلسطین آباد" اور فیض نے فلسطین یاد کا دیا ہمیشہ جلائے رکھا' جہاں بھی گئے فیض فلسطین کے دکھ درد کو ساتھ رکھ کے گئے "تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے"

جیسا کہ پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ ہوا کہ فیض کے عشق کا زاویہ بدلتا رہا۔ غم جاناں' غم روزگار، لیلائے وطن آگے جا کر ایک ذہنی سفر اختیار کرتے ہوئے فیض نے فلسطین کو اپنا وطن شمار کیا' مزید دنیا کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو فیض کا پرندہ خیال افریقہ پہنچ جاتا ہے تو فیض ایک افریقی باشندے کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ "آجاؤ افریقہ "اس حوالے سے مشہور نظم ہے۔ فیض کا یہ ذہنی سفر یہاں تک رکا نہیں بلکہ ان کا سفر انسانیت تک جا کر رک جاتا ہے۔ یعنی ان کی شاعری انسانیت کی شاعری ہے۔ جس میں انسان کا دکھ پورے وجعد کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ آمریت کے زیر اثر انسانی کرب کا مشاہدہ جہاں فیض کی شاعری میں کر سکتے ہیں وہاں پر جلاوطنی کے نتیجے میں ایک انسان جس کرب سے گزرتا ہے' اس کا بہترین پیرایہ میں اظہار بھی فیض کے ہاں ملتا ہے۔

فیض احمد فیض کا عشق بھی مختلف اور متعدد رہا' عشق مجازی کبھی غالب رہا تو کبھی لیلائے وطن سے تو کبھی فلسطین سے آگے بڑھتا ہوا عشق افریقہ تک پہنچ گیا' یعنی ان کے عشق کا خلاصہ کیا جائے تو ان کا عشق انسانیت سے تھا۔ "تو پھر فلسطین بھی وطن ہو گیا۔ اور جب کہا کہ " میں افریقہ ہوں 'دھار لیا میں نے تیرا روپ "تو افریقہ بھی وطن ہو گیا۔ گویا فیض احمد فیض کی شاعری میں جہاں جلاوطن شخص کے ذہنی کرب کا بیان ہے وہاں دوران جلاوطنی' فیض وطن

سے بالاتر ہو کر غریبوں اور مقہوروں کا ہمنوا اور ہم وطن بن جاتے ہیں اور ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔

محمود درویش کی شاعری کا مجموعی لیا جائے تو محمود درویش کی شاعری فلسطین کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ محمود درویش کی ابتدائی شاعری پر کلاسیکی عربی ادب کا گہرا اثر رہا'بعد ازاں ناظم حکمت اور پابلو بروداسے اثر لے کر جلاوطنی کے کرب کو جدید نظم کے اسالیب میں بیان کیا۔ محمود درویش کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو محمود درویش کی زندگی جلاوطنی سے عبارت ہے۔جب محمود درویش چھ سال کی عمر کو پہنچے تھے'اچانک راتوں رات بیروت جا پہنچے'یہ پہلا تجربہ تھا جہاں سے محمود درویش پناہ گزین کے نام سے آشنا ہوئے۔جوں جوں وقت گزرتا گیا محمود درویش کے شعور میں ارتقاء کے ساتھ کرب بھی بدستور بڑھتا رہا۔ محمود درویش ایک مارکسی شاعر تھے انہوں نے ایک مارکسی نگاہ سے فلسطین کو دیکھا اور پھر اس کی آزادی کے لیے مارکسی نظریات کو پس منظر کے طور پر اخذ کیا۔یہی وجہ ہے کہ کارل مارکس کی پیروی میں ان کی انقلابی شاعری میں رومانویت کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کرنے کی ایک وجہ جلاوطنی ہے۔ محمود درویش اپنے سمیت دوسرے فلسطینیوں کو اس کرب سے نکالنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے مزاحمتی شاعری کی راہ اپنائی تاکہ آزادی فلسطین میں اپنا حصہ ڈال سکے۔

محمود درویش کو اپنی زندگی میں جلاوطنی کے کئی پہلو کا بذات خود تجربہ ہوا۔جلاوطنی کی ایک صورت ہے کہ کہ حکومت کو کسی فرد سے خطرہ لاحق ہو جائے تو اسے جلاوطن کیا جاتا ہے'محمود درویش وہ شاعر ہیں جس کی شاعری اسرائیلی وجود کے لیے خطرہ کی گھنٹی تھی'اس لیے محمود درویش کو جلاوطن کیا گیا۔جلاوطنی کی دوسری جہت یہ ہے کہ کوئی اسے جلاوطن نہیں کرتا وہ شخص اپنے اختیار سے جلاوطنی اختیار کر جاتے ہیں'محمود درویش کی زندگی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے جلاوطنی ایک بار خودساختہ بھی اختیار کی'جب سوال ہوا کہ محمود درویش 'فرار کر گئے؟تو محمود درویش نے یہ جواب دیا کہ" میں اپنے وطن کو مزید قریب سے دیکھنے کے لیے وطن سے دور ہو چکا ہوں"اس بیان سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ محمود درویش کی ایک جلاوطنی اختیاری تھی۔جلاوطنی کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنے ملک میں جلاوطنی کی سی کیفیت میں(اضطرابی حالت) میں زندگی بسر کرتا ہے۔اسے ایڈورڈ سعید استعاراتی جلاوطنی نام دیتے ہیں۔یہ کیفیت بھی محمود درویش میں موجود تھی۔اس کی مزید وضاحت کچھ اس طرح سے ہے کہ محمود درویش وبدنصیب ہے جسے بچپنے میں گھر اور گاؤں سے محروم رکھا گیا'صرف یہی نہیں ابتدا میں شناختی کارڈ تک نہیں ملا۔ کبھی جیلوں میں بند رہے تو کبھی نظر بند'لہذا وہ اپنے ملک کو اجنبی کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ ہر چند کہ ان

پر وطن میں ہوتے ہوئے' بے وطنی کی اضطرابی کیفیت چھائی رہی۔ جلاوطنی کی ایک کیفیت یہ ہے کہ لوگ جنگ کی حالت میں یا ملک میں انارکی چھاجانے پر کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر قدم رکھتے ہیں' اور یوں مختلف ملکوں میں پناہ لیتے ہیں' ان پناہ لینے والے لوگوں کو پناہ گزین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ محمود درویش نے اس کرب کا مشاہدہ کے ساتھ تجربہ بھی کیا' اس لیے محمود درویش کی جلاوطنی کی شاعری میں پناہ گزین پر گزرنے والی کیفیات کا بیان بھی ملتا ہے' جیسا کہ محمود درویش نے پناہ گزینی کے دوران ریڈ کراس کے راشن پر صبح وشام کرنے پر مجبور ہوئے تو اپنے عزیزوں خاص کر والد سے گلے شکوے شعری صورت میں کرتے نظر آتے ہیں کہ "کب تک ہم ریڈ کراس کے آسرے پر زندگی گزارتے رہیں گے" محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی کا ایک اور اہم اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان کی شاعری میں جہاں وہ خود جلاوطن کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں وہاں فلسطین جو کہ محمود درویش کا ملک اور وطن ہے' اسرائیلی حکام کے ہاتھوں بے خانماں جلاوطن شخص کی طرح سر گرداں نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں فلسطین خود بھی جلاوطن کی زندگی گزار رہا ہے۔ کبھی کسی کے قبضے میں رہا تو کبھی کسی کے قبضے میں' جب اسرائیل فلسطین میں وارد ہو گئے تو انہوں نے فلسطین کی جلاوطنی کو مزید تقویت دی' اور یوں فلسطین کی تاریخ' جغرافیہ اور تہذیب وثقافت کو مسخ کرنے کی سر جوڑ کوششیں کیں اور اس حوالے سے اسرائیل کو خاطر خواہ فائدہ بھی حاصل ہوا۔ نتیجے میں فلسطین کی شناخت سوالیہ نشان بن گئی' تو لا محالہ فلسطین اپنی جگہ جلاوطن قرار پایا۔ جس کی بہترین عکاسی محمود درویش کی شاعری میں ملتی ہے۔

فیض احمد فیض اور محمود درویش دونوں کی شاعری میں جلاوطنی کی کیفیات ملتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ محمود درویش نے فلسطین کے پس منظر میں شاعری کی جبکہ فیض احمد فیض نے پاکستان کے پس منظر میں شاعری کی ہے۔ فیض احمد فیض کی نسبت محمود درویش کی شاعری میں جلاوطنی کا دکھ اور کرب زیادہ نمایاں ہے۔ کیونکہ محمود درویش کا تجربہ بڑا تھا۔ فیض کی شاعری کی طرح محمود درویش کی شاعری میں خود ساختہ جلاوطنی کے اثرات ملاحظہ کر سکتے ہیں' دونوں وطن سے قریب ہونے اور حکام بالا کی کارستانیوں کی وجہ سے جلاوطن ہونے پر مجبور ہوئے تھے' البتہ آمر مختلف تھے یہاں فیض کو وردی والے نے بیٹھنے نہیں دیا وہاں محمود درویش کو صیہونی اہلکاروں نے جینا حرام کیا تو دونوں شاعر وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے جلاوطن ہوئے۔ ان دونوں کی جلاوطنی کی شاعری میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ ان دونوں شعرانے وطن کو محبوب کی طرح دیکھا ہے' فیض لیلائے وطن کے نام سے وطن کو یاد کرتے ہیں تو محمود درویش وطن کو کبھی محبوب' کبھی ماں اور کبھی بہن کہہ کر محبت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ فیض احمد فیض کی طرح محمود درویش کی جلاوطنی کی شاعری میں ناسٹلجیائی کیفیتیں بھی ملتی ہیں۔ محمود درویش جلاوطنی کی حالت میں ماں کے ہاتھ کی بنی کافی

اور بچپنے کے کھلونوں کو یاد کرتے ہیں'اسی طرح فیض وطن کی ٹوپی اور وطن سے سلائے ہوئے کپڑوں کو یاد کرتے ہیں'محمود درویش ناسٹلجیا میں آکر جہاں بچپنے کو یاد کرتے ہیں وہاں دوبارہ جنم پانے کے خواہاں نظر آتے ہیں تاکہ وطن میں آزادی سے ایک بار جینا نصیب ہو'جلاوطنی کو دونوں شاعر موت کے مترادف قرار دیتے ہیں۔یعنی جلاوطنی کا کرب کوئی عام کرب نہیں بلکہ یہ بار بار مرنے کے برابر ہے۔اس کے نتیجے میں انسان اضطراب اور بے چینی کی زندگی گزار رہا ہوتا ہے'اور یہ بے چینی اور اضطرابی کیفیت انسان کو اندر سے مار دیتی ہے۔

فیض احمد فیض کی طرح محمود درویش کی شاعری میں وطن میں ہونے ہوئے بے وطنی کا احساس بھی جلوہ گر ہے۔فیض اگر وطن میں تھے تو جیل میں بے وطنی کا احساس ہوا'یہاں محمود درویش جب جیل سے باہر تھے تو بھی بے وطنی کا احساس غالب رہا جب جیل کی کوٹھڑی میں اپنے آپ کو پایا تو ان کو بے وطنی کا احساس اور زیادہ ہوا۔

محمود درویش اور فیض دونوں نے جلاوطنی کی شاعری میں علامتوں کا سہارا لیا ہے۔محمود درویش کی شاعری میں محمود درویش عاشق نظر آتے ہیں اور وطن اس کا محبوب قرار پاتا ہے۔محمود درویش کی علامتوں میں اوڈیسیس' فلیمچس اور پینے لوپیا جیسی علامتیں پائی جاتی ہے۔محمود درویش اپنے کو اوڈیسیس سمجھتے ہیں جو فلسطین کی تلاش میں سرگرداں ہیں'جبکہ ارض فلسطین کو پینے لوپیا گرادنتے ہیں جو محمود درویش کے انتظار میں آنے والے رشتوں کو ٹھکرا رہی ہے۔

محمود درویش اور فیض نے اپنی شاعری میں وطن کی نئی بازیافت کی کوشش کی ہے۔محمود درویش ایک آزاد اور خودمختار فلسطین چاہتے ہیں جہاں ہر انسان کو مساویانہ حقوق ملے۔جبکہ فیض ملک میں ترقی پسندی کے خواہاں نظر آتے ہیں جہاں طبقاتی اور استحصال نظام کا خاتمہ ہو۔دونوں کی جلاوطنی میں "وطن کی یاد" کا پہلو نمایاں ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ان کی صبح وشام وطن کی یاد میں ہی گزرتی تھی۔ان دونوں نے جلاوطنی کے دوران وطن کو خوبصورت بنانے اور وطن کی بنیادوں کو بہتر نظاموں سے مستحکم بنانے کے لیے ایگزائل پوئٹری کی۔آخر میں یہی نتیجہ دیا جاسکتا ہے کہ محمود درویش کی شاعری میں فیض کی شاعری سے زیادہ جلاوطنی کا دکھ ملتا ہے۔فیض صرف ایک انسان تھا جسے جلاوطن ٹھہرایا گیا'محمود درویش صرف تنہا جلاوطن نہیں تھے بلکہ ان کا پورا وطن جلاوطنی کی کیفیت میں تھا۔

فیض احمد فیض کی شاعری کی ایک اہم جہت بیگانگیت ہے۔بیگانگیت یعنی اجنبیت معیشت (مارکسی)'مذہب' نفسیات اور فلسفہ کی اصطلاح ہے۔ادب نے جن نظریات کو اپنے دامن میں جگہ دی ان میں سے ایک بیگانگیت کا نظریہ ہے۔کارل مارکس کے نظریہ معیشت میں بیگانگی کو اہم حیثیت حاصل ہے'مارکس کے مطابق مزدور اور مزدور کی محنت میں یکسانیت ہونی چاہیئے جبکہ سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور اور محنت میں مغائرت پائی جاتی ہے۔مثلاً ایک مزدور خون

پسینہ ایک کر کے ایک گھر بناتا ہے'گھر بننے اوراس میں مالک کے رہائش پذیر ہونے کے بعد مزدور کا گھر سے رابطہ ٹوٹ جاتا ہے'نتیجے میں ایک بیگانگیت کی فضاطاری ہو جاتی ہے۔فیض کی شاعری میں بیگانگیت کی یہ جہت قابل غور ہے۔فیض اپنے معاشرے میں غریبوں اور مزدوروں کا گوشت بکتے اوران کالہو بہتے فیض دیکھتے ہیں تو یوں فیض کہہ اٹھتے ہیں کہ "مرے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے"فیض طبقاتی نظام کے خلاف ہے جس کی وجہ سے مزدور طبقہ میں بیگانگیت کی فضا چھا جاتی ہے۔جب فیض تقسیم کے بعد کی ابتر حالت کامشاہدہ کرتے ہیں توان پر بیگانگیت کی فضااس وقت بڑے شدومد کے ساتھ امڈ آتی ہے جب انہیں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نظر نہیں آتی'اس حوالے سے فیض "یہ داغ داغ اجالا" جیسی تراکیب پر مشتمل نظمیں تحریر کر کے بیگانگیت کا برملا اظہار کیا۔

بیگانگیت کی ایک اصطلاح مذہبی نوعیت کی ہے'اس کی وضاحت کچھ اس طرح سے ہے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے یعنی جسم اورروح سے انسان کی تشکیل ہوئی ہے۔ان میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔جسم کو زندہ رہنے کے لیے کھانے پینے کی چیزیں درکار ہیں'اسی طرح روح کی سلامتی کے لیے عمل عبادات اور تقوٰی درکار ہے۔جسم کی نسبت انسانی روح زیادہ طاقتور ہے'جو ریاضت کی روشنی میں معراج تک جاسکتی ہے۔اگر انسان صرف مادی جسم کو دیکھتا رہے'صرف اسی کا خیال رکھے تو نتیجے میں انسان کی روح کی طاقت کمزور پڑتی جاتی ہے'جب روح کو روحانی غذا میسر نہ آئے تو انسانی روح محدود جسم میں تنہائی محسوس کرتی ہے'روح بے چینی کی کیفیت میں آجاتی ہے'روح کو سکون میسر نہیں آتا'نتیجے میں انسان کرب کی کیفیت میں آجاتا ہے'اوراسے کئی چین کی گولیاں بھی وقتی سکون دلانے کے بعد سکون دینے میں کامیاب نہیں ہو پاتیں'اس کا ایک ہی حل ہے وہ یہ ہے کہ (" قل الروح من امر ربی")روح کا تعلق خدا سے ہے'خدانے اپنی روح انسانوں میں پھونکی ہے لہذا روح کی بازگشت اللہ کی طرف ہے'یہ مادیت سے ماوٗرا ہے جب انسان مادیت میں آکر زمینی چیزوں سے رشتہ استوار کرتا ہے تو آسمان سے اس کا رشتہ ٹوٹنے لگتا ہے'اس ٹوٹ پھوٹ کے موسم میں روح پر خزاں کا سماں رہتا ہے یوں روح بجھی بجھی سی رہتی ہے'لہذا اگر روح کو سکون دینا ہے تو مادیت اور گناہوں سے پاک ہو کر ذات واحد سے لَو لگانے کی ضرورت ہے تا کہ مغائرت دور ہو سکے اورانسان کرب کی کیفیت سے باہر آسکے۔فیض کی شاعری میں اس بیگانگی کا خاص اہتمام نظر نہیں آتا البتہ ان کے چند اشعار میں اس کی طرف اشارے ملتے ہیں کہ جب بتوں نے لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے ہیں تو خوف خدا بھی لوگوں کے دلوں سے جاتا رہا'اور بیگانگیت کی انتہا ہے کہ جب فیض ملک میں پیدا شدہ صورتحال کو قیامت سے ملا دیتے ہیں"وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیال روزِ جزا گیا"اگر ملک میں یا دنیا میں ظلم وجور کے خلاف آوازیں نہیں اُٹھیں گی یہ ظلم کا سلسلہ جاری

رہے گا نتیجے میں بیگانگیت کی سیاہ گھٹائیں چھائی رہے گی' ظلم کو روکنے کی بجائے خاموش رہنا بھی گویا شریک جرم ہے۔ اسی جرم کی وجہ سے حکمرانوں کی خدائی مضبوط ہوتی ہے' سرمایہ داریت پھلتی پھولتی ہے اور استعماریت کو شہہ ملتی ہے' عوام ایک طرح سے اجتماعی جرم یا گناہ میں مبتلا ہو جاتی ہے' نتیجے میں غلامانہ ذہنیت غالب آتی ہے' اور سوچ کے مطابق جینے کی آزادی نہیں ملتی ہے تو لامحالہ بیگانگیت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

فیض کی شاعری میں بیگانگیت کا ایک اور حوالہ بھی ملتا ہے۔ جس کے ڈھانڈے وجودیت سے ملتے ہیں۔ وجودیت سائنس' مذہب اور منطق و فلسفہ کی کلیت سے انکار کر کے انسان کے اپنے وجود میں پناہ لینے سے عبارت ہے۔ وجودیت کی طرف کرکیگارڈ نے رہنمائی دی' سارتر نے اسے عروج دیا' کامیو نے وجودیت میں بیگانگی کو الگ پہچان اور شناخت دی۔ وجودیوں کے مطابق آج کا یہ انسان مشینوں کے بیچ میں اپنی شناخت کھو چکا ہے۔ لہذا سائنس نے بھی اسے چین نہیں دیا' فلسفہ اور منطق نے بھی' انسان کو اطمینان اس وقت حاصل ہو گا جب وہ اپنے وجود کی حقیقت کو سمجھ لے۔ انسان جب اپنے وجود میں جھانکتا ہے تو بیرونی فضا سے یگانگت و یکسانیت پیدا کرنے کی بجائے اپنے آپ کو بیگانگیت کی وادی میں دیکھتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں انسان اپنی سوچ اور فکر کو سماج کے ساتھ مطابقت دینے میں ناکام رہ جاتا ہے۔ نتیجے میں ہر چیز سے انسان اپنے آپ کو ذہنی طور پر بیگانہ محسوس کرتا ہے۔ جب انسان کو یہ شعور حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ پر ہجوم انسانوں کے بیچ میں تنہا ہے اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں تو یہی تنہائی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ تنہائی میں انسان اپنے آپ کی شناخت کرتا ہے۔ جب انسان اپنے وجود کے جوہر کو پالیتا ہے تو اس کے پاس دو راستے نکل آتے ہیں ان میں سے ایک کا اختیار انسان کو کرنا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ انسان اپنے وجود میں غرقاب ہو کر تنہائی کا رونا روتے رہے' دوسری صورت یہ کہ انسان اپنی تنہائی کا احساس کرتے ہوئے زندگی کے لیے جدوجہد سے کام لیں' اس جدوجہد میں پرانے اقدار سے کنارہ کشی اختیار کر کے انسان اپنے مستقبل کو اپنے ہاتھ پر لیتا ہے یوں تنہائی کا مقابلہ انسان جدوجہد اور کوشش سے کرتا ہے۔ فیض کی شاعری کا اس جہت سے مطالعہ کیا جائے تو فیض کی شاعری میں بیگانگیت انفرادی طور پر کم نظر آتی ہے۔ اس کے مقابلے میں فیض کی شاعری میں اجتماعی بیگانگیت واضح انداز میں در آئی ہے۔ کیونکہ فیض ایک نظریاتی شاعر ہیں' ایک نظریہ رکھنے والا شاعر انفرادی اور جزئی باتیں کم جبکہ اجتماعی اور کلی باتیں زیادہ کیا کرتا ہے' یہی وجہ ہے کہ فیض جہاں مجاہدہ سے کام لیتے ہیں وہاں دیدہ بینا سے چیزوں کی تہہ تک جا کر عوامی اور اجتماعی شاعری سے عوام کے دل جیتتے ہیں۔ یہ بات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ فیض کی شاعری میں انفرادی کم اور اجماعی رنگ گہرا ہے۔ وجودیت کے نقوش فیض سے پہلے اردو شاعری میں ملتے ہیں۔ فیض کی شاعری میں وجودیت کے در آنے کی

وجوہات میں ایک اہم وجہ تقسیم برصغیر ہے۔برصغیر کی ایک طویل تاریخ ہے جہاں ہندو مسلمان صدیوں سے ایک ساتھ زندگی گزارتے آئے تھے'اچانک جغرافیہ بدل گیا'پناہ گزینی اختیار کی گئیں بعد ازاں پناہ گزین مہاجرین کہلائے'رفتگان کی صرف یادیں باقی رہیں'نئے چہرے سامنے آگئے'اپنی پرانی تہذیب سے لوگ بیگانہ ہوئے'نئی تہذیب بننے والی تھی'اب یہ کس نوعیت کی ہوگی؟عرب طرز پر؟فارسی طرز پر؟قدیم ہندوستان سے توکٹ گیا؟جائے توکدھر کو جائے؟ایک بیگانگیت کا غبار اٹھتا ہے جس کا گرد گھر گھر پہنچ جاتا ہے'فیض ایک وقت شناس'تاریخ شناس اور مستقبل شناس ہونے کے ناتے ایک نظم"صبح آزادی"لکھ ڈالی جس کا ہر مصرعہ بیگانگیت کی مجموعی فضا کو بتا رہی ہے'بلکہ یہ اجتماعی بیگانگیت کا منظر نامہ ہے۔

فیض کی بیگانگیت جیل میں مزید بڑھ جاتی ہے'جب روزن زندان ب بجھنے پر یہ امید لیے جیل سے نکلے تھے کہ"تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی"اور یہ توقع رکھتے تھے کہ جب ہم پر سلاسل چمک اٹھے ہیں تو بعید نہیں"کہ اب سحر تری رخ پر بکھر گئی ہوگی"لیکن فیض جوں ہی جیل کی کوٹھڑی کے باہر آزاد فضامیں قدم رکھتے ہیں نہ تو فیض سحر نظر آئی اور نہ ستاروں بھرا آسمان'اگر نظر آیا ہے تو وہی طوق و دار کا موسم ہی فیض کو نظر آیا۔

فیض دوبار جلاوطن ہوئے ان دونوں جلاوطنی کے دوران بھی فیض پر بیگانگیت غالب رہی یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری میں تنہائی بڑے وفور کے ساتھ درآئی ہے۔اور تو اور بیروت میں بڑے بڑے ادیبوں کی رفاقت میں بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا اور خیال سوئے وطن رواں دواں رہا۔فیض ایک مارکسی نظریہ رکھنے والے شاعر تھے اس وجہ سے فیض اپنے خیال اور سماج کو ہم آہنگ ہوتے نہیں پایا یہی عدم توازن کی کیفیت بر قرار رہی نتیجے میں فیض پر بیگانگیت چھائی رہی۔

محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت واضح الفاظ میں درآئی ہے۔فیض احمد فیض کی طرح ان کی شاعری میں بھی بیگانگیت کی دو سطحیں ملاحظہ کرسکتے ہیں'یعنی انفرادی اور اجتماعی بیگانگیت ان کی بھی شاعری کا خاصہ ہے۔فیض کے مقابلے میں محمود درویش کے ہاں جلاوطنی کی طرح نمایاں اور اثر آمیز ہے۔فیض کے پاس کہنے کو ملک تو تھا لیکن محمود درویش سے تو ان کا اپنا ملک بھی چھینا ہوا تھا۔محمود درویش کی بیگانگیت اس وقت سے شروع ہوئی جب وہ چھ سال کے تھے اور پناگزینی کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد اپنے آبائی گاؤں کو ملبہ کی صورت میں دیکھا۔محمود درویش اپنے وطن میں بھی بے وطن تھے اس وجہ سے ان کی بیگانگیت مزید بڑھتی گئی۔محمود درویش کو بیگانگیت کا ایک اور تلخ تجربہ تب ہوا جب اسے ابتدا میں اپنے ملک میں ہی شناختی کارڈ سے محروم رکھا۔اپنے ملک میں ہی ملک کی تلاش میں سرگرداں

رہا۔ محمود درویش کی شاعری سے یہ عندیہ بھی ملتا ہے کہ کہ یہ وہ شاعر ہیں جن کی انفرادی اوراجتماعی شناخت کواسرائیلی حکام نے مٹادیا ہے۔اب اسرائیلی حکام انہیں جعلی شناخت دینے پر تلے ہوئے ہیں۔لہذا محمود درویش کی شاعری میں لامحالہ بیگانگیت کے عناصر درآئے ہیں۔ محمود درویش اپنے آپ کواورارض فلسطین کو بیگانگیت سے نکالنے کے لیے اپنی اثبات کرنے کی کوشش میں نظر آتے ہیں۔اس خاطر محمود درویش" سجل انا عربی "جیسی نظمیں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں تا کہ ان کی شناخت قائم رہے۔ محمود درویش اپنی اور فلسطینی بقاکے لیے جدوجہد پرزوردیتے ہیں تاکہ اسرائیل کی وجہ سے جو بیگانگیت کی فضاوجود میں آئی ہے اس کا تدارک کیاجاسکے۔ محمود درویش فیض کی طرح بیگانگیت کی وجہ قنوطیت کا شکار نہیں ہوئے۔انہوں نے رجائی شاعری کی ہے۔

لہذا فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں مزاحمت' جلاوطنی اور بیگانگیت کے افکار ملتے ہیں۔دونوں اشتراکی'ہم عصر'دوست اورادیب ودانشور ہونے کی وجہ سے کئی اشتراکات ملاحظہ کرسکتے ہیں۔مزاحمت دنوں نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کی ہے۔دونوں نے طبقاتی اوراستحصالی نظام کی مخالفت کی۔دونوں جلاوطن ہوئے نتیجے میں ناسٹلجیائی کیفتیں درآئیں۔اپنے نظریات سے معاشرے کو ہم آہنگ ہوتے نہیں دیکھاتو دونوں میں بیگانگیت چھائی رہی۔اختلافات کچھ اس طرح کے ہیں کہ محمود درویش عربی زبان کے شاعر ہیں جبکہ فیض احمد فیض اردوزبان کے شاعر ہیں۔مزاحمت کے لیے فیض کو قیام پاکستان اور پاکستان کے ابتر حالات پس منظر کا کام دیتے نظر آتے ہیں۔جبکہ محمود درویش نے فلسطین پر اسرائیلی قبضہ کو پس منظر بنایا۔فیض احمد فیض کی دونوں جلاوطنی خوداختیار کردہ تھیں۔جبکہ محمود درویش کے پاؤں کے نیچے سے ہی وطن چھینا گیا تھا وہ وطن میں وطن کی تلاش کرتے رہے۔فیض کے مقابلے میں محمود درویش کی بیگانگیت دیدنی ہے۔جواپنے وطن میں ہوتے ہوئے وطن کو اجنبی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یہاں تک کہ اپنے آبائی گاؤں کو بھی اپنا نہیں کہہ سکے۔بیگانگیت کی انتہا وہاں سے ہو جاتی ہے جہاں محمود درویش عدم موجود کو موجود کی بہترین صورت قرار دیتے ہیں۔

ب: نتائج

مقالہ نگار فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں مزاحمت' جلاوطنی اور بیگانگیت کے افکار کا تقابلی جائزہ کی پیشکش کے دوران کئی نتائج سامنے آئے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

ا۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش دونوں ہم عصر مارکسی شاعر تھے۔ان دونوں میں فکری ہم آہنگی اور آپس میں گہری رقابت بھی تھی۔

۲۔ مزاحمت 'جلاوطنی اور بیگانگیت کی اصطلاح جدید ادبی اصطلاحات ہیں'ان میں مزاحمت میدان جنگ کی اصطلاح تھی'جلاوطنی نفسیاتی کیفیت کانام ہے'اگر بیگانگیت کی بات کی جائے تو یہ وجودی فکر کی ایک پرتو ہے۔مزاحمتی ادب کو فلسطینی ادب سے تقویت ملی اسی طرح بیگانگیت اور جلاوطنی نو آبادیات کے شعراکی دریافت ہے۔

۳۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں مزاحمت'جلاوطنی اور بیگانگیت کے عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔ محمود درویش کی شاعری میں بھی انہی افکار پر مشتمل شاعری ملتی ہے۔

۴۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں آمریت 'استعمار'طبقاتی نظام 'مذہبی اجارہ داری اور ظاہر داری کے خلاف مزاحمت جہاں ملتی ہے وہاں فلسطین کی حمایت میں انقلابی شاعری بھی ملتی ہے جو کہ مزاحمت سے آگے کی طرف ایک قدم ہے۔اسی طرح محمود درویش کی مزاحمتی شاعری کا محور فلسطین ہے۔البتہ انہوں نے استعمار مخالف شاعری بھی کی ہے۔

۵۔ فیض احمد فیض نے جہاں براہ راست مزاحمتی شاعری کی ہے وہاں کلاسیکی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے پرانے تشبیہات واستعارات کے برتنوں میں علامتی شکل مزاحمت کی نئی شراب پیش کی ہے۔اسی طرح محمود درویش نے بھی علامات کا سہارالیا ہے۔ان دونوں شعراکا علامات پر مشتمل شاعری کرناوقت کی ضرورت تھی'جب سنسر شب کی فضا قائم ہو تو ایک شاعر علامات کا ہی سہارالے کر ابلاغ کر سکتا ہے۔

۶۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش دونوں کی مزاحمتی شاعری میں رومانوی کیفیتیں بھی برقرار رہتی ہیں۔یوں ان دونوں کی شاعری میں مزاحمت اور رومان کا حسین امتزاج موجود ہے۔

۷۔ فیض احمد فیض کی جلاوطنی پر مشتمل شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جلاوطنی انہوں نے اختیاری نہیں کی "ہوا پھر حکم صادر" جیساصاف بتارہاہے کہ فیض کو جلاوطن ہونے پر مجبور کیایوں بالواسطہ ان کے جلاوطن ہونے میں آمر کاہاتھ تھا۔ محمود درویش کی شاعری کو جلاوطن شخص کامرثیہ کہاجائے تو بے جانہ ہو گا۔ان کی جلاوطنی کی شاعری دکھ'درد اور کرب سے عبارت ہے۔ محمود درویش وطن کی تلاش میں ہے اور وطن اپنے ہم وطنوں کی تلاش میں گویا فلسطین اور اہل فلسطین دونوں گردش ہیں ہیں۔

۸۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش دونوں کی جلاوطنی میں ناسٹلجیائی کی کیفتیں ملتی ہیں۔ محمود درویش کوماں کے ہاتھ کی پکی روٹی یاد آتی ہے تو فیض کو لیلائے وطن کی یاد ستاتی ہے۔

۹۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی جلاوطنی کی شاعری میں علامات کے استعمال کا چلن بھی نظر آتا ہے۔فیض احمد فیض "بے گھری" کے لفظ کو لے آتے یں جبکہ محمود درویش 'زیتون،اوڈیسیس 'اور پینے لوپیا جیسے الفاظ کو علائم کے طور پر استعمال کر کے جلاوطنی کی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔

۱۰۔ اگر فیض اور محمود درویش کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان دونوں کی جلاوطنی کی شاعری پر ناظم حکمت جیسے شعرا کے گہرے اثرات ہیں 'البتہ پس منظر مختلف ہے۔

۱۱۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت کی جہت بھی دیدنی ہے۔فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں متصوفانہ بیگانگی نہیں ہے۔البتہ مارکسی بیگانگی ضرور ہے۔

۱۲۔ فیض احمد فیض کو جب قید و بند کی صعوبتوں میں رکھا تو اجنبیت کا احساس غلبہ پانے لگا یوں فیض اپنے ملک میں ہوتے ہوئے بیگانگیت میں زندگی گزارنے لگے۔جب جلاوطن ہوئے تو بیگانگیت چھائی رہی'فیض کی حبسیہ اور جلاوطنی کی پر مشتمل شاعری میں اسی احساس کا بیان ملتا ہے۔محمود درویش کی شاعری میں بھی بیگانگیت در آئی ہے۔ان کی اپنی شاخت اور ملک کی شاخت چھین لی گئی تو لامحالہ ان کی شاعری میں بیگانگیت راہ پا گئی۔

۱۳۔ فیض احمد اور فیض اور محمود درویش دونوں کی شاعری میں بیگانگیت کے افکار مارکسی اور وجودی فکر و فلسفہ سے در آئے ہیں۔البتہ محمود درویش کی شاعری میں نفسیاتی بیگانگی بھی پائی جاتی ہے۔

۱۴۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں بیگانگیت ضرور ہے لیکن دونوں قنوطی ثابت نہیں ہوئے دونوں انقلابی شاعر ہونے کے ناتے رجائی پہلو رکھتے ہیں۔دونوں نے حریت کی بات کی اور اپنی اثبات کے لیے شاعری کا سہارا لیا تا کہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی بیگانگیت کا خاتمہ ہو سکے اور انسانیت کی جیت ہو اور امن کا قیام ممکن ہو سکے۔

ج: سفارشات

تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہے اس کا نہ رکنے والا سلسلہ جاری وساری رہے گا مقالہ کے آخر میں مقالہ نگار یہ سفارشات پیش کرتا ہے:

۱۔ یونیورسٹی کی سطح عالمی ادب کے نمایاں رجحانات اور جدید نظریات پر سیمینارز منعقد کروائے جائیں۔ تاکہ ادب کے طلبہ و محققین نئے افکار و نظریات سے آشنا ہو سکے۔

۲۔ عالمی ادب خاص کر مشرقی شعریات کو کالجز اور جامعات کی سطح پر شامل نصاب کیا جائے۔

۳۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں تقابل کی طرح ان کے نثر پاروں کا تقابل بھی کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں رومانویت کے تقابل پر مشتمل ایم فل کا مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔

۵۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری پر کارل مارکس اور ناظم حکمت کے اثرات کا تقابلی جائزہ کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی تحریر کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں "فلسطین بطور موضوع" کے عنوان سے بھی ایک مبسوط مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

فیض احمد فیض، میزان، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی،

فیض احمد فیض، دست تہہ سنگ، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۷۴ء

فیض احمد فیض، شام شہر یاراں، مکتبہ کارواں، لاہور، س ن

فیض احمد فیض، متاع لوح و قلم مکتبہ دانیال، کراچی ۱۹۷۳ء

فیض احمد فیض، مہ و سال آشنائی، مکتبہ دانیال ۲۰۰۸ء

فیض احمد فیض، نقش فریادی، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۷۴ء

فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کاروان، لاہور، س ن

محمود درویش، عاشق من فلسطین ءمؤسسہ محمود درویش، دار النشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ

محمود درویش، احبک اولا احبک، مؤسسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ

محمود درویش، آخر اللیل، مؤسسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ

محمود درویش، اوراق الزیتون، مؤسسہ محمود درویش، دار النشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ

محمود درویش، حالۃ الحصار، مؤسسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ

محمود درویش، سریر الغریبۃ، مؤسسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ،

محمود درویش، کزھر اللوز او ابعد، مؤسسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ،

محمود درویش، لا تعتذر عما فعلت، مؤسسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء

محمود درویش، محاولہ رقم ۷، مؤسسہ محمود درویش، دار الناشر، عمان، ۲۰۱۳ء، الطبعۃ الاولیٰ،

محمود درویش، الاعمال الکاملۃ ۱، ریاد الرئیس بکس، بیروت، ۲۰۰۹ء

تراجم:

امجد اسلام امجد، عکس (ترجمہ)، مجلس ترقی ادب، لاہور، جون ۱۹۷۶ء

ضمیر احمد، دوسروں کی شاعری، شہر زاد، کراچی، ۲۰۰۱ء

فاروق حسن، مترجم: محمود درویش اپنی زمین کی تلاش، قوسین، لاہور، طبع اول، ۲۰۱۵ء

منو بھائی، فلسطین فلسطین (محمود درویش کی انقلابی شاعری) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

ثانوی ماخذ:

اشتیاق احمد، مرتب، فیض احمد فیض کی شاعری، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۱۰ء
اشرف کمال، محمد، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء
اشفاق حسین، فیض کے مغربی حوالے، جنگ پبلشرز، لاہور، اکتوبر ۱۹۹۲ء
انسانی، کرمان، ایران ۱۳۸۹ھ
آغا ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء
آفتاب احمد، ڈاکٹر، بیاد صحبت نازک خیالاں، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۳ء
ثاقب رزمی، سائنسی فکر اور ہمعصر زندگی، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۸ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر، "معاصر ادب" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
ذاکر حسین، ڈاکٹر، طاہر تونسوی، ڈاکٹر، مرتبین، اردو شاعری کا صد دروازہ فیض احمد فیض، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، س ن
ربیعہ فخری، فیض احمد فیض کی شاعری اور شخصیت، عبد القادر پبلی کیشنز، راولپنڈی، فروری ۲۰۰۶ء
رسول بلاوی، دکتر، جایگاہ آوارگان فلسطینی در شعر محمود درویش، دانشگاہ کردستان، ایران، ۱۳۹۲ھ
رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۱۰ء
روبینہ شہناز، ڈاکٹر، اردو تنقید میں پاکستانی تصور قومیت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۰۷ء
سحر انصاری، فیض کے آس پاس، پاکستان سٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، اگست ۲۰۱۱ء
سلمٰی اعوان، عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں، جامعہ کراچی، دارالتحقیق برائے علم و دانش، س ن
سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۱۳ء
شگفتہ حسین، ڈاکٹر، مطالعہ، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ، بار اول، جون ۲۰۰۴ء
شیخ عبد الرشید، موجودہ عالمی استعماری صورتحال اور فیض کی شاعری، یونیورسٹی آف گجرات،، مارچ ۲۰۱۱ء
طارق ہاشمی، جدید نظم کی تیسری جہت، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۳ء
طاہر تونسوی، ڈاکٹر، فیض کی تخلیقی شخصیت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء
ظفر حسین، آغا، مزاحمت اور پاکستانی شعراء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، س ن
عبد الحق حقانی القاسمی، فلسطین کے چار ممتاز شعراء، تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی ۱۹۹۵ء، اشاعت اول

عبدالرؤف ملک، فیض شناسی(فیض کی ہمہ جہت شخصیت کے اوجھل پہلو)، پاکستان سٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، اشاعت اول، اپریل ۲۰۱۱
علی محمد فاطمی، فیض ایک نیا مطالعہ، ایجوکیشنل ہاؤس، علی گڑھ، بھارت، ۲۰۱۲ء
فتح محمد ملک، فلسطین اردو ادب میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء
فتح محمد ملک، فیض شاعری اور سیاست، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء
فریدہ الٰہی، علامہ اقبال اور تحریک آزادی فلسطین، جاوداں پبلی کیشنز، اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۷ء
فیض بنام افتخار عارف، ڈاکٹر راشد حمید، (تحقیق و ترتیب)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء
فیض شناسی، عبدالرؤف ملک، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۱۱ء
قاضی جاوید، وجودیت، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۷ء،
محمد امین، ڈاکٹر، ادب و ثقافت، مشمولہ: فیض کی شاعری میں سماجی شعور کا ارتقاء، مثال پبلشرز، فیصل آباد، س ن
محمد حمید شاہد، راشد۔ میرا جی۔ فیض نایاب ہیں ہم، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۴ء
محمد کاظم، اخوان الصفا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
محمد کاظم، عربی ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء
مرتضیٰ قائمی، ڈاکٹر، بررسی کاربرد رنگ ھادر تصویر پردازی محمود درویش از مقاومت فلسطین، دانش کدہ ای ادبیات وعلوم
ممتاز حسین، پروفیسر، ادب اور شعور، ادراہ نقد ادب، کراچی، ۱۹۹۲ء
نصرت چوہدری، ڈاکٹر، فیض کی شاعری (ایک مطالعہ) شان پبلشنگ ہاؤس، سرینگر۔ کشمیر، جون ۱۹۷۵ء

رسائل:

ادبیات، اکادمی ادبیات، شمارہ ۸۲، جنوری مارچ، ۲۰۰۹ء
دانشور، سہ ماہی ادبی رسالہ، شمارہ ۶، ۱۹۹۰ء
دراسات المعاصر الادب، دانش گاہ آزاد اسلامی، ۱۳۹۵ء
دستاویز، جلد اول، شمارہ ۱، اکتوبر، دسمبر، ۱۹۸۹ء
دنیازاد (عاشق من فلسطین) مرتب: آصف فرخی، شہزاد، کراچی، ۲۰۰۱ء
ذہن جدید، سہ ماہی، ارض فلسطین کا جیالا شاعر، دہلی، جلد ۱۸، اگست ۲۰۰۸ء
زبان و ادب، شمارہ ۹، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، شعبہ اردو، جولائی تا دسمبر، ۲۰۰۱ء

فکر و نظر، دہلی، شمارہ ا، جلد ۳۱، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۴ء
ماہ نو، جلد ۵۶،، شمارہ ۴، اپریل ۲۰۰۳ء
ماہ نو، بیاد فیض، جلد نمبر ۶۱، شمارہ نمبر ۵ مئی جون ۲۰۰۸ء
معیار، اسلامک انٹر نیشنل یونیورسٹی، شعبہ اردو، شمارہ ۷، ۲۰۱۲ء

اللغات:

Mitchell Duncan G. A new Dictionary of Sociology,'Y - Routledge & Kegan. London
ابو الفضل مولانا عبد الحفیظ، مصباح اللغات، مکتبہ برہان، اردو بازار، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء
درسی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، طبع سوم، ۲۰۱۲ء
ساجد اللہ تفہیمی، ڈاکٹر، فرہنگ علوم ادبی اصطلاحات، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء
محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، دیدہ معنی کشا، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۳ء
المنجد عربی اردو، دار الاشاعت، کراچی، ۱۹۷۵ء
وارث ہندی، "قاموس مترادفات" اردو سائنس بورڈ، لاہور، اگست ۱۹۸۶ء

ویب گاہیں (انٹرنیٹ ذرائع):

Awadhnama.com
Danish.pk
Deedban.magazine.com
Epaper.kashmiruzma.net
Http://urdu.dunyatoday.com
Http://www.urdulinks.com
Http://www.wikiwand.com
Https://mcjmumbai.academia.edu
Librarybazmeurdu.net
Pu.edu.pk

www.bazmeurdu.com

www.dunya.com

www.faizghar.com

www.humsub.com

www.iiu.edu.pk

www.punjud.com

www.urduweb.com